اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتاب مستطاب

سِیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد ششم

مشتمل بر تعلیمات اخلاقی

اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی، اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے اور پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے۔

(تالیف)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء

در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ طبع گردید

طبع پنجم ۱۹۶۹ء (مکتبہ اقبال احمد)

فہرست مضامین سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ
۱۱۳ - ۱۸۵

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب
۱۸۶ - ۲۰۲

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں
۲۰۳

حقوق و فرائض
۲۰۴ - ۳۵۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والحکمۃ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ

نبی الرحمۃ وعلی آلہ واصحابہ اولی العزم والھمۃ

اے تو، بہ بہین صفت سزاوار
نام تو گرہ کشاے ہر کار

اے کردہ ز گنج خانۂ راز
بر آدمیان در سخن باز

عالم ز تو شد بحکمت آباد
حکمت ز تو یافت آدمی زاد

در قربت حضرت مقدس
پیغمبر پاک رہبرم بس

گنجینۂ کیمیاے عالم
پیش از ہمہ پیشواے عالم

نامش بسریر پادشاہی
توقیع سپیدی و سیاہی

(خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ اُن اخلاقی تعلیمات کی

تفصیل اور تشریح مین ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانون کو بتائی اور سکھائی گیین، یہ عجیب بات ہو کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت مین اخلاقی تعلیم نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہی، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہین، اسی لئے عوام کے اس وہم کو دور، اور قومون کی ترقی و تہذیب مین اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق مین اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہی، اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزاخلاق کی صحیح تربیت ہی،

کتاب مین اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ اسمائے حسنیٰ کا پرتو ہین، بار بار اشارہ کیا گیا ہی، لیکن یہ بات ذہن مین رہے کہ کوئی مخلوق خالق تعالیٰ کی کسی صفت مین برابر کا شریک نہین ہوسکتا، ایسا سمجھنا سر سر شرک ہی، بات اتنی ہو کہ بندہ کے جس وصف کو خداے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اُس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہین، جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہین ہو جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہو، مگر خدا کی اس صفتِ علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہدیتے ہین، حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا مین ہے، بندہ مین نہین، لیکن چونکہ خداے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ مین ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہدیتے ہین[1]، ورنہ درحقیقت ان دونون مین کوئی نسبت ہی نہین، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہو، اسی لئے بہت سے

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۷، مطبوعہ مدینہ بجنور،

اہلِ حق اور اہلِ تحقیق کے نزدیک ان دونون مین اوصاف کا اشتراک، اشتراکِ بادنیٰ مناسبت ہی اور بس! لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ، (شوریٰ-۲)

کتاب مین چند موقعون پر مختلف مذہبون سے اسلام کا موازنہ آگیا ہے، اور اس سلسلہ مین حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے، اس سے مقصود وہ تعلیمات وہدایات ہین جو آج اُن کی طرف منسوب صحیفون مین پائی جاتی ہین، یا اُن کے موجودہ پیرو اُن کی طرف منسوب کرتے ہین، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبرِ صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے، اور نبوت کے جس دور مین جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لئے بالکل مناسب تھی، یہان تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُس کی ہمیشہ کے لئے تکمیل فرمادی گئی،

کتاب مین کہین کہین فقہی مسئلے آگئے ہین، چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہی، اس لئے فقہی جزئیات اور تفصیلات مین الجھا نہین گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک و شبہہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابون مین دیکھ لیا جائے،

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہی کہ پہلے ایک مقدمہ ہی جس مین اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہی، پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی کچھ خصوصیتین گنائی گئی ہین، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانون سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کیگئی ہے، جب فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیقِ کار مولانا عبد السلام صاحب

ندوی نے لکھے ہیں، جن کو مین نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے، موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گذار ہون،

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط، اور مصالح و حکم کی تشریح مین اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا، سہو و خطا انسان کی فطرت ہی، پھر کیونکر دعویٰ کرون کہ اس سے میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے،

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کو مدت سے خواب مین نہین دیکھا تھا، اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو مین نے اُن کو خواب مین دیکھا کہ اُن کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہین، اور وہ اُس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہین اور مسکرا رہے ہین، رحمہ اللہ تعالیٰ،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے، اور ابنائے ملت مین اس آئینۂ محمدیؐ کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے، اور وہ سمجھین کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی مین اخلاق و عادات کی درستی ہے،

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

۴ ذیحجہ ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین و الصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین
وعلی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبوی کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندون کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہین، جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا مین آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اُس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اُس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز

رشتہ دار، دوست واحباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اسکا تعلّق ہے جس سے وہ محلّہ، وطن، قومیت، جنسیت، یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اُس کے تعلقات ہیں، اور اُن تعلّقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں،

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت وجماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ اُن کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے، اور دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے، آیندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے، اور محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے، اور کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتانا ہے،

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس مین شک نہین کہ دُنیا کے سارے مذہبون کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی مین جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے، انصاف بھلائی، اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی، اور چوری بدی ہی، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب مین بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہی، خود آپ نے ارشاد فرمایا،

بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ حسنَ الاخلاق — مین حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہون،

(موطا مالک حسن اخلاق)

یہ امام مالکؒ کی موطّا کی روایت ہی، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعدؒ وغیرہ مین اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہین، آپؐ نے فرمایا:-

انما بُعِثتُ لاُتمم مکارم — مین تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ

لہ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدر آباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ

الاخلاق، کی تکمیل کرون،

چنانچہ آپ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ مکہ ہی مین تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لئے مکہ بھیجا، انھون نے واپس آکر اُس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ مین اطلاع دی، وہ یہ تھے،

رأیتہ یامر بمکارم الاخلاق[1] | مین نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگون کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے،

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ مین نجاشی نے جب مسلمانون کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہین:

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتون کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریان کرتے تھے، ہمسایون کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستون کو کھا جاتے تھے اس اثنا مین ایک شخص ہم مین پیدا ہوا ...... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھرون کو پوجنا چھوڑ دین، سچ بولین خونریزی سے باز آئین، یتیمون کا مال نہ کھائین، ہمسایون کو آرام دین، عفیف عورتون پر بدنامی کا داغ نہ لگائین[2]"

[1] صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۳۲۵ مصر [2] ابن حنبل جلد ا صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد، ج ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت،

اسی طرح قیصرِ روم کے دربار مین ابو سفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس مین یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگون کو یہ سکھاتے ہین کہ "وہ پاکدامنی اختیار کرین، سچ بولین اور قرابت کا حق ادا کرین"[1]

قرآنِ مجید نے جابجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف مین یہ کہا ہے کہ

وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ، (جمعہ-۱)	یہ پیغمبر ان پڑھ جاہلون کو پاک و صاف کرتا، اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے

اس آیت مین دو لفظ فیصلہ کے قابل ہین، ایک پاک وصاف کرنا، جس کو قرآنِ پاک نے تزکیہ کہا ہے، اور دوسرا **حکمت**،

۱- تزکیہ کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہین، قرآنِ پاک نے اس لفظ کو اس معنی مین استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستون اور آلودگیون سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کرکے اس مین صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورۂ والشمس مین ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا، فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا، (شمس)	قسم ہو نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس مین نیکی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا، اور جس نے اُسکو دبا دیا وہ نامراد رہا،

[1] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد

دوسری جگہ ہے۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ، (اعلیٰ)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا، اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے،

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی اَنۡ جَآءَهُ الۡاَعۡمٰی
وَمَا یُدۡرِیۡكَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰۤی ،
اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَهُ الذِّکۡرٰی
(عبس)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا،
کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا، اور تجھے
کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا، یا وہ
سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا،

ان آیتون سے اندازہ ہو گا کہ قرآن پاک مین اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے، جس کو اس نے پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہی، اس سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دین، اُن کو برائیون اور نجاستون کی آلودگیون سے پاک کرین، اور اُن کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائین، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونون آپ کی اس خصوصیّت کے قائل تھے،

۲۔ حکمت، اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے، گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ مین کی جا چکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ

حکمت کا لفظ قرآن پاک مین جہان اُس علم وعرفان کے معنی مین ہے، جو نورِ الٰہی کی صورت مین نبیؐ کے سینہ مین ودیعت رکھا جاتا ہے، اور جس کے آثار و مظاہر رسولؐ کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت مین ظاہر ہوتے ہین، وہین اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے اُس علمی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن مین بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن مین دو موقعون پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت مین کون کون باتین داخل ہین، سورۂ بنی اسرائیل مین توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابتدارون اور محتاجون کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کُشی، بدکاری، کسی بے گناہ کے جان لینے اور یتیمون کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفاے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کیگئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے،

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۚ (ع ۴)	یہ حکمت کی اُن باتون مین ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا،

سورۂ لقمان مین ہے کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۚ (ع ۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتین سکھائین، کہ خدا کا شکر ادا کر،

اس کے بعد حکمت کی ان باتون کی مزید تشریح کی گئی ہے، کہ "کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگون کو بھلی بات کرنے کو کہہ

اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتون مین استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز مین باتین کر" ان آیتون سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح مین ان فطری امورِ خیر کو بھی، جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قومون اور مذہبون مین مسلّم ہے، اور جن کو دوسرے معنی مین اخلاق کہہ سکتے ہین "حکمت" کہا گیا ہی،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مین اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قرآنِ پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحیِ محمدیؐ کتاب اور حکمت دونون پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام مین عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ مین نہین، خود قرآنِ پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَ	اے ایمان والو، رکوع کرو، سجدہ
اسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ	کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو،
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (حج)	تاکہ تم فلاح پاؤ،

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے جسم کے دو بازو ہین، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا، اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے،

حقوقِ عباد کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو، عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوقِ عباد یعنی باہم انسانون کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے، اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہین،

اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے، اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہین ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیئت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانون کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ مین نہین بلکہ اُن بندون کے ہاتھون مین رکھی ہے، جن کے حق مین وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو، اور ظاہر ہے کہ اُن سے اس رحم و کرم کی توقع نہین ہو سکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اُس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اسی دنیا مین وہ اُس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرائے، ورنہ وہان تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہون گے ظالم کی نیکیان مظلوم کو مل جائین گی، اور نیکیان نہ ہون گی تو مظلوم کی بدیان، ظالم کے نامۂ اعمال مین لکھ جائینگی" ایک اور حدیث مین ہے کہ قیامت مین نامۂ اعمال کی تین فردین ہون گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا، دوسری وہ جس مین سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا، اور تیسری وہ جس مین سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہون گے وہ شرک ہے، اور جس فرد کی کوئی پرواہ اس کو نہ ہو گی تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے، اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کردے گا، اور بخش دے گا،

ا صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامہ، صفحہ ۹۶۶،

لیکن وہ فرو جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا، وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے " (مسند احمد و حاکم عن عائشہؓ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی مین جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟[1] چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اُس وقت تک بندہ پر عائد نہین کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے، اور زکوٰۃ بندہ کے اُسی مال مین فرض کی ہے، جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اُس وقت تک بندہ پر واجب نہین کیا، جب تک وہ بندون کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولیا،

اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق

بعض اُن حدیثون کی بنا پر جن مین اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونون پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت مین اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہین دی گئی ہے، اور بے سمجھ واعظون کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی مین اور اضافہ ہوگیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع مین ہم یہ بتا چکے ہین کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک مین یہ نکتہ ہر جگہ نمایان طریقہ سے واضح کردیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتون سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے، اور حج بھی مختلف

---

[1] یہ اصولِ فقہ کا مسئلہ ہے، دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحیٔ مرحوم،

طریقون سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسرون کی امداد کا وسیلہ ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چارون ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہون، مگر ان کے بنیادی مقاصد مین اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہی، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل، اور عبادات کے جوہر ومعنی سے یکسر خالی اور معرّا ہین، وہ درخت ہین جن مین پھل نہین، وہ پھول ہین جن مین خوشبو نہین، وہ قالب ہین جن مین روح نہین، قرآنِ پاک اور تعلیم نبوی کے جو اشارات اس باب مین ہین، حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات مین اُن کی پوری تشریح کر دی ہی

امام غزالی احیاء العلوم مین لکھتے ہین:

"خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو، اور فرمایا کہ بھولنے والون مین نہ ہو، اور فرمایا کہ نشہ کی حالت مین اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہین جنھون نے گو شراب نہین پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہین تو نہین جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہین، آپنے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن مین کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ "نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے، اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ "اے میرے اللہ"! جس نے یہ بات نہین پیدا کی، اسکی نماز ناقص ہے، اور اگلی کتابون مین ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مین ہر ایک کی نماز

قبول نہین کرتا، بس اس کی نماز قبول کرتا ہون، جو میری برائی کے سامنے سرنگون ہو،
میرے بندون پر اپنی بڑائی نہین جتاتا، اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا
ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز اسی لئے فرض کی گئی، اور اسی لئے
حج کے ارکان بنائے گئے، تاکہ خدا کی یاد کی جائے" تو اگر دل مین یہ کیفیت پیدا نہ ہو
جو مقصود ہے، تو اس یاد الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا
کہ جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کردیتی ہے،
اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثون نے اپنی
کتابون مین بسند ذکر کیا ہے، اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) مین ان
تمام روایتون کو یکجا کردیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت مین الفاظ یہ ہین، کہ جس
کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہین ہے، اسی قسم کے الفاظ
روزون کے متعلق آپ نے فرمائے، ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور
فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہین کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"
ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے،

اخلاق حسنہ اور ایمان اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول
ہے، لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے، جس کو کوئی دوسرا جانتا نہین، اور

ل جلد اول باب فضیلۃ الخشوع ۲ تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت، آیت مذکورہ ۳ صحیح بخاری
وجامع ترمذی وابوداؤد وابن ماجہ کتاب الصوم،

زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لئے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات مین گنا یا گیا ہے، جن پر اُن کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، الَّذِيْنَ	بے شبہہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے
هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ،	جو اپنی نماز مین خضوع وخشوع کرتے
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	ہین، اور جو نکمی بات پر دھیان نہین
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ،	کرتے، اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہین اور
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت
حٰفِظُوْنَ	کرتے ہین، . . . . . .
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے وعدون
وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	کا لحاظ رکھتے ہین، اور جو اپنی نمازون
هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، (مومنون ۱)	کی پابندی کرتے ہین،

ان آیتون مین اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان مین وقار وتمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفاے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے،

اخلاق حسنہ اور تقویٰ | اسلام کی اصطلاح مین انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم

کی نیکیون کی محرک ہے، تقویٰ ہی، وحیِ محمدیؐ نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ ہی ہین جن کے یہ اوصاف ہین،

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	نیکی یہی نہین ہے کہ تم نماز مین اپنا منھ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	پورب یا پچھم طرف کرو، بلکہ اصل نیکی
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتون
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	پر، کتاب پر اور پیغمبرون پر ایمان لایا،
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى	اور مال کی خواہش کے باوجود دیا خدا
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ دارو
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	کو، یتیموں کو، غریبون کو، مسافر کو،
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي	مانگنے والون کو، اور غلامون کے
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	آزاد کرنے مین دیا، اور نماز ادا کرتا
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا	کرکے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہین
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ	اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی
الضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	مین ثابت قدم رہتے ہین، یہی ؤ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	ہین جو راستباز ہین، اور یہی
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ، (بقرہ-۲۲)	تقویٰ والے ہین،

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح اُن کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہین،

اخلاقِ حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم مین خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہون، اور وہی باتین خدا کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہین، چنانچہ سورۂ فرقان مین ارشاد ہوا،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ	اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہین
عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا	جو زمین پر دبے پاؤن چلتے ہین اور
خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا	جب نا سمجھ لوگ اُن سے بات کرین
سَلٰمًا، وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ	تو وہ سلام کہین، اور جو اپنے پروردگار
لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا	کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ
وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	مین رات گذارتے ہین، اور جو کہتے
اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ	ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے
اِنَّ عَذَابَهَا کَانَ غَرَامًا،	جہنم کا عذاب دور کر، کہ اس کا عذاب
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ	بڑا تاوان ہے، اور جہنم برا ٹھکانا اور
مُقَامًا، وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا	مقام ہے، اور جو خرچ جب کرتے ہین

لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ	تو نہ فضول خرچی کرین اور نہ تنگی کرین،
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا، وَالَّذِيْنَ	بلکہ ان دونون کے بیچ سے وہ سیدھے
لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ	گذرین، اور جو خدا کے ساتھ کسی اور
وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ	خدا کو نہین پکارتے، اور جو کسی جان
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ج	کا بے گناہ خون نہین کرتے، جس کو خدا
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا	نے منع کیا ہے، اور نہ بدکاری کرتے -
. . . .	ہین کہ جو ایسا کریگا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا...
وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ	اور جو جھوٹے کام مین شامل نہین ہوتے
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا	اور جب کسی لغو بات پر گذر رہی ہون
وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ	تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہین،
لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا	اور جب خدا کی نشانیان اُن کو سنائی
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	جائین تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو
هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ	پڑین اور یہ دعا مانگتے ہین کہ اے
ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا	ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی
لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا،	بچون سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش، اور ہم کو
(فرقان-٦)	پرہیزگارون کا پیشوا بنا،

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت مین عفو و درگذر و میانہ روی اور قتل و خونریزی

اور بدکاری نہ کرنا، اور مکروزور مین شریک نہ ہونا، وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہین،

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف | وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اُن کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہین،

وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ، وَالَّذِیْنَ	اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے
یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ	ہین، اور جو بڑے بڑے گناہون اور
وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ،	بے حیائی کے کامون سے پرہیز کرتے
وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ	ہین، اور جو غصہ کی حالت مین معاف
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ	کرتے ہین، اور اپنے پروردگار کی پکار
شُوْرٰی بَیْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	کا جواب دیتے ہین، نماز ادا کرتے ہین
یُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ	اور اُن کے کام باہم مشورہ سے ہوتے
الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ، وَ	ہین، اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے اس
جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا	مین سے کچھ خدا کی راہ مین دیتے ہین
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی	اور جب اُن پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ
اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ	لیتے ہین، اور برائی کا بدلہ ویسی ہی
وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ	برائی ہے، تو جو کوئی معاف کردے
فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ،	اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے
اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ	ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والون کو پیار

النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ ، وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ
إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

(شوری - ۴)

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ
فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

(آل عمران ۱۴)

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ
مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ، وَإِذَا
سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ
وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

نہیں کرتا، اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلے
لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں، ملامت
تو اُن پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں
اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں، اُن کیلئے
بڑا دردناک عذاب ہے، اور بیشبہ جو مظلوم
ہونے پر بھی ظالم کو معاف کرے اور صبر کرے
جنت اُن پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی
ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں
میں خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور
جو غصہ کو دباتے ہیں، اور لوگوں کو معاف
کرتے ہیں، اور خدا اچھے کام کرنے والوں
یہ وہ ہیں جنکو دوہرا ثواب ملیگا، اس لئے
کہ انھوں نے صبر کیا، اور وہ برائی کو بھلائی
سے دور کرتے ہیں، اور جو ہم نے دیا ہے
اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں
اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو
اس سے کنارہ کرتے ہیں اور کہدیتے ہیں کہ

أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ	ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمھارے لئے
لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ؛	تمھارا عمل ہو، تم سلامت رہو ہم ناسمجھوں
(قصص - ۶)	کو نہیں چاہتے،
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى	اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے
حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ	مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے
أَسِيْرًا ، (دھر - ۱)	ہیں،

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی، وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا

واھدنی لاحسن الاخلاق	اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر
لایھدی لاحسنھا الا انت	اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے
واصرف عنی سیئھا لایصرف	بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا، اور برے
عنی سیئھا الا انت ،	اخلاق کو مجھ سے پھیر دے، اور ان کو
(مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)	نہیں پھیر سکتا، لیکن تو،

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسنِ اخلاق ہے،

ایمان سے بڑھ کر اسلام مین کوئی چیز نہیں، لیکن اُسکی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے، فرمایا،

اکمل المؤمنین ایماناً احسنھم	مسلمانون مین کامل ایمان اس کا ہے
خلقاً،	جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے،

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابو داؤد، حاکم اور ابن حبان مین ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مین ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھرایا گیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہی کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے،

اسلام مین نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی اُنکی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا،

ان الرجل لیدرک بحسن	انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا
خلقہ درجۃ قائم اللیل	ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر
وصائم النھار،	عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے،

یہ حدیث چند ہم معنی لفظون کے الٹ پھیر سے ابو داؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی مین ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازون مین رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزون مین دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات

کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے،

اسلام مین اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانون مین درجہ اور رتبہ کا فرق نمایان ہوتا ہے، فرمایا،

خیارکم احسنکم اخلاقًا،	تم مین سب سے اچھا وہ ہے جس کے
(بخاری کتاب الادب)	اخلاق سب سے اچھے ہون،

ایک اور حدیث مین ہے،

ما من شئی یوضع فی المیزان	(قیامت کی) ترازو مین حسنِ خلق سے
اثقل من حسن الخلق فان	زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، کہ حسنِ
صاحب حسن الخلق لیبلغ	اخلاق والا اپنے حسنِ خلق سے ہمیشہ
به درجة صاحب الصوم	کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ
والصلوٰة،	حاصل کرسکتا ہے،

یہ حدیث ترمذی مین انہی الفاظ کے ساتھ ہے، لیکن حدیث کی دوسری کتابون (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) مین مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو مین نہین۔ اس حدیثِ نبوی نے پوری طرح واضح کردیا کہ اسلام کی میزان مین حسنِ اخلاق سے زیادہ گران کوئی چیز نہین، ایک اور حدیث مین ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس مین حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے،

خیرما اعطی الناس خلق	لوگون کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو
حسن	چیزین عطا ہوئین انمین سب سے بہتر اچھے اخلاق ہین

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن ضنبل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ مین ہے، اس بشارت نے اخلاق حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتون سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث مین آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا،

احب عباد اللہ الی اللہ	اللہ کے بندون مین اللہ کا سب سے
احسنھم اخلاقاً (طبرانی)	پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہین

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا،

ان احبکم الیّ واقربکم	تم مین میرا سب سے پیارا اور نشست
منّی فی الآخرۃ مجالس محاسنکم	مین مجھ سے سب سے نزدیک وہ
اخلاقاً وان ابغضکم الیّ	ہین جو تم مین خوش خلق ہین، اور مجھے
وابعدکم منّی فی الآخرۃ	ناپسند اور قیامت مین مجھ سے دور
مساویکم اخلاقاً،	وہ ہون گے جو تم مین بداخلاق
(ابن ضنبل وطبرانی وحبان وشعب الایمان بیہقی)[1]	ہین،

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک مین دو صحابی بیویان تھین، ایک رات بھر

[1] یہ تمام حدیثین کنز العمال جلد ثانی، کتاب الاخلاق باب اوّل سے ماخوذ ہین،

نماز پڑھتین، دن کو روزہ رکھتین، اور صدقہ دیتین، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیون کا دم ناک مین کئے رکھتی تھین، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتین اور غریبون کو چند کپڑے بانٹ دیتین، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونون کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس مین کوئی نیکی نہین، وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی" اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہوگی" ان دونون بیویون کی سیرتون کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہین، وہ اسلام مین اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایان کر دیتے ہین،

حضرت برا ابن عازبؓ کہتے ہین کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لے جائے، فرمایا: "انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے، تو بھوکے کو کھلا، اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا، اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک"۔ غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہان تک بڑھا رہی ہی،

ایمان کے اوصاف و لوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثین ہین جن مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلان فلان اوصاف و اخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہین، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات مین زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر

لہ ادب المفرد امام بخاری باب من لا یؤذی جارہ ۔ ۲ مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ صفحہ ۲، حیدرآباد دکن،

اس ایمان کے منشا رین زیادتی وکمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہین، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغِ زیر دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعون سے کیا جائے گا، آپ نے فرمایا،

۱- ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخین ہین، جن مین سے ایک حیا ہے،

۲- ایمان کی بہت سی شاخین ہین جن مین سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے، اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو، (تاکہ تمھارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳- جس مین تین باتین ہون، اُس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو خدا اور اس کا رسولؐ سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر مین مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دُکھ ہو جتنا آگ مین پڑنے سے،

۴- جس مین یہ تین باتین ہون، اُس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا، اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہین سکتا تھا،

۵- تین باتین ایمان کا جز ہین، مفلسی مین بھی خدا کی راہ مین دینا، دنیا مین امن اور سلامتی پھیلانا، اور خود اپنے نفس کے مقابلہ مین بھی انصاف کرنا،

۶- تم مین سے کوئی اُس وقت تک کامل مومن نہین ہو سکتا ہے، جب تک اپنے

بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے،

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں، اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان ومال اس کی امانت میں دے دیں،

۸۔ ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا (بھوکوں کو) کھانا کھلانا، اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا، (سلام کرنا)

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے، فرمایا اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا، پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا (سماحت)

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے، اور جو نہ دوسرے سے اُلفت کرتا، اور نہ کوئی اس سے اُلفت کرتا ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں،

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بددعا دیتا ہے، اور نہ گالی دیتا ہے، اور نہ بدزبان ہوتا ہے،

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے، اور نہ اُس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا، خدا اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائیگا،

۱۳۔ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اُس ذات کی قسم جس کے

ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو،

۱۴- جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے،

۱۵- بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے،[1]

ان مذکورۂ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے، کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے:-

اخلاقِ حسنہ، صفاتِ الٰہی کا سایہ ہیں

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں، اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے، ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفاتِ ربانی کا عکس ہیں، اور انہی کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پرجلال صفتیں بھی ہیں جو صرف خدا ہی

[1] یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتبِ حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں، مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے،

کو زیبا ہین، جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ مین کمال یہ ہے کہ اُن کی مقابل کی صفتین اس مین پیدا ہون، خدا کی کبریائی کے مقابلہ مین بندہ مین خاکساری اور تواضع ہو، اور خدا کی بلندی کے مقابلہ مین بندہ مین پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے، کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض مین ترقی کرینگے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہیگا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہین،

اخلاقی معلّموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

دنیا مین اخلاق کے بڑے بڑے معلّم پیدا ہوے جن کے مکتب مین اکثر بڑی بڑی قومون نے ادب کا زانوتہ کیا، اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کئے، جو سینکڑون اور ہزارون برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک اُن کو یاد ہین، اور سچ یہ ہے کہ آج جہان کہین بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظریہ بتادے گی کہ ان اخلاقی استادون مین باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولون پر مبنی ہے، اور ان مین درسگاہ عالم کے سب سے آخری معلّم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہی،

لہ ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث مین اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہی، دیکھو سیرۃ جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۰۴-۴۰۵،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتین ہین، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبون کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل ودانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان مین سے اول کو انبیاء اور معلمینِ دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہین، ان دونون جماعتون نے اپنے درس وتعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے، پیغمبرون اور مذہب کے بانیون نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکمِ خداوندی" کو قرار دیا، اس حکم وفرمانِ الٰہی کے سوا اُن کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہین، نہ ان کی تعلیمات مین علت ومعلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتون کی گرہ کشائی ہے، اور نہ ان احکام وتعلیمات کی اخلاقی مصلحتون اور عقلی حکمتون کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات مین علت ومعلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض وغایت کی تعیین، قواے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے، مگر بحث ونظر سے آگے عمل کا درجہ صفرِ محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ع

یار ما این دارد و آن نیز ہم

دُنیا کے آخری معلم کی تعلیم مین حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امرِ ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونون کی آمیزش ہے،

انبیاءؑ اور حکماء مین جو اصلی فرق وامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاءؑ کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اُن کی معصوم زندگی، اُن کے مقدس کارنامے، اور اُن کے پاک اثرات

ہوتے ہین، جن کا فیض اُن کے ہر بنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بنکر نکلتا ہے، اور پیاسون کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے، اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اُس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، وہ گو دوسرون کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہین آتا، وہ دوسرون کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے، مگر خود عمل کی ہر راہ مین بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبون پر رحم کھانا اور دشمنون سے محبت کرنا وہ نہین جانتا، وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے، مگر وہ خود سچا اور راستباز نہین ہوتا،

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہین، اس لئے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہین بناتی، بلکہ ہوا کے تموّج مین مل کر بے نشان ہو جاتی ہے، اور انبیاء علیہم السّلام چونکہ جو کچھ کہتے ہین وہ کرتے بھی ہین، جو اُن کی تعلیم ہے، وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منہ پر ہے وہی دل مین ہے، اس لئے اُن کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بنکر اڑتا اور ہمنشینون کو معطّر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السّلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو مین نمایان ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور

ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہان تو مون کی قومین ہین، جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السّلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچین، اور آج زمین کے کرہ پر جہان کہین بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے،

مگر اس وصف مین سارے انبیا علیہم السّلام یکسان نہین ہین، بلکہ اُن کے مختلف مدارج ہین، اُن کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ اس کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت مین نمایان ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق، اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق اُن کی عملی مثالون سے متأثر ہون، اور پھر وہ روایتون کے اوراق مین محفوظ رہین، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اُس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکین، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لئے حسب ذیل معیارون پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے،

(۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ مین نہ ہو،

(۲) اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو،

(۳) اس کی اخلاقی زندگی مین یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانون کے ہر کارآمد گروہ کے لئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو،

بے پردہ زندگی تنقید کے ان معیارون پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبون کے بانیون کی زندگیون کو جانچین تو معلوم ہوگا کہ ان مین سے کسی کی زندگی بھی پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی

حیاتِ پاک کے برابر جامع کمالات نہین۔ دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہین ہے، جسکی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبرون مین سے کونسا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم مین ہین، ان غیر اخلاقی قصون کا ذکر فضول ہے، جن کو توراۃ کے راویون نے ان معصوم بزرگون کے حالات مین شامل کر دیا ہے، اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطرین تمہارے سامنے ہین، اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس ۳۳ برس کی زندگی مین سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسون کے حالات مین سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت مین کیا ہم یہ کہہ سکتے ہین کہ انکی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ مین نہین؟

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیان مذاہب کی اخلاقی زندگیون کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے دنیا مین کوئی سامان ہی موجود نہین، کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا مین محفوظ

اور سب کو معلوم ہے، اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے، جس مین محمدؐ کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایان[1] ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت مین کرتے دیکھو، اس کو جلوت مین برملا بیان کرو، جو حجرہ مین کہتے سنو اس کو چھتون پر چڑھ کر پکارو، الا فلیبلغ الشاھد الغائب،

قول کے ساتھ عمل اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے، ان مقدس ہستیون کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی مین کوئی شبہ نہین، لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگون کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پُرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ) کی معصومانہ باتین، سچائی اور راستبازی کی نصیحتین، اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلون سے بھری ہوئی تقریرین دنیا نے سنین، اور اُن کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن مین ہے، مگر کیا اس کی آنکھون نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالین بھی دیکھین؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "سب کچھ جو تمھارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ مین لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت مین داخل نہ ہوگے[2]" کیا اُس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ مین لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریرون کا مقابلہ نہ کرو" کیا اس نے خود بھی شریرون کا مقابلہ نہین کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنون

---

[1] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمدؐ ص ۱۰۰، [2] انجیل،

کو بھی پیار کرو۔" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر۔" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمھارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایان گال بھی اس کے سامنے کر دو۔" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ تم سے اگر کوئی تمھارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور مین آئی؟ ہم یہ نہین کہتے کہ حضرت مسیح مین یہ صفتین موجود نہ تھین، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے اُن کی اس حیثیت کو محفوظ نہین رکھا ہے،

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیون کو طعنہ دیا کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (بقرہ - ۵) (کیا اورون کو نیکی کی بات بتاتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانون کو متنبہ کیا کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (صف - ۱)

(تم کیون کہتے ہو جو کرتے نہین، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہان کہ کہو وہ جو نہ کرو۔)

ایک شخص نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا، کیا تم نے قرآن نہین پڑھا، کان خلقہ القرآن[1] جو قرآن مین الفاظ کی صورت مین ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت مین بصورت عمل تھا

[1] ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل۔

اگر غریبون اور مسکینون کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، اور دوسرون کو کھلایا، اگر آپ اپنے دشمنون اور قاتلون کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنون اور قاتلون کو معاف کیا، کھانے مین زہر دینے والون سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہین لیا، جنھون نے آپ پر تیر برسائے اور تلوارین چلائین، مسلح ہو کر بھی کبھی اُن پر ہاتھ نہین اٹھایا، کپڑون کی شدید ضرورت کے وقت مین بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد مین یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہین، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانون کو اپنے ہادیون اور رہنماؤن کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہین، اور اُن کی پیروی کی دعوت دیتے ہین، اور مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونون اور کارنامون کو بھی پیش کرتے، اور اُن کی پیروی کی دعوت دیتے ہین، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانیِ دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصرون کے سامنے پیش نہین کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا، فرمایا،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس-۲)

(اے منکرو!) مین تو تمھارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہون، کیا تم نہیں سمجھتے

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا گیا،

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (ن-۱) (اے محمدؐ!) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل و مکمل | اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم مین یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسرون کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصون کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکون کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلمون کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس مین تھی؟ کیا اس مین جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس مین جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس مین تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ-۱)

وہ اُن کو خدا کی باتین سناتا، اور اُنکو پاک و صاف بناتا، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے،

اس تحدی اور اعلان مین یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے، کہ اس مین اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہین ہے کہ وہ لوگون کو کتاب و حکمت کی باتین سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اُن کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصون کو کامل، گنہگارون کو نیک، اندھون کو بینا اور

تاریک دلون کو روشندل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اُس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا "تیئیس" برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا،

تعلیم اخلاق کا تنوع | اگرچہ کسی معلم مین تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کیلئے ایک ہی قوت کے انسانون کی نہین بلکہ سینکڑون مختلف قوتون کے انسانون کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہون پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہان صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہین، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ مین فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایان نہین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب مین عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہین، بودھ کے وہار اور خانقاہ مین دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیرون کے سوا کوئی اور موجود نہین، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہِ اعظم مین اگر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس مین انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہین، اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہین،

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوے ادب تہ کرتے ہین، اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہین، مدینۃ النبیؐ کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجورون کے پتون سے اور ستون کھجور کے تنون سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشون مین ان انسانی جماعتون کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہین کہین ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہین، کہین طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ و سعدؓ بن معاذ و سعدؓ بن جبیر جیسے ارباب رائے و تدبیر ہین، کہین خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص جیسے سپہ سالار ہین، کہین وہ ہین جو بعد کو صوبون کے حکمران، عدالتون کے قاضی، اور قانون کے مقنن بنے، کہین اُن زہاد و عبّاد کا مجمع ہے جن کے دن روزون مین اور راتین نمازون مین کٹتی تھین، کہین ابوذرؓ و سلمانؓ و ابودرداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہین، جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہین وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گذارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب مین مصروف رہتے تھے، کہین حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلامون کی بھیڑ

ہے، تو دوسری جگہ آقاؤن کی محفل ہے، کہین غریبون کی نشست ہے، اور کہین دولتمندون کی مجلس ہے، مگر ان مین ظاہری عزت اور دنیادی اعزاز کی کوئی تفریق نہین پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر، اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہین، سب پر توحید کا یکسان نشہ چھایا، اور سینون مین حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجین لے رہا ہے، اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش مین لگے ہین[1]،

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل و تشریح کے لئے ہم کو تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ اخلاق کے کانٹون مین الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اُس وقت سے ہے، جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، اُن کے اسباب و علل کی تلاش، اُن کے اصول و قوانین کی تحقیق، اور اُن کی غرض و غایت کی تعیین، یونانیون کے عہد مین شروع ہوئی، اور موجودہ عہد مین علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریون پر نظرثانی کی گئی، ان اسباب و علل، اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق مین شروع سے آج تک فلسفیون مین قدم قدم پر اختلافات رونما ہوے، ہر سوال کے جواب مین متعدد نظریئے بنتے اور بگڑتے رہے، اور

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھٹے خطبون پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے، اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنھیں یونانی اصطلاح میں "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو "ضمیریہ" اور دوسرے کو "افادیہ" کہہ لیجیے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہئے، پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے، اور دوسرا "عقل" پر، پھر اس منشاے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے،

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں علماے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہکر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت اُن کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں، یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لا سکے، انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا، اور کسی نے اس سے باہر، جنھوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انھوں نے باختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو، انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنھوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھوں نے

قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم، اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم، یا بادشاہ کا حکم، یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے، مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق کے امہاتِ مسائل مین کبھی قبول نہین کیا جا سکتا۔

بہرحال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہین جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ مین بیان بھی کیا ہے، اور اپنے بندون کی فطرت مین ودیعت بھی رکھا ہے تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے، فلسفیانہ کاوشون اور موشگافیون کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہین، کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکین، ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہون، اسی طرح معیارِ اخلاق کے اختلافات مین بھی توافق ممکن ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال مین لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار، یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس مین ملحوظ ہو، اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی

فلسفہ مین یہ سب جہتین ایک کام مین مجتمع ہو سکتی ہین،

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد، خدا کا حکم بھی ہے، اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے، اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے، جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے. ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتین بھی ہین، اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس مین بھی شک نہین کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہو سکتے ہین، جہان خدا، ضمیر، فطرت، جذبات، اور وجدان کا ایک حکم ہو، اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو، اسی لئے اخلاق کے باب مین وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے،

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہئے، وجدان کہئے، حاسۂ اخلاقی کہئے، ضمیر کہئے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہین، اور باوجود اس کے وہ اُن کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان مین زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہین جن کی اچھائی یا برائی پر آب وہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرزِ حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومین بلا دلیل متفق اور متحد ہین، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃ ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت

ہین، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات، اور ملموسات وغیرہ کے لئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہین، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے، جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہین، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہین جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو ہر وقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے، اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہین رکھتی،

تعلیمِ محمدیؐ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہین تفصیلی اور کہین اجمالی اشارات کئے ہین، مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہین کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی اُن کے علم و فلسفہ مین نہین، بلکہ اُن کے عمل مین ہے اس لئے "علم بلا عمل" کی کوئی قدر و قیمت اُس کی نگاہ مین نہین، لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اُس نے پسندیدہ نہین سمجھا ہے، اسی بنا پر اُس نے ان اصولون کی طرف اشارے تو کئے ہین، مگر اخلاق کے باب مین اُن کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہین دی ہے،

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھکر ادا کئے جائین کہ یہ خدا کے احکام ہین، وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہین، انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ، اور عقل مین سے جس ایک کو

یا سب کو اصل کیئے ہونا چاہیئے، ان مین باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہو گی، اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا، اور جس حد تک ان مین کمی ہو گی اسی حد تک اس کے کمال مین نقص ہوگا،

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے، پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیئے، اُس کا وجدان بھی یہی ہو اُس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اُس کے کرنے مین وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے، اور اسی کی پیروی مین نوعِ انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ مین اس بارہ مین باہم موافقت اور یکسانی ہو گی، اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توافق مین کمی ہو گی کہ خدا کا حکم سمجھکر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے، یا اُس سے اُس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال مین نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دین، لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہین سمجھتا، اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہے، تو اس کے یہ صاف معنی ہین کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہین ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادۂ عام

کی غرض سے انجام دے، مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس مین ملحوظ نہ رکھے. تو وہ کام بھی اسلام کی نظر مین ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہین،

بے غرضی چونکہ اسلام مین اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزون کی طرح عبادت ہے، اس لئے اس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے، اگر ایسا نہین ہے تو ان کامون مین کوئی نیکی اور ثواب نہین، اور نہ اُن کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کامون کو چھوڑ کر، دنیاوی کامون پر بھی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام مین جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے، ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کرین، اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چُن دین، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطرداری کی تہ مین ذاتی نفع، یا ریاکاری یا نمایش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم اس کی نگاہ مین بے قیمت ہو جاتی ہے، لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان ونمک ہی رکھدین، تو اس کی وقعت اور قدر وقیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی، تو جب دنیاوی کامون مین اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہین تو روحانی عالم مین اُن کے نتائج کہان تک ہون گے،

نیت اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات مین نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت مین روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہین ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اسکی

اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالون سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہوجائیگی
ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی مین اپنے گھر اس لئے بلایا کہ اس کو
یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالین گے یا سخت تکلیف پہنچائین گے، اتفاق یہ کہ وہ
اندھیرے مین بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا، اور وہان اس کو اشرفیون کی تھیلی راستہ
مین پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی مین
اب بھی کوئی شک نہین، اور نہین کہا جاسکتا کہ اُس نے رات کو اندھیرے مین بلواکر
اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے مین درحقیقت اسکے
ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ مین کسی گڈھے
یا کنوئین مین گر کر مرگیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا، کہ گو جانے والے
کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی،

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب مین روپیون کا ایک بٹوا تھا، اتفاق
سے وہ راستہ مین گر گیا، جب مین راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوا پڑا دیکھا، اور دل مین
یہ خیال کرکے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھالیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے
مین کسی برائی کا مرتکب نہین ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کرچکا، لیکن
فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا، اور مین نے اس کو
اپنا سمجھ کر اٹھالیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، تم
راستہ مین کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ

اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت مین اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت مین اسکی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمایش ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لئے کرین کہ لوگ آپ کی تعریف کرینگے، تو اسلام کی نگاہ مین یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورۂ آل عمران مین ہے،

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ	اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دینگے،
مِنْهَاج وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ	اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اُس کو
نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آل عمران - ۱۵)	وہ دین گے،

ایک اور آیت مین اس کی تصریح کردی گئی ہو کہ جس کام کا مقصد صرف نمایش اور دکھاوا ہو اُس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہین، فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	اے ایمان والو! تم اپنی خیراتون کو احسان
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى	دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ
كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگون کے
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ	دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہی اور خدا
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ - ۳۶)	اور قیامت پر یقین نہین رکھتا،

اسی قسم کی اور بہت سی آئتین ہین، جن کی تفسیر مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع ومانع الفاظ فرمائے ہین،

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری باب اول) — انسان کے اعمال اسکی نیت پر موقوف ہیں

اور اس کی مزید تصریح کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے،

ولکلِّ امرئٍ مانوی فمن	ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ
کانت ھجرتہ الی اللہ و	نیت کرے، توجس کی ہجرت خدا و
رسولہ فھجرتہ الی اللہ	رسول کی طرف ہے، تو اس کی ہجرت
ورسولہ ومن کانت ھجرتہ	خدا اور رسول کی طرف ہے، اور جس کی
الی دنیا یصیبھا او امرءۃ	ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی
یتزوجھا فھجرتہ الی ما	عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے.
ھاجر الیہ[1]،	تو اسکی ہجرت اسی کی طرف ہے جسکی غرض

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمامتر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے، اور اسی لئے اخلاق کی بحث مین اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، حسنِ نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑا سا بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف وستایش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت، اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے،

فلسفۂ اخلاق کی تائید | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف

[1] صحیح بخاری جلد اول باب ماجاء ان العمل بالنیۃ،

بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان، ایس میکنزی اپنی تصنیف "مینول آف ایتھکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب مین لکھتا ہی:

جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے وہ صاف ہی یعنی فعلِ ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہی یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمامتر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہین، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل مین ارادہ شامل نہین اس کی اخلاقی حیثیت نہین، ....

اس مسئلہ کی ایک دو مثالین دے کر کینٹ کی راے نقل کی ہی،

"اسی لئے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعوی کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ" بجز اچھے ارادے کے دنیا بھر مین بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہین ہے، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے[1]"۔

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمامتر بنا، ارادہ و نیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کیلئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع مین ہون یا تنہائی مین، اندھیرے مین ہون یا روشنی مین تاہم کوئی ہے

---

[1] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردۂ جامعۂ عثمانیہ، ۱۳۴۱ھ،

جن کی آنکھین اُس کے دل کی تہ کو ہزار پردون مین بھی دیکھ رہی ہین، دنیا کی تمام قوتین صرف جسم پر حکمران ہین، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اُس ہستی کے آگے اپنے تمام کامون کا جوابدہ ہونا ہے، اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ مین جاگزین نہ ہون گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے موجود قطعی محال ہے، اسی لئے وحی محمدی نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمایش بنجاتا ہے، فرمایا،

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا	اے ایمان والو! اپنی خیراتون کو جتا کر
صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ	یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد
كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ	کرتا ہے، جو اپنے مال کو لوگون کے
وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ	دکھانے کو خرچ کرتا ہے، اور خدا اور آخری
الْآخِرِ، (بقرہ-۳۶)	دن پر یقین نہین رکھتا.

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیّت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہین،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ	اور جو خدا اور قیامت کو نہین مانتے، ان کے
بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً	کام ایسے ہین جیسے میدان مین ریت کہ پیاسا
حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور۵)	اسکو پانی سمجھے، جب وہان وہ جائے تو اسکو [illegible]

یہی وہ شعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو،

اَوْ کَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ	یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والوں
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ	کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے
فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمَاتٌ	میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہو
بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ	اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس پر گھٹا
اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ	چھائی ہے، تاریکیاں ہیں، ایک پر
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ	ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا
نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ،	نہیں، اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی
(نور - ۵)	اس کو کہیں روشنی نہیں،

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، بازپرس اور جوابدہی کا یقین نہ ہوگا دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی، اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے،

غرض و غایت

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قالب ہے تو صحیح غرض و غایت اسکی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل

درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہین ہوتا، لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہین ہو سکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے کر آج تک بیسیون نظریے قائم ہو چکے ہین، لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہین اسلام کو اس سے بحث نہین کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنی اور اعلیٰ، پست اور بلند متعدد غرضین اور غایتین ہو سکتی ہین، ہم راہ مین یک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہین، اور اس کو اس کے گھر تک بآرام پہنچا دیتے ہین، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پہنچ کے بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کرین گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب مین وہ ہم کو اپنی رائے دین گے، یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت مین دیکھ کر ہمین بڑا نیک اور دیندار سمجھین گے، یہ بھی غرض ہو سکتی ہے کہ آج اگر جوانی مین اس بوڑھے کی مدد کرین گے تو کل ہمارے بڑھاپے مین کل کے نوجوان ہماری مدد کرینگے، بعض نیک لوگون کو ایسے کامون کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لئے اس قسم کے کامون کو کرتے ہین، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہین جو ایک بوڑھے کو اس حال مین دیکھ کر ترس کھاتے ہین، اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہین، الغرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے

کامون کی غایت اور محرک ہو سکتے ہین لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جارہے ہین، اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابلِ قدر ہے۔ کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے۔ اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لئے کرنا بھی گو پست مقصد ہے۔ مگر پہلے سے بلند ہے۔ پھر روحانی خوشی، اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی تہ مین اس کی فلان ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہون سے گرجاتی ہے، اور یہ سارا جادو بے اثر ہوجاتا ہے،

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کامون کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہین لیکن درحقیقت اس مین بھی گو اس دنیا کی نہین، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے۔ اس لئے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدیؐ مین بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہین دی گئی ہے۔ یہان تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہین،

طاعت مین تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ مین ڈالدے کوئی لے کے بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے، اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب و لاچار آدمی کو دیکھکر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعًا ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے، ہر اچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے، اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے،

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اُس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے،

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، (الشمس) ہر نفس میں اسکی بدی اور نیکی الہام کر دی گئی

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے، اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحیِ محمدیؐ کی اصطلاح مین اُس کا نام نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامت مین ہے،

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ	اور قسم کھاتا ہون اس نفس کی جو انسان کو اسکی برائیون پر ملامت کرتا ہی؛
(قیامت-۱)	

آگے چل کر فرمایا،

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ، وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ،	بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، گرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانون (کے پردے) ڈال لیتا ہی؛
(قیامت-۱)	

نواس بن سمعانؓ انصاری ایک سال تک اس انتظار مین مدینہ مین ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھین، آخر ایک دن انکو موقع مل گیا، اور انھون نے دریافت کیا، فرمایا "نیکی حسن اخلاق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل مین کھٹک جائے، اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانین" اسی طرح وابصہؓ بن معبد نام ایک صاحب خدمتِ نبویؐ مین نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چارون طرف جان نثارون کا ہجوم تھا، اور وہ شوق و ذوق مین سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا

تو فرمایا" وابصہ قریب آجاؤ" جب وہ قریب جاکر بیٹھے تو فرمایا" اے وابصہ مین بتاؤن کہ تم کیون آئے ہو، یا تم بتاؤ گے" عرض کی" حضور ہی ارشاد فرمائین" فرمایا، " وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو" عرض کی" سچ ہی یا رسول اللہ" فرمایا،

یا وابصة استفتِ قلبك	اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر،
واستفت نفسك البرُّ	اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر، نیکی وہ ہی
ما اطمأنَّ الیه القلبُ	جس سے دل اور نفس مین طمانیت
واطمأنّتْ الیه النفس	پیدا ہو، اور گناہ وہ ہے جو دل مین
والاثم ماحاكَ فی القلب	کھٹکے، اور نفس کو ادھیڑبن مین ڈالے
وتردّد فی النفس وان افتاكَ	اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی
الناس[1]،	کیون نہ بتائین،

یہی وہ حاسۂ اخلاقی ہے، جس کا نام لوگون نے ضمیر کی آواز رکھا ہے، پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اسکے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑجاتا ہے، اگرچہ ہوش مین آکر جب وہ توبہ واستغفار کرتا ہے، اور پشیمان ونادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہان تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کرکے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اسکو

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۲۲۸ مصر،

محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ مین ادا فرمایا،

اِنّ العبد اذا اخطأ خطیئۃ	بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے
نکتت فی قلبہ نکتۃ سوداء	دل مین داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑجاتا
فاذا ھو نزع واستغفر و	ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو علٰحدہ کر لیا
تاب صقل قلبہ وان عاد	اور خدا سے مغفرت مانگی، اور توبہ کی
زید فیھا حتی یعلو قلبہ،	تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے، اور اگر
	اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ

بڑھ جاتا ہے یہانتک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے،

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت مین ہے،

کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ	کبھی نہین، بلکہ اُن کے دبرے
مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۝ [له]	کامون کی وجہ سے ان کے دلون پر
(تطفیف - ۱)	زنگ چھا گیا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل مین فرمایا کہ منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ کے ادھر ادھر دونون طرف دو دیوارین کھچی ہین، اور ان دونون مین کچھ دروازے کھلے ہین، لیکن ان پر پردے پڑے ہین، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو، اور ادھر ادھر مڑو نہین، جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان داہنے بائین کے دروازون مین سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے:

[له] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور،

خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے" پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں، اور یہ پردے اس کے حدود ہیں، اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے،

هو واعظ الله فى قلب كل مومن ؎ وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے،

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے؟

مسرت وانبساط | یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے، کرنے والے کو جو خوشی، اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقۃً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ اُن کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب ولاچار کی امداد سے بے شبہہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض و غایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے، اور وہ خدا اور اس کی رضامندی کا حصول،

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے

؎ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالۂ احمد وبیہقی فی شعب الایمان ورزین وترمذی مختصراً،

اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ مین جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہو، اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض وغایت نہین، بلکہ اُس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علماے اخلاق مین بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہو کہ مسرت نیکی کی غرض نہین، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ مین ادا کیا ہے،

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ	لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا،
الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ	اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا
وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ	کرکے دکھایا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی
وَالْعِصْيَانَ ط اُولٰٓئِكَ	سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک
هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۔ (حجرات-۱)	چلن ہین،

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ مین اس طرح فرمائی

اذا سرتک حسنتک وساءتک	جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے، اور
سیئتک فانت مومن[1]	تمہاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو،
من سرتہ حسنتہ وساءتہ سیئتہ فہو مؤمن[2]	جسکو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنائے وہ مومن ہے،

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی، جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۴ حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر، و ابن حبان و ابوداؤد عن عمر بن الخطاب

[2] طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ کنز العمال جلد اول صفحہ ۳۰،

من عمل سیئۃ فکرھا حین	جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس
یعمل، وعمل حسنۃ فسرّ فھو	سے سخت نفرت آئی، اور جب کوئی اچھا
مومن[1]،	کام کیا تو اسکو مسرت ہوئی وہ مومن ہے

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق مین سابق لذت کی ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لئے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہین رہا ہے، بلکہ اس نظریہ مین جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرمادی ہے،

رضائے الہی اسلام مین ہر قسم کے نیک کامون کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے، اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہین بنانا چاہیے، یہین اگر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایان ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈھتے ہین کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے، اور معلم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہین کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہیے، انسان کے پاس دو ہی دولتین ہین، جان اور مال، اور انہی دونون کو خدا کی راہ مین خرچ کرنا، ایثار اور حسنِ عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا،

[1] مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۳ حیدر آباد،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ	بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی
نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ	خوشنودی چاہنے کے لئے بیچتے ہیں،
اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (بقرہ ۲۵)	اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

پھر مال کے متعلق فرمایا،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ	اور اُن کی مثال جو اپنی دولت
اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ	خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ
اللّٰهِ ۔ (بقرہ ۔ ۳۶)	کرتے ہیں،
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ
وَجْهِ اللّٰهِ ۔ (بقرہ ۳۷)	کی ذات کو چاہ کر،
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ	اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی
مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ	کے لئے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (نساء ۔ ۱۷)	اجر دینگے،
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ	اور جنھوں نے خدا کے لئے صبر کیا اور
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	نماز کھڑی کی، اور ہم نے جو اُن کو دیا
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	ہے، اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقے سے
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ	خرچ کیا، اور برائی کو نیکی سے دور
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ۳)	کرتے ہیں، انہی کے لئے پچھلا گھر،

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل مین کھولی گئی ہی"

اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی،	جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے
وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ	ہوے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان
تُجۡزٰۤی اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ	نہین ہے، جس کو ادا کرنے کے لئے
الۡاَعۡلٰی،	دیتا ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب
(لیل)	کے لئے دیتا ہے،

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث مین فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہین یا رسولؐ اللہ کوئی اس لئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لئے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لئے کہ اُس کو شہرت حاصل ہو، تو ان مین سے راہِ خدا مین لڑنا کس کو کہین گے، فرمایا "اس کو جو اس لئے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو"۱ ایک دفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لئے اجر کا موجب، کسی کے لئے پردہ پوش، اور کسی کے لئے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لئے ہے جو خدا کی راہ مین اس کو باندھتا ہے، تو اُس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لئے ہے جو ضرورۃً اس لئے باندھتا ہے کہ خدا نے اسکو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسرون سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ رحم وشفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور گناہ اس کیلئے

۱ صحیح بخاری کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۳۹۴.

ہے جو فخر اور نمائش کے لئے باندھتا ہے۔[1]

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے، اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے، اور جس کو سنکر حضرت معاویہؓ زار زار روئے، حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لئے اترے گا، اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے، اور جو جہاد میں مارے گئے تھے، اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا، کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اُتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا، "بارالٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، خدا فرمائے گا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائیگا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خوان ہے، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا، (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولتمند سے خدا فرمائیگا، کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا، یہانتک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا، عرض کرے گا، کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کریگا، تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہلِ استحقاق کا حق ادا کرتا تھا، اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت۔ و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ،

کہین گے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائیگا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہین کہ تو بڑا سخی ہے، تو یہ تجھ کو دنیا مین کہا جاچکا (تو اپنا بدلہ پاچکا) اس کے بعد وہ لایا جائیگا جو جہاد مین مارا گیا، تو خدا اس سے دریافت کرے گا، تو کس بات کے لئے مارا گیا، کہیگا، خدایا تو نے اپنی راہ مین جہاد کا حکم دیا تھا تو مین لڑا، یہان تک کہ مارا گیا، خدا فرمائیگا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہین گے یہ جھوٹا ہے، خدا کہیگا تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہین، تو دنیا مین تجھ کو یہ کہا جاچکا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہین جو سب سے پہلے جہنم مین ڈالے جائین گے[1]

حضرت معاویہؓ یہ اس حدیث کو سُنکر بہت روئے، پھر بولے خدا اور اس کا رسول سچا ہے، اور اس حدیث کی تائید مین قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی،

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق
وَزِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ	چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا مین
اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَهُمْ فِیْهَا	پورا کر دینگے، بے کم و کاست، ان
لَا یُبْخَسُوْنَ، اُولٰٓئِكَ	لوگون کا آخرت مین کوئی حصہ نہین
الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ	مگر دوزخ، اس دنیا مین انھون
اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا	نے جو بنایا، وہ مٹ گیا، اور جو
فِیْهَا وَبَاطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (ہود)	کیا وہ برباد گیا۔

[1] جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعہ،

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے، اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں، بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، (بقرہ - ۳۷)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر،
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ، (رعد - ۳)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لئے صبر کیا،
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ، (لیل)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لئے کرتا ہے،

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:-

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ، (الروم)	تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں،

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی

جو تکمیل ہوئی اُس کا پتہ اخلاق کے نفس بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنا اخلاقی تعلیمات مین شاہی احکام کی شان رکھی ہے، جس مین کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہین کی جاتی، انجیل مین لفظی صنایعون کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد بھی قائم نہین کی گئی ہے، تاہم عیسائی مذہب مین کچھ اصول ضرور موجود ہین، مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے، ان مین سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے،

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت مین سادہ ہے، یا گناہون سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل مین گنہگار پیدا ہوتا ہے. گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے، کیونکہ اس کے باپ اور مان حضرت آدم اور حوا گناہ گار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت مین منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن نہین، اس مسئلہ مین مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہین ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے تو وہ گناہگار مرا، اور آسمانی بادشاہی کے حدود مین وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم مین جھونکا جائے گا، کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہین پائی تھی

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے، فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگون کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے ازلی سوال کے جواب مین بَلٰی یعنی خدا کا اعتراف

ہر انسان روز ازل کر چکا ہے، اس لئے اس دنیا مین اگر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہین کیا، اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کیلئے کافی ہے، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زرین حرف لکھے ہین وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اُن کو اُبھار کر چمکا دیتا ہے، یا مٹا ڈالتا ہے۔ فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ، (التین)	ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا،

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا،

اَلَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِيْٓ أَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (انفطار-۱)	جس خدا نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت مین چاہا تجھ کو جوڑ دیا،

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس مین قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا ہے، اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہین، یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہین کہ اس مین کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم مین اس کے جسمانی اور روحانی دونون قویٰ کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتون مین یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے، سورۂ اعلیٰ مین ہے،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى
اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیْ
کر، جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا، اور

قَدَّرَ فَهَدٰی
جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا

(اعلیٰ - ۱)
پھر راہ دکھائی،

راہ دکھانا یعنی ہدایت، انسان کی فطرت مین اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے، جس طرح اس مین دوسرے بیسیون قوی اس نے ودیعت رکھے ہین، سورۂ دہر مین اس سے بھی زیادہ صاف ہے،

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ
ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے

نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ
سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا،
کر دیا اس کو سنتا دیکھتا، ہم نے اس کو

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا
راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گذار (نیکو

شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا، (دہر - ۱)
کار) ہوتا ہے، یا ناشکر (بدکردار)

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے، سورۂ شمس مین اس سے بھی زیادہ واضح ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا
قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے

فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ
کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا دیا

مَنْ زَکّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۔ (شمس - ۱)

سو جتا دیا) اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک صاف رکھا، اور ناکام ہوا وہ جس نے اسکو مٹی میں ملا دیا (یعنی گندہ کر دیا)

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہ گار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی اصلی فطرت مین ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے، اسی لئے یہ کہا گیا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (روم - ۴)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگون کو پیدا کیا، خدا کے بنائے مین بدلنا نہین، یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہین جانتے،

یہ دینِ فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہین، جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر مین فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اسکے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہین، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل مین صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہین پیدا ہوتا[1]؛ اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح

[1] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الایمان،

فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انھوں نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، بَلیٰ" ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے"۔ یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے۔ اور کہا ہے کہ "دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ"۔

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت میں معصوم و بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں لاتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى، (فاطر-۳)	اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔
كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ، (طور-۱)	ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الا لا يجني جانٍ على ولده	ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں
ولا مولودٌ على والده،	اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ،

سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر

اسی طرح اُن مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر

مین پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدایش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ٹھہرایا ہے، انھون نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھدیا ہے، اس کی ہر پیدایش کو دوسری پیدایش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا، اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرمون کے ہاتھون مین مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے،

اب غور کیجئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت مین بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لئے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہو کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ "خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لئے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے"[1]

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیان جو بِن کھلے مرجھا گئین، اسلام کی نگاہ مین جنت کے پھول ہین، آپ نے فرمایا کہ "جس مسلمان کے بچے بچپن مین مرگئے وہ خدا کے دربار مین اپنے مان باپ کے شفیع ہون گے، اور ان کو جنت مین لے جائین گے"[2] آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے شیرخوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی، تو فرمایا، "یہ جنت مین جا کر جنتی دایون کا دودھ پئے گا"[3] اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچون کی نسبت آپ سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق و ترمذی فی من لایجب علیہ الحد [2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہٗ ولد [3] ابن ماجہ کتاب الجنائز،

دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہان رہین گے، فرمایا "خدا کو علم ہے، کہ یہ کیا ہوتے"۔ لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی، ایک دفعہ رویار مین حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنّت مین بیٹھے ہین اور ان کے چارون طرف کمسن بچون کا ہجوم تھا، فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دینِ فطرت پر مر گئے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! اور مشرکون کے بچے! فرمایا "اور مشرکون کے بچے بھی"۔ ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی مین مرجانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے، اس لئے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہدینا آپ نے مناسب نہین سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مرگیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، "یا رسول اللہ! اس کو مبارک ہو، یہ جنت کی چڑیون مین سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا" فرمایا "اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے کچھ لوگ پیدا کئے ہین اور جہنم کے لئے کچھ لوگ"۔ ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مرجانے والے کمسن بچون کو جہنم مین جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو اُن کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اور اُن کے جنازہ کی نماز مین یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے، "خداوندا! اس کو میرے لئے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اسکو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ مین مقبول ہو"۔ احادیث مین ایسے موقعون

۱؎ صحیح مسلم کتاب القدر ۲؎ صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلوٰۃ الصبح ۳؎ یہ حدیثین صحیح مسلم کتاب القدر مین ہین، نیز امام نووی کی شرح مسلم مین بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد ۴؎ جلد ۲ صفحہ ۳۲۰ و ۳۲۷ زنکشوئن

پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے اکثر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ "وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اُس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے[1]"

خوف و رجا

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیون مین دو گروہ گذرے ہین، ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہین پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمامتر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا مین چہل پہل، عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہین دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو، اور زندگی مین موت کی صورت بنالو، کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو، اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونون رائین ترمیم کے قابل ہین، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوی سرد ہو کر رہ جاتے ہین، اور وہ دنیا مین کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہین باقی رہتا، اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت مین مست و سرشار ہوتا ہے، اور اوس کو نیک و بد کی تمیز نہین رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونون گلیون کی بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے، کہ دل بادۂ غفلت مین سرشار نہ ہو، اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہین ہونے دیتا،

[1] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا، و صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج

وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے، اُس کی شریعت میں خدا سے نا امیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نا امید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ۔ (حجر-۴) (ابراہیم) نا امیدوں میں سے نہ بن،

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی،

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ط اور اللہ کے فیض سے نا امید مت ہو

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اللہ کے فیض سے نا امید وہی ہیں جو

اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (یوسف-۱) خدا کے منکر ہیں،

اس اُمت کے گنہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے،

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی

عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ جانوں پر آپ ظلم کیا، تم خدا کی رحمت

رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط (زمر-۶) سے نا امید مت ہو،

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پُر امید رہنے کی تاکید کی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں[1]" یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے، وہی اس کے

---

[1] جامع ترمذی، کتاب الزہد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ،

لئے ہوجاتا ہون، اس بارہ مین اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے،

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۤءَ الَّيْلِ	بھلا ایک وہ جو بندگی مین لگا ہے،
سَاجِدًا وَّقَاۤئِمًا يَّحْذَرُ	رات کی گھڑیون مین سجدہ کرتا ہے،
الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ	اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا
رَبِّهٖ ط (زمر-۱)	ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے

یعنی اُس کے دل مین یہ دونون کیفیتین یکجا مین، گناہون اور تقصیرون کے مواخذہ اور بازپرس کا ڈر بھی ہے، اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، خدا کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ ڈر اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہین ہونے دیتا، اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہین ہونے دیتی، اسی لئے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا	اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافرون
يَرْجُوْنَ ، (نساء-۱۵)	کو نہین،

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم مین ایک مومن اور ایک کافر کے دل مین پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہان ہے، اور جب وہ اُس کو نہین پاتا، تو دل شکستہ ہوجاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہین ملتی تو افسردہ ہوجاتا ہے، لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی

کامیابی سے ہم آغوش نہین بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شادان اور فرحان رہتا ہے،
کہ اس نے نیکی کا کام کیا، اور بہرحال اس نیکی کا یہان نہین تو وہان معاوضہ ضرور ملیگا،
اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہرحال ملیگا،
اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسلمانون کو ہر نیک کام مین جری اور بہادر بنا دیا ہے،
اور اُن کو بغیر کسی مادّی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے،
کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قومون مین ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیون کا عام طور سے
رواج ہے، ہندوستان مین ہندو عورتون کے جان دینے کے واقعات ہر روز
اخبارات مین پڑھے جاتے ہین، یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکون مین ذرا ذرا سی
ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بنگیا ہے، جس وقت یہ سطرین لکھ رہا
ہون وارسا (پولینڈ) مین ناکام نوجوان لڑکیون کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک
مجلس کے قیام کی خبرین اخبارون مین چھپ رہی ہین، مگر کسی مسلمان مین اخیر سے
اخیر لمحہ مین بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہین ہوتا، اور خدا کے فضل وکرم سے اُس کی
آس نہین ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولادوالا ہو کہ بے اولاد،
کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت مین وہ پُرامید رہتا ہے، مشکلات
مین، بیماریون مین، محتاجیون مین، ناکامیون مین، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ
خدا کی رحمت کا امیدوار ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونون اسکے
مذہب مین ایک ہین، اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہان نہین تو وہان ضرور ہے،

کہ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

اَنِّی لَآ اُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنکُمْ (آل عمران - ۲۰)

مین تم مین سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہین کرتا۔

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانون کے باہمی تعلقات مین خوش نیتی، اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یا یون کہئے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہین، انکو ادا کرنے کو کہتے ہین، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لئے باہم انسانون مین تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن مین نہین پائی جاتی ہے، اسی لئے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علٰحدگی، اہل وعیال، عزیز و قریب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے، یا کم کر دیتی ہے،

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لئے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب مین اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے، اور وہ خود اور ان کے عقیدتمند بھی اسکو انکی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقۃً ان مذہبی افراد اور جماعتون نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لئے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظرون سے چھپا کر بادشاہون کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایان کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے مین مدد ملے، اور دوسری طرف اپنی

زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکین اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم و ملت کے فرائض و حقوق بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائین، اسی لئے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق مین راہبانہ جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہین کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمعِ انسانی مین رہ کر اور تمامتر انسانی جد و جہد مین شریک ہو کر گذاری ہے، یہی طرزِ عمل خلفاے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہؓ کا تھا، اور پورا قرآنِ پاک اسی انسانی جد و جہد، اور انسانی مجمع کے ساتھ عملِ صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرّد، علٰحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن مین موجود نہین ہے،

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتون کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہین، اُن سے ہٹ کر نہین، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ مین گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہین، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہین؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہین؟ کیا وہ غریبون کا سہارا بنتے ہین؟ کیا وہ یتیمون کے سرپرست ہین؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہین؟ کیا وہ لوگون کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہین؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہین؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور جہاد

جیسے فریضوں سے عہدہ برا ہیں، حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لئے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے،

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا، (تحریم-۱) — تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ.

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اُس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا، امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے"[1]

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اسی لئے وحی محمدیؐ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا، اور کہا،

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (انفال) — اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا،

بلکہ اس کی لپٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی، کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجہا ص ۷۸۳۔

ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک مین اصحاب سبت کے قصہ مین ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگارون ہی مین شامل کیا ہے،

دنیا درحقیقت جدوجہد اور دار وگیر کا ایک میدان ہے، جس مین تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہین، راستہ مین سب لوگون کے ساتھ چلنے مین یقیناً بہت کچھ تکلیفین ہین، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے، اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھکر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے بیہقی نے شعب الایمان مین اور ترمذی نے جامع مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے،

ان المسلم الذی یخالط	وہ مسلمان جو لوگون مین مل جل کر رہتا
الناس ویصبر علی اذاھم	ہے، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر
افضل من الذی لا یخالط	کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگون
الناس ولا یصبر علی اذاھم[1]	سے نہین ملتا، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہین کرتا،

گوشہ گیری اور جماعت سے علٰحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے،

[1] شعب الایمان بیہقی و جامع ترمذی، کتاب الزہد صفحہ ۴۱۲،

اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ اُن کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی قدریں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کرکے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کردے، یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا، اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی،

آپ نے فرمایا کہ "بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے[1]"۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر | اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتوں کیلئے کہنا، اور بری باتوں سے روکنا) ہے، قرآنِ پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	تم سب سے بہتر امت ہو، جو لوگوں
لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	کے لئے باہر لائی گئی، اچھی بات کا حکم
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (آل عمران-۱۲)	دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو،
يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ	وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری
عَنِ الْمُنْكَرِ، (توبہ-۹)	بات سے باز رکھتے ہیں،
پھر خاص طور سے حکم ہوا	
وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ	اچھی بات کا حکم دے اور بری
عَنِ الْمُنْكَرِ، (لقمان-۲)	بات سے روک،
مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ	
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا	اور وہ آپس میں سچائی اور ثبات [ہیں]
بِالصَّبْرِ (العصر)	قدم کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا	اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور
بِالْمَرْحَمَةِ،	مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو
(بلد-۱)	نصیحت کرتے ہیں،

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوم کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں،

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟" عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بنگیا ہے، اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے، جس کا نام "شخصی آزادی کی بحالی" ہے، لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گذرا کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں ہر شخص نگہبان ہے، اور تم میں ہر شخص سے اُس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی" قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے، اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے، بنی اسرائیل کے لئے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا، بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی، وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی، اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے، ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور اُس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا

لہ سفر تکوین۔ ۴-۹

لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہین کرتا تھا، بلکہ خود سمجھانے والون سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگون کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ اُن کے اس جرم کی پاداش مین ہلاک کرنے والا ہے، لیکن اُن پر جب عذابِ الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا، جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا، بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہوگیا، پہلا تو اپنے گناہ کے بدولت اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے سورۂ اعراف کے بیسوین رکوع مین یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر مین ہے،

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ	اور جب ان مین سے ایک فرقہ بولا
تَعِظُوْنَ قَوْمَا اِۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ	کہ تم کیون ایسے لوگون کو نصیحت کرتے
اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا	ہو، جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا
قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ	دینے والا ہے، انھون نے جواب
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ، فَلَمَّا	دیا کہ ہم تمھارے رب کے آگے اپنے
نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا	سے الزام اتارنے کے لئے اُن کو
الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ	نصیحت کرتے ہین، اور شاید کہ یہ نیک
وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	بنجائین، تو جب وہ بھول گئے جو اُن
بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا	کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع
يَفْسُقُوْنَ،	کرتے تھے بچالیا، اور گنہگارون کو
(اعراف - ۲۱)	ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا،

یہ قصہ بتاتا ہے، کہ اسلام کی نظر مین اپنے دوسرے بھائیون کو گرنے سے بچانا اور گرتون کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے! اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے! کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار رہے، جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اُس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہین، اور اُس کا کیا بلکہ خود رسول کا بھی یہ فرض نہین، فرمایا

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ، (مائدہ ونور) رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے،

اگر یہ فرض ادا ہو گیا، تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لئے سورۂ مائدہ مین فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ، (مائدہ-۱۴)

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تم اگر سیدھے راستہ پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہین بگاڑتا

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس آیتِ پاک کو پڑھ کر لوگون سے کہا کہ "لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے مین نہ ڈالین، کہ مین نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھین اور پھر اس کے دونون ہاتھ نہ پکڑ لین تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب مین گرفتار ہو جائین"، ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہ رضؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے، تو جواب دیا کہ مین نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ "نہین بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو، اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو، لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے، اور خواہشِ نفسانی کی پیروی کی

اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے، تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو، کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے، جس مین ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے"۔[۱]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا مین اپنے بھائی کا رکھوالا ہون" منسوخ کردیا، واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ مین نہین رکھیگی، ان کی حفاظت نہین ہوسکتی، قومون کے رسوم وآداب اور ایٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہین، دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیوٹ اور نج کی باتین معلوم ہوتی ہین، جن کا نفع ونقصان، کرنے والے کی ذات تک محدود ہے، مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متأثر کرتے ہین، ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی مین پھیل جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیون کی برائی نہایت ہلکی ہوکر رہ جاتی ہے، اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہین، اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیون کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے، اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز مین پوری قوم ہی کا اخلاقی مزاج فاسد ہوجاتا ہے، اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گرجاتی ہے، ترمذی مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی مجلس مین فرمایا کہ "بنی اسرائیل مین

[۱] یہ دونون حدیثین ترمذی کتاب التفسیر (مائدہ) مین ہین، صفحہ ۴۹۸ و ۴۹۹۔

اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا، کہ جب ان مین برائی پھیلنے لگی، تو پہلے تو اُن کے علما، نے منع کیا، لیکن جب وہ نہ رُکے تو وہ اُن کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے، صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داوُدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی،" اس کے بعد آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا "نہین جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو، اور اس کو حق پر نہ جھکا دو[1]"

یہ ہے اس باب مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم!

اس کے چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل وعامی کا فرض نہین ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کردے گا، یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیون سے بچا ہے، قرآن نے کہا،

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ	کیا تم دوسرون کو نیکی کا حکم دیتے ہو،
تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (بقرہ-۵)	اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو،

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (نحل-۱۶)	سے اور اچھی نصیحت سے بلا،

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السّلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا،

---

[1] جامع ترمذی تفسیر مائدہ،

فَقُولَا لَہٗ قَوْلًا لَّيِّنًا، (طٰہٰ-۲) تم دونون اس سے نرمی سے باتین کرنا

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی،

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اور تو اُن کو نصیحت کر اور اُن سے کہہ

قَوْلًاۢ بَلِيْغًا، (نساء-۹) اُن کے دل تک پہنچ جانے والی بات،

یہ تمام احتیاطین اور تاکیدین اس لئے ہین کہ لوگون مین ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے،

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ مین ہے، اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لئے تنفیذی قوت درکار ہو، صرف حکومت کا فرض ہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لئے دوسری قسم کی اور بیسیون برائیون کا ارتکاب ہو جائے،

تجسّس اور غیبت کی ممانعت یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے، اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسرون کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی جس کا نام تجسّس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے، کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہین کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھسکر اُس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے، یہان تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بنگیا ہے کہ

ع محتسب را درونِ خانہ چہ کار

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا ہے

کوئی شخص اپنے گھر مین بھی محفوظ نہ رہتا، لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر مین چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے، اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہین پہنچتا، اس لئے جماعت کو اس مین دخل دینے کی ضرورت نہین، اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہین کہ اس مین شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے، جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے، لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھرین تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی باد تند سے اُس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے، اسلام مین کسی گھر یا کمرہ مین بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اُس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرویة؛ یعنی کسی کے گھر مین داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لئے ہے کہ وہ اُس کو نہ دیکھے،

اس سلسلہ مین ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کیجائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسرون سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہین، بلکہ ممکن ہے کہ اُسکو جب یہ معلوم ہو تو واعظ وناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس مین مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے، اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے، چنانچہ وحی محمدی نے اسی لئے تجسُّس اور غیبت ان دونون چیزون کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا! كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ	اے ایمان والو! بہت سارے گمانون سے بچتے رہو کہ بیشک بعض گمان گناہ

اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ	ہے اور نہ کسی کا اندر کا بھید ٹٹولا کرو اور
بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ	نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو، بھلا تم میں سے
اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا	کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے
فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ	مردہ بھائی کا گوشت کھائے ہو سو
اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۞	تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو بے شبہ
(حجرات - ۲)	اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے،

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا، کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہین کرسکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری مین برا کہہ رہے ہو اپنے الزام کی مدافعت نہین کرسکتا، اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہین ہوسکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لئے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہین ہوسکتا، اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہوسکتی ہے، اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہوتی ہے، جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایان نہین، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر تم لوگون کی کمزوریون کی ٹوہ لگاتے پھروگے تو ان کو برباد کردوگے"[1]

غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات مین اخلاق کے کتنے لطیف

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب، باب النہی عن التجسس

نکتے پنہان ہین،

توسط اور اعتدال | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گذر چکا تھا، اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونون کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونون بکھری ہوئی کڑیون کو باہم ملا دیا،

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے، اور احسان ورفق وملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونون جز بالکل الگ الگ تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا، کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے اس مین احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے[1]، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، اُن کی شریعت مین عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے[2]، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل وانصاف کے جو اصول قائم کر دیئے تھے، اس کے مقابل مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظون مین فرمایا:-

---

[1] یہود کی سنگدلی کے سبب سے،

[2] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لئے،

تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو، جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑے اس کو چادر بھی دیدو، جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ، جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو،

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ (متی باب ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا، جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا، لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے سُن رہی تھی، وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا، لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتزاج پیدا کرکے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کردیا،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (نحل-۱۳) بے شبہہ خدا عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے،

یہ ایک اصولی تعلیم تھی، جس نے شریعتِ موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ

لے یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

خصوصیتون کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے،

عدل اور احسان | "عدل" اور "احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہی، قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے، "عدل" کے معنی "برابر" کے ہین، جو شخص کسی کیساتھ برائی کرے اُس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے، یہ **عدل** ہے، اور اُس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگذر کرنا یہ **احسان** ہے، اسلام مین ان دونون کے الگ الگ مراتب ہین، قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ مین اس نے دیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہین ہے، اور احسان ہر شخص کے ہاتھ مین ہے، اور یہ محض شخصی معاملہ ہے، قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے، اگر اس کو مٹا دیا جائے، تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے، اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے، اس لئے قانون کو سرے سے مٹانا جیساکہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ مین پیش کرکے ہمیشہ کے لئے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لئے قابلِ عمل نہین رہا، خود عیسائی سلطنتون کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے، کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہین رہ سکا اور نہ برائیون کی روک تھام ہوسکی،

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہی تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہین ہوتا، بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پاکر اسی گناہ

کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے، اس لئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کردینے کا پورا پورا حق نہین ہی، کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کرکے جماعت کے ہزارون لاکھون افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کررہا ہی، اس لئے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے مین بہت کچھ غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے، جو شریعتِ محمدی مین پوری طرح برتی گئی ہے، کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی،

پھر سب لوگ دنیا مین ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہین ہوئے، بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہین، جن کے لئے معاف کردینا، درگذر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے، اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تندخو پیدا ہوئے ہین، جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لئے بغیر چین نہین لے سکتے، ان کے لئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے، اور "برائی برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لئے ان کو رضامند کرلیا جائے، اس لئے ایک عالمگیر شریعت کے لئے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے آئی ہو عدل اور احسان دونون اصولون کی جامعیت کی ضرورت تھی،

قانون اور اخلاق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظون مین یہ ہے کہ دنیا مین امن وامان، اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور برائیون کے انسداد کے لئے دو چیزین ہین، قانون اور اخلاق، اور گو ان دونون کا منشا ایک ہی ہے،

اگر اُن کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہین، اور تنہا ان مین سے ہر ایک مین کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیون کو تو روک دیتا ہے، مگر دل مین اُس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہین کرتا، جو انسانیت کی جان ہے، اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بزور مجبور نہین کیا جا سکتا، اس لئے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیون کا استیصال کلیۃً نہین ہو سکتا، توراۃ محض قانون ہے، اور انجیل محض اخلاق اسی لئے یہ دونون الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیون اور برائیون کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونون کو جامع ہے،

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدیؐ مین دو حیثیتون سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اُس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی، اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونون کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی، اور اپنی شریعت کی کتاب مین قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا،

اسلام نے ان برائیون کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسرون تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت مین رکھا، مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا، چنانچہ ان جرائم

کے لئے قرآن نے سزا مقرر کی ہے، جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور
جو باتین ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق تھین، اُن کو اخلاق کے دائرہ مین
رکھا، مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبون کی امداد وغیرہ، اس طرح شریعتِ محمدی
اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونون کا مجموعہ ہے،

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اس نے
ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اسکا
بدلے لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے، کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف
کردے، بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے، اس مجموعی تعلیم نے
حکومت کے قانونِ انتقام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونون
کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے، اور اس لئے وہ نسلِ انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو و نما
کی پوری طرح متکفل ہے، وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت
رکھتی ہے، اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگون کی روحانی تکمیل مین بھی کسی طرح
قاصر نہین، وہ نہ یہودیون کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے، اور نہ عیسائیون
کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے، بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے،

عفو اور انتقام

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات مین باہم جو باریک فرق ہے
وہ اسی قانون اور اخلاق کی علحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے، اسلامی قوانین کو پیشِ نظر
رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم مین اخلاقی روح نہین، لیکن اگر وہ

قانونِ محمدی کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو اُن کو یہ شبہہ پیش نہ آتا معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے، اُس کا حکم ہے،

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا۔ . . . . اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت" (احبار ۲۴-۷، اخروج ۲۱-۱۲ گنتی ۳۵-۳۱: استثنا ۱۹-۱۱-۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے، اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:-

"تم سُن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمھیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے دہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵-۳۰)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رہبانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے، عدل قانون ہے، اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں، اور جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کئے گئے ہیں، اس کی نسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ — اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں

عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى	برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے
اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ	آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ، (بقرہ ۔ ۲۲)	بدلے عورت،

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا، اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے،

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ	تو اگر اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ
شَيْءٌ، فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ	معاف کر دیا گیا، تو دستور کے مطابق
وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ط	اُس کی پیروی کرنا، اور نیکی کے ساتھ
ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ	اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمھارے رب
وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ	کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ،	تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ دارون
(بقرہ ۔	مین سے) اس (معافی یا خونبہا لینے)
ع ۲۲	کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کیلئے دردناک عذاب ہے

ان آیتون کی بلاغت پر غور کیجئے، کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ دارون کے درمیان کھلی دشمنی کے باوجود اُن کے جذبہ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ دارون کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم مین خونبہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی، اس لئے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا، اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ دارون کو معاف کر دینے یا خونبہا لینے کے بعد

انتقام لینے پر عذاب الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونون کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے،

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ	اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ مین یہ
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ	حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ
الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ	کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،
بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ لا	دانت کے بدلے دانت اور زخمون
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط فَمَنْ	مین برابر کا بدلہ، تو جس نے بخشدیا
تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ	تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے، اور
لَهُ ط وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ	جس نے خدا کے اتارے ہوئے
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝	حکم کے مطابق فیصلہ نہین کیا، تو وہی
وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى	ظالم ہین، اور ہم نے بنی اسرائیل کے
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا	ان پیغمبرون کے بعد مریم کے بیٹے
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ	عیسی کو بھیجا، جو اپنے آگے کی کتاب
وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ	توراۃ کی تصدیق کرتا تھا، اور اس کو
هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا	انجیل دی جس مین رہنمائی اور روشنی
لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ	ہے، اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ	کی تصدیق کرتی ہے، اور جو پرہیزگاروں
(مائدہ ۷-۷)	کیلئے ہدایت اور وعظ ونصیحت ہے،

۲- یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے، مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے، فرمایا

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ	اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا
اَمْوَالِكُمْ، (بقرہ-۳۸)	وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے،

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ	اور اگر قرضدار تنگدست ہو تو اس کو
اِلٰى مَيْسَرَةٍ ط وَاَنْ تَصَدَّقُوْا	اس وقت تک مہلت ہے جبتک
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	اس کو کشائش ہو، اور بالکل معاف
(بقرہ-۳۸)	کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر سمجھو

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا،

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ	اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف
مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ	تم کو دی گئی ہو، اور اگر صبر کرو تو یہ
لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ، (نحل-۱۶)	صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ	اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو،

هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ، وَجَزٰٓؤُا	تب وہ بدلہ لیتے ہین، اور برائی کا بدلہ
سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا، فَمَنْ	ویسی ہی برائی ہے، تو اگر معاف کر دیا
عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ	اور نیکی کی، تو اس کا ثواب دینا خدا
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (شوریٰ)	پر ہے، وہ ظالمون کو پیار نہین کرتا

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے مین پہل اور سبقت نہ کرین، لیکن اگر کوئی اُن پر ظلم کرے، تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہین جتنا ان پر کیا گیا، کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے، جیسا کہ توراۃ مین بیان ہوا ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے، (واصلح) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملیگا، اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے،

الغرض عفو اور انتقام مین سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے، اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو، تو جماعت کا نظام قائم نہین رہ سکتا، اور نہ ملک مین امن و امان رہ سکتا ہے، اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیون سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی، اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے، حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لئے ان مین سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظامِ ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا

مٹا دینا ہے،

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے، اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ مین دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجرا مین کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس مین بڑے چھوٹے، امیر وغریب اور اپنے اور غیر مین کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے، دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا، تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے،

جماعتی انتظامات کے قیام کے لئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے،

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي	اور تم کو اللہ کے حکم چلانے مین ان
دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ	دونون گنہگارون پر ترس نہ آئے،
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور-۱)	اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہان ہے، اور جو قیامت مین ہوگی، وہ اس سے کہین زیادہ سخت ہوگی، اس لئے اس گناہ کی سزا دنیا ہی مین دے دینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے، اس لئے اس سزا کے دینے مین نرمی نہ کیجائے، کسی سزا کے جاری کرنے مین اونچے نیچے اور امیر وغریب سے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم مین گرفتار

ہوئی، اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے، اور اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین سفارشین پہنچائی گئین تو فرمایا، "اے لوگو! تم سے پہلی قومین اسی لئے ہلاک ہوئین، کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا، تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے، خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو مین اس کے بھی ہاتھ کاٹتا۔"[1]

دوسری طرف عفو کا حال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہین کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہین لیا، الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا[2] ہے، تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو"۔ یہ عمل تھا تعلیم کی کیفیت یہ ہے، کہ حضرت انسؓ کہتے ہین کہ "مین نے آپ کی خدمت مین قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہین دیکھا، لیکن یہ کہ اس مین آپ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا۔"[3] یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرِ تاوان یا خونبہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا، معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہؓ سے فرمایا "آپس مین گناہون کو معاف کر دیا کرو، لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچیگا تو سزا ضروری ہو جائے گی۔"[4] یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلون پر قائم رہے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے، ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا اور عدالتِ نبویؐ مین پیش کیا گیا، آپ نے

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ومناقب [2] ایضاً کتاب الحدود [3] ابوداؤد ونسائی، کتاب الدیات [4] ابوداؤد کتاب الحدود

ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جن صاحب کی چادر تھی انھون نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لئے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، مین یہ چادر اس کے ہاتھ اودھار فروخت کر دیتا ہون" فرمایا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے کیون نہین یہ کر لیا"[1]

یہ تو اُس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے، اور اس لحاظ سے قانونِ محمدیؐ، موجودہ سلطنتون کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام مین اس سے بھی زیادہ وسیع ہے،

عفو و درگذر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے، وہ عفو، درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام مین شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اُس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے، تاہم مسلمانون کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ "تم مشرکون کے بتون کو برا بھلا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ وہ چڑھ مین تمھارے خدا کو برا کہہ بیٹھین":

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ — اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود،

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ — پکارتے ہین، ان کو برانہ کہو کہ وہ اللہ

عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (انعام - ۱۳) — کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہنے لگین،

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے، پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو، اور ان کو معاف کرو، اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانون کو ہو رہا ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ — معاف کرنے کی خو پکڑ، اور نیک کام

اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ، وَاِمَّا — کو کہہ، اور جاہلون سے کنارہ کر، اور

يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ — اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِيْعٌ — (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ

عَلِيْمٌ، (اعراف ۲۴) — وہ ہے سنتا جانتا،

سکون کی حالت مین عفو و درگذر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ مین بھی بے قابو نہ ہونے پائے، صحابہؓ کی تعریف مین فرمایا،

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ — اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف

(شوریٰ - ۴) — کر دیتے ہین،

نیکوکارون کی تعریف مین ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا، کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے،

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ — اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگون

عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ	کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے
الْمُحْسِنِیْنَ، (آل عمران-۱۴)	کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے!

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کردینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے، فرمایا،

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ	اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ، (شوریٰ-۴)	کیا تو وہ بیشک ہمت کے کام ہیں،

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی نے اپنے الفاظ میں عزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جو خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے، فرمایا،

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ	اور برداشت کر جس طرح ہمت
مِنَ الرُّسُلِ، (احقاف-۴)	اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کی،

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہئے، کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا،

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ	(لقمان-۲)	اچھی بات بتا، اور بری بات سے
عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ		روک، اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہا
اَصَابَکَ ط اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ	عَزْمِ الْاُمُوْرِ	لے، کہ یہ ہمت کے کام ہیں،

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کرلینا بھی بہادری ہے، فرمایا،

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ — اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ اختیار کرو
ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران ۱۹) — تو یہ بڑی ہمت کے کام ہین،

اوپر کی تمام آیتون مین صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام، بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے، اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسبِ ذیل آیت مین ایمان والون کو دشمنون کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا — (اے پیغمبر!) ایمان والون سے کہہ کہ
لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ — اُن کو جو ایام اللہ کی اُمید نہین رکھتے
(جاثیہ - ۲) — معاف کرین،

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہین رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہین جو کافر و مشرک ہین، اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے، اس کے باوجود مسلمانون کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کرین، اور ان کی خطاؤن سے درگذر کرین، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانون کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر اُن کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے،

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ — اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو،
اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ — یا چھپا کر کرو، یا کسی برائی کو معاف کرو

کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا، (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف

(نساء - ۲۱) کرنے والا قدرت والا ہے،

یعنی جب گنہگارون اور بدکارون کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندون مین بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہئے، اور اس تعلیم مین قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمھارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندون کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہے، اُس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہئے، اسی کے قریب یہ آیتِ پاک بھی ہے،

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا اَلَا تُحِبُّوْنَ اور چاہئے کہ معاف کرین، اور درگذر

اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ کرین، کیا تم نہین چاہتے کہ اللہ تم کو

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، (نور - ۳) معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی تم دوسرون کو معاف کرو، تو اللہ تم کو معاف کرے گا، اس مین عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے،

برائی کی جگہ نیکی عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو، اور جو عداوت رکھے اس کیساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیمِ ربانی پر عمل کرنے والون کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے اور بتایا ہے، کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے، فرمایا

لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب
اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا	بہتری سے دے، پھر دیکھ کہ وہ جس کے
الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ	اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا
كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ، وَمَا يُلَقّٰهَآ	ہو جایگا، جیسا ناتے دار دوست
اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا	اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے
يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ،	جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں
(حٰمٓ السجدہ ع ۵)	اور جس کی بڑی قسمت ہے!

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر دوسری جگہ فرمایا، مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو، کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیئے کہ وہ شیطان کے بہکنے سے بچائے اور غصہ سے محفوظ رکھے،

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ	مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ وَقُلْ	ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں، اور کہہ کہ اے
رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ	میرے پروردگار میں شیطانوں کی چھیڑ سے
الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ	تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس
اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ، (مومنون ۶)	سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے، اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے، مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ ۝

(رعد - ٣)

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں، جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں، اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کیلئے صبر کرتے ہیں، اور نماز ادا کرتے ہیں، اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں، اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کیلئے ہے پچھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ،

اُن سے کہا جائے گا،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ٣)

تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر،

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارتِ غیبی مین نہ تو نماز کا ذکر ہے، نہ خیرات کا، ور نہ خوفِ خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے، علاوہ ازین اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے، ایک اور آیت مین نومسلم یہودیون کو اپنے برخلاف اپنی ہم قومون سے جو دلآزار فقرے، اور اعتراضات سننے پڑتے ہین، اور وہ اس پر صبر کرتے ہین، اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے، کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہین،

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِى الْجٰهِلِيْنَ ۔ (قصص - ۶)	وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائین گے، اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہین، اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہین، اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہین تو اس سے درگذر کر لیتے ہین، اور کہہ دیتے ہین کہ ہمارے لئے ہمارے کام ہین اور تمھارے لئے تمھارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھون سے مطلب نہین،

ان آیتون کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے، نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کیا گیا

دیتے ہین، اور درگذر کرتے ہین بلکہ اُن کے حق مین سلامتی کی دعاے خیر بھی کرتے ہین

صحیح بخاری مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہین ہے جو احسان کے بدلہ مین احسان کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو[1]"۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ "اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہین جن کے ساتھ مین تو سلوک کرتا ہون، مگر وہ بدسلوکی کرتے ہین، مین نیکی کرتا ہون اور وہ بدی کرتے ہین، مین حلم اور بردباری سے پیش آتا ہون، اور وہ جہالت کرتے ہین" آپ نے فرمایا "اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو، تو تم اُن کے منہ مین مٹی بھر رہے ہو" یعنی نیکی کے لقمہ سے اُن کا منہ بند کر رہے ہو، اور جب تک تم اس روش پر قائم رہوگے خدا کی مدد شامل[2] رہے گی"۔ حذیفہؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کرینگے تو ہم بھی کرینگے اور اگر وہ ظلم کرین گے تو ہم بھی کرینگے، یہ نہین بلکہ اپنے کو پُرسکون اور مطمئن رکھو، لوگ تمھارے ساتھ بھلائی کرین تو بھلائی کرو، اور اگر برائی کرین تو بھی ظلم نہ کرو[3]"

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانون کو اپنی فریب کاریون، جھوٹے وعدون، خیانت کارانہ معاہدون، اور پُرفریب صلحون سے دھوکا دیا کرتے تھے، ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی ہدایت ہوئی،

---

[1] صحیح بخاری بحوالۂ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلہ صفحہ ۳۲۴ (غریب)

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ،

(مائدہ ۳-)

اور ان مین سے چند کے سوا اورون کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے، تو تو ان کو معاف کر، اور انکے قصور سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنے والون کو پسند کرتا ہے،

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور اُن کے قصورون سے درگذر کرنا، اسلام مین وہ نیکی ہے، جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والون کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس باب مین کس قدر اہم اور کامل ہے،

اسلام کی اخلاقی تعلیم
کا
تکمیلی کارنامہ

تمدّن کے زمانہ مین نظامِ حکومت مین جو ترقیان ہو جاتی ہین، اُن کی وجہ یہ نہین ہوتی کہ تمدّن اصولِ قانون مین کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدّنی نظامِ حکومت مین قانون کے نفاذ مین ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہین جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ مین صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے، اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہین کیجاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلّی استیصال کے لئے اسی قدر کافی نہین ہے بلکہ اس کا استیصال صرف اُس وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیئے جائین جو اس

جرم مین اعانت کرتے ہین، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہین، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہین، وغیرہ وغیرہ، بہرحال تمدنی نظامِ حکومت کو ایک غیرِ متمدن سلطنت پر جو ترجیح وامتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدُّن نے اس کے اصول وآئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے، اور وحشیانہ نظامِ حکومت مین یہ وسعت اور ہمہ گیری نہین پائی جاتی، تمدن کے زمانہ مین انسانی ضروریات مین جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے،

تفصیل اور ہمہ گیری

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے، اور جن اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ ومقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً اصولِ شریعت مین دنیا کے اکثر مذاہب مین اشتراک واتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد مین، اعمال مین، عبادات مین، معاملات مین، اخلاق مین، جو چیزین ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھین، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی، اور جو چیزین جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھین، اُن کی ترغیب دی، لیکن امر ونہی کے طریقے، اور ان کی جزئیات کے احاطہ مین کمی وبیشی ہے، اور اسی نے ان مذاہب کے احکام وشرائع مین باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیون کا تمام تر سدِّ باب ہوتا ہے، اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین

اخلاقی تعلیم وہ ہے، جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصار کیا ہو، اور عام انسانون کے لئے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو، اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجایش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اُس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیون کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیون کے مظاہر عام ہو گئے ہین، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے،

مثلاً توحید تمام مذاہب کا اُمّ الاصول ہے، لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اسکی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعین نہین کی، اس بنا پر ہر مذہب مین شرک کسی نہ کسی صورت مین شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی، اور ان کا کلّی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی، اور عرب کے تمام بُت توڑ دیئے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہین کیا، بلکہ ان تمام چیزون کو ناجائز قرار دیا، جو ان بتون کی یاد کو تازہ کر سکتی تھین، تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح مین غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم

کی بد اخلاقی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور اُن کے نفوذ و طاقت مین غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لئے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے امم قدیمہ مین شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی

لا تطروني كما اطرت النصارى	میری شان مین مبالغہ نہ کرو، جس
ابن مريم فانما انا عبده	طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان
فقولوا عبد الله ورسوله	مین کیا، مین تو خدا کا بندہ ہون، تو
(بخاری کتاب الانبیاء)	کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول.

یہ ایک کلی حکم تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رُکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤن کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا، اور کوئی بات سوال و جواب کے لئے باقی نہین رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہین، جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل، تین حیثیتون سے فرمائی ہے،

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ،

۲- ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ.

۳- نرمی وگرمی، عاجزی وبلند ہمتی دونون قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید،

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلّمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان مین سے کسی نے نہین کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے، اور ان مین سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم مین نمایان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ مین سب سے زیادہ اہمیت احکامِ عشرہ کی ہے، یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہِ سینا کے دامن مین سنائے گئے تھے، ان دس احکام مین سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت، اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہین، جو حسب ذیل ہین، (دیکھو خروج باب ۲۰)

تورات کے اخلاقی احکام

۱- تو اپنے مان اور باپ کو عزت دے،

۲- تو خون مت کر،

۳- تو زنا مت کر،

۴ - تو چوری مت کر،

۵ - تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے،

۶ - تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی، اور اس کے بیل، اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر،

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲ و ۲۳ مین قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتین اور آگئی ہین، یعنی مسافر، بیوہ، اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم، اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ مین انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے،

۱ - تم مین سے ہر شخص اپنی مان اور باپ سے ڈرتا رہے،

۲ - تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو،

۳ - تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ،

۴ - تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہجائے،

۵ - تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ،

۶ - تو حکومت مین بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر،

۷۔ تو عیب جوؤن کے مانند اپنی قوم مین آیا جایا نہ کر، او رنہ اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل مین نہ رکھ،

۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندون سے بدلہ مت لے، اور نہ اُن کی طرف سے کینہ رکھ،

۱۰۔ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو، اور بوڑھے مرد کو عزت دے،

۱۱۔ اگر کوئی مسافر تمھاری زمین پر تمھارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمھارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ جو تم مین پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپ کو کرتے ہو،

۱۲۔ تم حکومت کرنے مین، پیمایش کرنے مین، تولنے مین، ناپنے مین بے انصافی نہ کرو،

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہین کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہین کی ہے، حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنیٰ اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام مین نظر آتی ہے، اخلاق مین بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفون مین جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھین، اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یکجا اپنے مشہور وعظ مین ان کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ مین یہ ترتیب

حسب ذیل باتین بیان کی گئی ہین،

دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگذر، پاکدامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنون کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کرین، ایسا تم بھی اُن کے ساتھ کرو،

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظون کے ساتھ جو انجیل مین ہین، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفون مین مذکور ہین، اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا خاص طور سے اُن اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود اُن مین اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا،

اسلام مین اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہین، اسلئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اُس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہین رکھا گیا، بلکہ تمام قومون اور زمانون تک وسیع کیا گیا، اس لئے تمام قومون اور زمانون مین جو برائیان پائی جاتین یا پائی جانے والی تھین، ان سب کو استقصا کرکے منع کیا گیا، اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا، اور اُن کے حصول کی تاکید کی گئی، گذشتہ صحیفون مین جن برائیون سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیون کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وحیِ مبارک نے اُن کی تمام جزئیات کا استقصا کیا، اور اُن کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کردیا، ذیل مین ہم اُن اخلاقی

تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں، جن کی تعلیم یا ممانعت قرآنِ پاک نے کی ہے،

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علمِ بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگذر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکلِ حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا، اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی، اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت اس کے مال و جائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا،

بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھین نیچی رکھنا، کسی کے گھر مین بے اجازت
داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی بازپرس، نیکی
کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسرون کو
معاف کرنا، دشمنون سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظرون اور
مخالفون سے گفتگو مین آداب کا لحاظ، مشرکون کے بتون تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ
مین عدل و انصاف، دشمنون تک سے عدل و انصاف، صدقہ و خیرات کے
بعد لوگون پر احسان دھرنے کی برائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق و فجور سے نفرت،
چوری، ڈاکہ، رہزنی، اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت،
دل کا تقوٰی اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار مین وقار و متانت، مجالس
مین حسنِ اخلاق، ضعیفون، کمزورون، اور عورتون کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت،
بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغلخوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے
کی ممانعت، جسم و جان اور کپڑون کی پاکیزگی اور طہارت، شرمگاہون کی ستر پوشی،
سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا،
سب پر رحم کرنا، ریا اور نمایش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور
رشوت کی ممانعت، ثباتِ قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، لڑائی
کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا
کھیلنے کی ممانعت، بھوکون کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتون سے پرہیز

بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمایش، معاملات مین سچائی اور دیانتداری،

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہین، جنکا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اقوال مین ہو جو ان کی تفسیر و تشریح مین احادیث مین مذکور ہین، اُن کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال مین جو ہر قسم کی حدیثون کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۲۰۰ صفحون مین ہین، جنمین سے ہر صفحہ مین ۲۷ سطرین ہین، اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثین ہین جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات مین منقسم ہین، ان مین بعض مکرر باتین بھی ہین، تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا، جو داعیِ اسلام علیہ السلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو، اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہین، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد مین مذکور ہین،

صلۂ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹون کی محبت اور بڑون کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایون کے ساتھ سلوک،

غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل وعیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجتمندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرضداروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت، اور رحم، محسنوں کی شکر گذاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت وعیادت، رشک وحسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت وبہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومتِ عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم وحیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو ودرگذر، صبر وتحمل، حسب ونسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہونا، دوسرون کے گھر جاکر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لئے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق ونرمی، قناعت اور استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض وکینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع وخاکساری، امانت داری، گداگری کی ممانعت، منہ پر مدح وستایش کی ممانعت، کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر وغرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفسِ انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل وانصاف، تعصب

کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت، اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت، اور دو رُخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خواری، زناکاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تحیت، مصافحہ و معانقہ، دیگر آداب ملاقات آداب مجلس، آداب طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب سونے جاگنے کے آداب، عورتون کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اخلاق کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانون کو عطا کیا گیا ہے،

اخلاقی جزئیات کا استقصا

انسان بڑا بہانہ جو، اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے۔ اس کے لئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہین، کہ وہ لفظون کے ہیر پھیر کے سایہ مین پناہ لے، اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرلے، اسکے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بد اخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے، اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے، اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیون تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے

متعلق صریح احکام دیئے جائین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھاہے، اس کی توضیح کے لئے امر و نہی دونون کی ایک ایک دو دو مثالین کافی ہونگی،

صدقہ و خیرات تمام مذہبون مین ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیاہے، لیکن توراۃ نے اس کو صرف عُشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھاہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اُس مین نہین ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبون کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھاہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دونون کو یکجا کر دیاہے، اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی تفصیل کر دی، توراۃ مین یہ مبہم تھا، کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عُشر یا زکوٰۃ فرض، اور کن کن چیزون مین فرض ہے، شریعتِ محمدی نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی، وہ اجناس مقرر کر دیئے جن مین عُشر یا زکوٰۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، اُن کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتون کی تشریح کر دی، اس نے یہ حکم نہین دیا، کہ تم سب کچھ راہ خدا مین لٹا کر خود مفلس اور کنگال بنجاؤ، بلکہ یہ کہا،

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ، (بقرہ-۲۷)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہین کہ وہ کیا خرچ کریں، کہدے کہ جو تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی، کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھاکر، دوسرون کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمھارے

اکمالِ خلق کی دلیل ہے، انصارؓ جنھون نے خود تکلیفین اٹھا کر مہاجرینؓ کی مصیبتین دور کین، اُن کی تعریف مین خدا نے فرمایا،

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ	وہ دوسرون کو اپنے اوپر ترجیح
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر-۱)	دیتے ہین، اگرچہ خود اُنکو حاجت ہو،

صحابہؓ کی مدح مین فرمایا

يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ	خود کھانے کی خواہش کے باوجود
مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا،	مسکین، یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلا
(دھر-۱)	دیتے ہین

قرآنِ پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ مین خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے،

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ مین دوسرون کو دیتے ہین، جو سڑی گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآنِ پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجاے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دنارت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جبتک
مِمَّا تُحِبُّوْنَ، وَمَا تُنْفِقُوْا	اس مین سے تم نہ خرچ کرو، جو تم کو
مِنْ شَيْءٍ، فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ	محبوب ہے، اور جو بھی تم خرچ کرو
عَلِيْمٌ. (آل عمران-۱۰)	خدا کو اس کا علم ہے،

پھر فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا	اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو،
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ	اُن میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ	لئے زمین سے نکالتے ہیں اس میں
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ	سے کچھ خدا کی راہ میں دو، اور اس
تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ	میں سے خراب چیز دینے کا قصد
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ	بھی نہ کرو، کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ	تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو، اور
حَمِيْدٌ ، (بقرہ ۔ ۳۷)	یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور

ترجمان القرآن ج

اس آیتِ پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے" یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہتر حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے، کہ وہ تو ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے،

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل و عیال، دست نگر عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات
قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	کریں، کہدے جو کچھ تم نیکی کا مال
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ	خرچ کرو، وہ ماں باپ، رشتہ
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	دارون، یتیموں، مسکینوں اور مسافر
السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ	کے لئے، اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو،
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (البقرہ-۲۶)	اللہ اس سے واقف ہے،

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا، مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے، کچھ محتاجوں کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجتمند کی کوئی جسمانی خدمت کرے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے۔"[1] دوسرے موقع پر فرمایا "اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔"[2] غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے،

[1] الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ ص ۴۹ مصر [2] جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب صنائع المعروف،

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرکے اس کو یاد منت دلاؤ، نہ احسان اُس پر جتاؤ، نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمایش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی مین یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر-۱) — اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے

عام مسلمانون کو تاکید کی گئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، (بقرہ-۳۶) — اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھکر اور جتا کر برباد مت کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگون کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، اور خدا اور پچھلے دن پر یقین نہین رکھتا،

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے،

قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ، (البقرہ-۳۶) — اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اُس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے، اور خدا بے نیاز بردبار ہے۔

ریا اور نمایش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو، اور اگر لوگون کی تشویق و ترغیب مقصد ہو

تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا	اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا
هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا	ہے، اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ	وہ تمہارے لئے سب سے بہتر
وَیُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ	ہے، اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ،	کر دے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو
(بقرہ - ۳۷)	اللہ اس سے خبردار ہے،
اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	جو لوگ اپنا مال رات اور دن چھپے
بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ	اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے
عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ	تو ان کا ثواب ان کے رب کے
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ	پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ - ۳۸)	اور نہ غم،

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی خوشی ہونی چاہئے، جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے،

وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ	اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے
كٰرِهُوْنَ، (توبہ - ۷)	لیکن کڑھ کر،

صدقہ و خیرات پکے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے،

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ الآیہ (بقرہ ۳۶)

اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو،

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ، (بقرہ ۔ ۳۷)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر، اور جو خیرات کروگے وہ تم کو پوری ملے گی، تمھارا حق کچھ دبا نہ رہے گا،

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے،

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کرکے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کردیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف انہی تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں

رکھا جا سکتا، اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیۃً محفوظ نہین رہ سکتے، مثلاً ایک شخص شراب نہین پیتا، لیکن اُسکی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونون چیزون سے احتراز کرتا ہے، لیکن اُن برتنون کو استعمال مین لاتا ہے، جن مین شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہو کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصوّر بھی نہین کرسکتا،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، لعن اللہ الخمر وشاربھا وساقیھا، وبائعھا ومبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا، والمحمولۃ الیہ، (ابوداؤد کتاب الاشربہ)	آپ نے فرمایا، خدا شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اسکے اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اسکے لیجانے والے پر، اور اس شخص پر جسکے پاس وہ لے جائی جائے، لعنت بھیجے،

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگون کو روکتا ہو سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے، عرب مین شراب مختلف چیزون سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے، اور ان کا اثر بھی مختلف تھا، قرآن مجید مین حرمتِ شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس مین خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کی تعیین فرمادی،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعیر خمرا،	(ابوداؤد کتاب الاشربہ)	آپ نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہون سے بھی، اور جو سے بھی،
قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الخمر من العصیر والزبیب والتمر والحنطۃ والشعیر والذرۃ، وانی انھاکم عن کل مسکر، (ابوداؤد کتاب الاشربہ)		راوی کا بیان ہے کہ مین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہون، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے، اور مین تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہون،

عرب کے مختلف حصون مین انہی چیزون کی شراب بنتی تھی، اس لئے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا، اور یہ ممکن تھا، کہ دنیا کے اور حصون مین شراب کی دوسری قسمین استعمال کی جائین، اور تحدید اُن کو شامل نہ ہو، اس لئے آپ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی،

کل مسکر خمر وکل مسکر حرام [illegible]	ہر نشہ آور چیز شراب ہی، اور ہر نشہ آور
(ابوداؤد کتاب الاشربۃ وصحیح مسلم و احمد)	چیز حرام ہے،
کل شراب اسکر فھو حرام،	ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ
(ابوداؤد احمد و بخاری و مسلم)	حرام ہے،

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لئے فرمایا،

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام	جو چیز زیادہ مقدار مین نشہ لائے،
(ابوداؤد کتاب الاشربہ)	اسکی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے،

بعض چیزین ایسی ہوتی ہین جو نشہ نہین لاتین، تاہم اعصاب مین ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہین، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزین ہین، اور تمدن کے زمانہ مین مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہین، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی ممانعت فرمائی،

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشی
وسلم عن کل مسکر و مفتر، [illegible]	و مخدر چیز سے منع فرمایا،

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی نشی چیزین استعمال کرین، جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب مین اس قسم کی ایک مصنوعی

چیز تھی، جس کو داذی کہتے تھے، چنانچہ آپ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا،

یقول یشرب ناس من امتی	آپ نے فرمایا کہ میری امت میں
الخمر یسمونھا بغیر اسمھا	کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال
(ابوداؤد کتاب الاشربہ)	کریں گے،

ان کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں انکے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی،

نھی عن الدباء والحنتم	آپ نے کدو، سبز وسیاہ رنگ کے مرتبان،
والمزفت والنقیر،	اور کھجور کی جڑسے جس میں سوراخ
	کرکے شراب رکھی جاتی منع فرمایا،

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرمادیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنایا جائے، لیکن آپ نے اجازت نہ دی[1]،

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ، اس سرکہ کے جواز وعدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے،

ایک بار دیلم حمیری نے آپ کی خدمت مین عرض کی، کہ ہم سرد ملک مین رہتے ہین، اور سخت کام کرتے ہین، اس لئے گیہون کی شراب پیتے ہین کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپنے فرمایا، کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے، انھون نے کہا "ہان"۔ آپ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو، انھون نے کہا لیکن اور لوگ نہین چھوڑین گے، ارشاد ہوا کہ اگر نہ چھوڑین تو اُن سے جہاد کرو[1]۔

سود کی حرمت مین جزئیات کا احاطہ

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیون سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگون کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزون مین کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم مین لوگ کسی طرح بھی شریک ہون، اُن سب کو شریکِ جرم ٹھہرایا،

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے
اکل الربوا وموکلہ وشاھدہ	سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے
وکاتبہ (ابوداؤد کتاب البیوع)	والے، اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی

رشوت کی حرمت مین استقصا

لعن رسول اللہ صلی اللہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت
علیہ وسلم الراشی	دینے والے اور رشوت لینے والے
والمرتشی،	دونون پر لعنت بھیجی ہے،

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۰۰ کتاب الاشربہ،

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات مین بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا، اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہوجاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتین پیدا ہوجاتی ہین، اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت مین مبتلا ہوجاتا ہے، اس لئے جب تک ان تمام صورتون کو مٹا نہ دیا جائے اُس چیز کا کلیۃً قلع وقمع نہین ہوسکتا،

مسیحی اخلاق کی کمزوری

نرم وگرم اخلاق

مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا مین ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کردی تھی، کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم مین کردیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی وغیرہ، منفعل قوتون کو اخلاق کا درجہ دیا تھا، اور اس کے مقابل کی قوتون کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوشحالی کے لئے دونون قسم کی مناسب قوتون کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو ودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندون کے لئے ضروری سہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے، کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے،

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے، اور

اُن مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھرایا ہے، وہ اسی لئے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہین، جن سے لوگون مین عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس، اور خودداری کے جوہر پیدا نہین ہو سکتے وہ کہتا ہے :-

"مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائعِ انسانی کی تمام خود دارانہ قوتون کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ مسیحیت نے زبردست دماغون کا ستیاناس کر دیا ہے[1]"

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السّلام کے ۵۷۰ برس بعد اس نبیِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا جس نے مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیون کی تصحیح کر دی، اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہین گذری تھی، کہ محکومون نے حاکمون کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان مین سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہین کیا،

نفوس کا اختلاف استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہین ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی

[1] نٹشے از ایم اے مگے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے، باب سوم،

بیماریون کا علاج ہو، تمام انسانون کی اندرونی کیفیتین، اخلاقی استعدادین اور نفسانی قوتین یکسان نہین ہین، انسانون مین کمزور و پست ہمت بھی ہین اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہین اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہین اور بہادر بھی، بردبار بھی ہین اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہین اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہین اور فیاض بھی، ناامید بھی ہین اور پر اُمید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہین اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہین اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہین کہ سب کے لئے ایک دوا کبھی کارآمد نہین ہو سکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے، جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہون، اور ہر قسم کے مریضون کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو،

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھکر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتون مین مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ، اور بلند ارادہ کو دوسرون کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پُرامید کرے، اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے، کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ خدا سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسرون سے بے نیاز کر کے خدا سے مانگنے والا کر دے، وہ ذلیل و خوار کو خوددار، اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتون کو نشو و نما دے،

اور بری قوتون کا رُخ اچھے مقصدون کی طرف پھیر کر اُن کی برائی کو کم سے کم کردے،

قوتِ غضب اور قوتِ شہوت میں تعدیل

قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہین کہ انسان کے تمام اخلاق کی بُنیاد اس کی دو قوتون پر ہے، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر اُن کی مدافعت کی قوت کا، اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونون قوتون کی افراط و تفریط اور اعتدال اور اُن کے مختلف مراتب سے سیکڑون اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہین، اور ان مین سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو، اور عقل کے قابو مین ہو، تو اس کا نام شجاعت ہے، اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکرون مین جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبۂ حق، جد وجہد، سعی و محنت، جہاد، پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو تہور بن جاتی ہے، اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسرون کی تحقیر، ظلم، قتلِ نفس وغیرہ کی برائیان پیدا ہو جاتی ہین، اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے، تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دنائت کے قالب مین ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت مین جب کامل اعتدال ہوتا ہے، تو اس کو عفت کہتے ہین، یہی صفت مختلف سانچون مین ڈھل کر مختلف نامون سے پکاری جاتی ہے،

یعنی پاکدامنی، پرہیزگاری، جود وسخا، شرم وحیا، صبر وشکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل واولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس سے حرص وطمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہین،

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونون غضبی اور شہوی قوتون کا استیصال ہے، اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونون کو افراط وتفریط سے ہٹا کر اُن مین توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس یہ دونون قوتین بذاتہ بری ہین، اور اسلام کے نزدیک یہ دونون قوتین بجائے خود بری نہین ہین، بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع ومحل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہین ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کر کے "دشمن کو پیار کرو" اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس و غمگین بنکر زندگی گذار دو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنون کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو، اور خدائی دشمنون کے حق مین دعاے خیر کرو، کہ انھین ہدایت ملے، اور خدا کے حلال کئے ہوے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہین، اس نے وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ کہا ہے، وَالْفَاقِدِينَ الْغَيْظَ نہین،

مسیحی اخلاق کی کمزوریان

دنیا مین علم وہنر، خوشی ومسرت، ولولہ وانبساط، رونق وترقی، جد وجہد جو کچھ ہے،

وہ انہی دونون قوتون کی جلوہ آرائیان ہین، اگر یہ دونون قوتین یک قلم مٹ جائین، یا ان مین افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدمی دنیا مرجائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہون، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن و امان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ، اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایان ہون، قومون کی ترقی اور ملکون کا نظام درہم برہم ہو جائے، اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بنجائے جس مین حرکت و جنبش کا نام نہ رہے،

مسیحی اخلاقی تعلیم مین یہ نکتہ ملحوظ نہین رہا ہے، کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہین ہے، بلکہ بیجا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزین ہین اسی قدر وہ معائب بھی جو ان دونون قوتون کی تفریط اور کمی سے پیدا ہوجاتے ہین، مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنارت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی برے ہین، اسلام نے اپنے پیرؤن مین ان دونون قوتون کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اس نے جہان ان کو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (آپس مین رحمدل) اور اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (مومنون کے فرمانبردار) کی تعلیم دی، وہین اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (کافرون پر بھاری) اور اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (کافرون پر گران) بننے کی بھی تعلیم دی، اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرمانبردارون کے حصہ مین ہے، وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ، مسیحی

قومون کو اس وقت تک ترقی کا منھ دیکھنا نصیب نہین ہوا، جب تک اسلامی فلسفۂ
اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بنکر انھون نے فائدہ نہین اٹھایا، لیکی تاریخ اخلاق
یورپ کی دوسری جلد مین کہتا ہے،

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

"لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمامتر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے.......
اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزون و مناسب رہا، تاہم تمدّن
کی روز افزون ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدّن کے لئے
لازمی ہے کہ قوم مین خودداری ہو، اور حریت کے جذبات موجود ہون، اور
انکسار و تواضع اس کے دشمن ہین، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی
کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیون مین تو پھر بھی فی الجملہ
خودی و خودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی
کا مطمح نظر تھا، کسی طرح ترقی تمدّن کے حق مین مفید نہین پڑسکتا تھا، اور پھر بڑے
بڑے زاہدون مین تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہین، لیکن
عوام مین تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے،
اسی کو دیکھ کر متاخرین حکماے اخلاق نے بجاے انکسار کے خودی پر زیادہ
زور دیا، اور اس کے دو مظاہر ہین، ایک مردانگی، اور دوسرے خودداری،
انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک مین جو صاف گوئی، آزاد
خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ

کیتھولک علاقون مین نہین پائی جاتی، بلکہ اُن کے بجائے دنارت، پست ہمتی، کم ظرفی
بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہین، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر مین
سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیان ہین، اُن سے آخرالذکر یکسر خالی ہین۔ (فصل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق

لیکن اس کے بالمقابل معلم اسلام علیہ السّلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا
اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے، فرمایا،

انّ اللہ یحبّ معالی الامورَ	بیشک اللہ معالیِ امور کو پسند اور
ویبغض سفسافھا،	محقراتِ امور کو ناپسند کرتا ہے،

"معالیِ امور" سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام، اور محقّرات سے مراد چھوٹی
اور دنی باتین ہین، اس حدیث مین گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست
بننے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے، اور
دنارت کی چھوٹی چھوٹی باتون سے الگ رہے،

اسی کے ساتھ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب
مین اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے
ہین کہ آپ نے فرمایا،

المومن القوی خیرٌ واحبّ	کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان
الی اللہ من المومن	زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا
الضعیف وفی کلّ خیر	ہے، اور ہر ایک مین بھلائی ہے، اگر

احرص علی ما ینفعك واستعن	وہ چیز جو تجھے نفع دے، اسکی پوری خواہش
باللہ ولا تعجز وان اصابك	کر اور خدا سے مدد چاہ، اس راہ مین کمزوری
شئ فلا تقل لوانی فعلت	نہ دکھا، اور اگر تجھے اس مین کچھ تکلیف
کان کذا وکذا ولکن قل	پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ "اگر مین یون
قدر اللہ وما شاء	کرتا تو یون ہوتا" بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے
فعل فان لو تفتح عمل	مقدر کر دیا تھا، اور جو چاہا اس نے
الشیطان ،	کیا، کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا
(دیکھو مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ)	کاروبار کھولتا ہے.

تقدیر، توکل، صبر اور شکر: یہ حدیث اُن تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح مین تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے، اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن مین جلد چہارم مین، اور عباداتِ قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم مین کی جا چکی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ چارون تعلیمات اسی لئے ہین کہ مسلمانون مین حوصلہ مندی، پُر اُمیدی، استقلال اور ثباتِ قدم پیدا ہو، مسلمان مین سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہیے، اگر کام مین کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا، اور اگر ناکامی ہو تو دل مین یاس اور نا امیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ خدا کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا مین جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآنِ پاک کی ان آیتون کی تشریح ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(آل عمران - ۱۷)

جب تو پکا ارادہ کرے، پھر خدا پر بھروسہ کر، بیشک اللہ متوکلون کو پیار کرتا ہے۔ اگر خدا تمھاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہین، اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمھاری مدد کرسکتا ہے۔ خدا ہی پر ایمان والون کو بھروسہ کرنا چاہیے،

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ

(حدید - ۳)

کوئی معیبت نہین آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) مین درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے۔ یہ اس لئے تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو، اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہین کرتا،

ان آیتون سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر وشکر کی تعلیم اسلام مین پستی اور دنارت کے لئے نہین، بلکہ مسلمانون مین ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہوکر بڑی بڑی سلطنتون اور فوجون کا مقابلہ کیا، اور کامیاب رہے، اُن کو مشکلات مین خدا کے دوسرے برگزیدون کی یہ دعا سنائی گئی ،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ	اے ہمارے پروردگار ہم پر صبرو
ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	ثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤن
عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ،	کو مضبوط گاڑ، اور ہم کو کافرو لوگون
(بقرہ - ۳۳)	پر فتحیاب کر،

اور بتایا کہ مشکلات مین دوسرے پیغمبرون کے ساتھیون نے کیا کیا،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے نبی تھے کہ اُن کے ساتھ ہوکر
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا	بہت سے اللہ والون نے لڑائی
لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	لڑی، تو خدا کی راہ مین جو مشکل یا
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا	مصیبت پیش آئی، اس سے وہ سست
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ، وَ	نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے، اور
مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا	خدا ثابت رہنے والون کو پیار
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا	فرماتا ہے، اور ان کا کہنا نہ تھا بجز

فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ ۔
(آل عمران - ۱۵)

یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے
گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما ہمیشہ
اور ہمارے پاؤن مضبوط رکھ اور ہم کو کافرون پر

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا
وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ
لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔
(آل عمران - ۲۰)

اے وہ جو ایمان لائے، ثابت قدم رہو
اور دشمن کے مقابلہ مین ثابت قدم اور
بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو
تاکہ کامیاب ہو،

ان آیتون سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات مین صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے، یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے،

اپنے دشمنون کو پیار کرو مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زرّین اصول یہ ہے، کہ اپنے دشمنون کو پیار کرو، اس مین شک نہین کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینون کی آنکھین خیرہ ہو جاتی ہین، لیکن اہلِ معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے، یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسرون[1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی،

تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق مین دعاے خیر کر سکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہین کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہین،

اخلاقِ محمدیؐ نے اس کے بجاے وہ تعلیم دی، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے، اور اللہ کے بندون نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنون کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والون کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بد دعائین دین، اُن کو دُعا دو، جو تمھارا قصور کرین، اُن کو معاف کرو، اور جو تم پر ظلم کرین، اُن کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو! خدا کے لئے کھڑے
قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ	ہو جایا کرو، انصاف کے ساتھ گواہی
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ	بن کر، اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل
عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا	و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے،
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ	انصاف کرو، کہ انصاف کرنا پرہیزگاری
إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ	سے بہت نزدیک ہے، اور خدا سے
(مائدہ-۲)	ڈرو کہ اس کو تمھارے کامون کی خبر ہے،
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا	اور بھلائی اور برائی برابر نہین، برائی
السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ	کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعۃً وہ
فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ	جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی

عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝	ہے، رشتہ دار دوست کے مانند
وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ	ہو جائیگا، اور اس پر عمل کی توفیق انہی
صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا	کو ہوتی ہے، جو صبر کرتے ہیں اور
ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ، وَاِمَّا	انہی کو یہ سعادت ملتی ہی، جو بڑی
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ	قسمت والے ہیں، اور اگر شیطان
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ	تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو
هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (حٰمٓ السجدۃ-۵)	کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے،

۱- اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی او برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے،

۲- اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے، جو تمہارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرز عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بنجائے گا،

۳- دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا، اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اخلاق محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴- دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے، اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ

جو صحابہ مین بڑے مفسر ہین، اس آیت کی تفسیر مین کہتے ہین[1]،

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو غیظ و غضب کی حالت مین صبر کا، اور کسی کی برائی کرنے پر علم اور عفو و درگذر کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کرینگے، تو خدا اُن کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا، اور اُن کا دشمن بھی دوست کی طرح اُن کے آگے سر جھکا دے گا"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سُنکر چپ رہے، اُس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا "اے ابوبکر جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمھاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا[2]"

آپ نے فرمایا "صلۂ رحم یہ نہین ہے کہ صلۂ رحم کرنے والون کے ساتھ صلۂ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلۂ رحم کرو[3]" یعنی دوستون کے ساتھ دوستی کوئی بات نہین، بلکہ دشمنون کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے،

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی مین آکر عرض کی یا رسول اللہ مجھے وہ بات بتائیے، جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپ نے اس کو چند باتین بتائین

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۷۱، و ابن جریر جلد ۲۴ ص ۶۰ مصر [2] سنن ابی داود، کتاب الادب باب فی الانتصار [3] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۸۸۶،

منجملہ اُن کے فرمایا، "ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتون کی بارش کردو"۔[۱]

اسلام کی نظر مین کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہبی دشمن نہین ہوسکتا، لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانون کو اپنے ایسے دشمنون کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے،

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا	(اے پیغمبر) مسلمانون سے کہدے کہ
لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ	کہ ان کو جو خدا کے دنون پر یقین نہین
لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ	رکھتے، معاف کردیا کرین، تاکہ خدا ایسے
(جاثیہ - ۲)	لوگون کو اُن کے کرتوتون کا بدلہ دے

اگر عملی مثالین چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیون" اور "سانپون اور سانپون کے بچون"[۲] والی مسیحیت کے واعظ مین نہین بلکہ اسلام کے اُس اولین داعی و واعظ مین ہے، جس نے فاتح بنکر، مفتوح ہوکر نہین، حاکم ہوکر محکوم بنکر نہین، یکدفعہ مکہ کے ان ہزارون دشمنون کو معاف کردیا، جن مین سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا،[۳] جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اُس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکہ کا انتہائی انعام سُنکر اس کا تعاقب کیا تھا،[۴] جس نے خیبر مین اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا،[۵] جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا،[۶] جس نے حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت

---

[۱] مستدرک حاکم کتاب المکاتب، جلد ۲ صفحہ ۲۱۷، حیدرآباد دکن [۲] انجیل متی ۲۳-۲۵-۳۳ [۳] صحیح بخاری باب فتح مکہ [۴] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ [۵] صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی [۶] صحیح بخاری فتح طائف،

کرنے والی اور اُن کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا،[۱] جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا،[۲] جس نے تنعیم کی وادی مین قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا،[۳] جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک نخلستان مین جب وہ محو خواب تھا، اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو مین پاکر معاف کیا،[۴] جس نے اُن طائف والون کے حق مین دعائے خیر کی[۵] جنھون نے اس پر کبھی پتھرون کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤن خون آلودہ ہو گئے تھے، جس نے احد کے میدان مین اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والون کو نیک دعا دی،[۶] جس نے دشمنون کے حق مین بددُعا کرانے والون کو کہا کہ مین دنیا مین لعنت کے لئے نہین، بلکہ رحمت کے لئے آیا ہون،[۷] صلی اللہ علیہ وسلم، انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی نشان بتائی گئی،

اِلَّا الَّذِیْنَ عَاھَدْ تُّمْ مِّنَ	لیکن جن مشرکون سے تم نے عہد
الْمُشْرِکِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ	باندھا پھر انھون نے تم سے کچھ کم
شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاھِرُوْا عَلَیْکُمْ	نہ کیا، اور نہ تمھارے خلاف کسی
اَحَدًا، فَاَتِمُّوْا اِلَیْھِمْ	کی مدد کی، تو اُن کا عہد ان کی مدت

[۱] صحیح بخاری باب فتح مکہ [۲] کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ وہبار بن اسود [۳] جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح صفحہ ۵۳۰ [۴] صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۲۰۸ [۵] ابن سعد غزوہ طائف [۶] فتح الباری ج ۷ صفحہ ۲۰۶ مصر باب احد [۷] صحیح بخاری مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مشکوٰۃ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم،

عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ، — مقررتک پورا کرو، اللہ پرہیزگارون
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، (توبہ-۱) — کو دوست رکھتا ہے،

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے اُن احکام کو پیش کرتے ہین، جن مین مسلمانون کو کافرون اور مشرکون کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل علٰحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروون کو اس کے اُن مخالفون کے میل جول، راز داری اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کردینے کے درپے ہون، خصوصاً ایسے وقت مین جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششین ہو رہی ہون، اور طرفین مین لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہین پھیلا کر اس کے پیروون کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہون، چنانچہ اس قسم کی آیتین

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ
مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ
تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران ع ۳)

ایمان والے مسلمانون کو چھوڑ کر کافرون کو اپنا دوست نہ بنائین. تو جو ایسا کرےگا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہین، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا
اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ

اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیون کو اگر وہ ایمان کے برخلاف

اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيْمَانِ ط — کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست
وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَأُولٰئِكَ — نہ بناؤ، اور تم میں سے جو کوئی اُن سے
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ، — دوستی رکھیگا، تو وہی حد سے گذرنے
(توبہ - ۳) — والے ہون گے،

اسی موقع کی ہین، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہون تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرۃً اُن اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علحدگی ہوگی، جو اس حق کے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہون، اس حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہین جو "شہزادۂ امن" کے اس اعلان کے ہین،

"یہ مت سمجھو کہ مین زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہین، بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہون کیونکہ مین آیا ہون کہ مرد کو اُس کے باپ، اور بیٹے کو اس کی مان، اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کرون، آدمی کے دشمن اُس کے گھر کے لوگ ہون گے، جو کوئی باپ یا مان کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہین،" (متی کی انجیل باب ۱۰-۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق مین یہودیون کے ساتھ وہ نرمی، رحمدلی اور رقیق القلبی نہ تھی، جو دوسرے نادان بُت پرستون اور گنہگارون کے ساتھ تھی،

وہ یہودیون کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیون اور سرحدِ شام کے عیسائیون سے مسلمانون کی جنگ چھڑی، اور بظاہر مال و دولت، سازوسامان، اسلحہ اور مستحکم قلعون کے سبب سے اُن کا پلّہ مسلمانون سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے منافقون اور کمزور دلون کی عاقبت بینی اور دور اندیشی اُن کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنون سے ساز باز رکھین تاکہ ان کے مقابلہ مین اگر مسلمانون کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانون کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانون کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! یہودیون اور
الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰىٓ اَوْلِيَآءَ	نصرانیون کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ	مین ایک دوسرے کے رفیق
مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ	ہین، اور جو کوئی تم مین سے اُن سے
مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي	رفاقت کرے، وہ انھی مین ہے
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، فَتَرَى	اللہ بے انصاف لوگون کو راہ نہیں
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے جن
يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ	کے دل مین بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر

نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ
فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ
اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا
عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
نٰدِمِيْنَ ۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ
لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ
دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ
يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ،

(مائدہ - ۸)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا

ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ
ہمکو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے
تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح
یا (اُن کی کامیابی کی) کوئی اور بات
اپنے پاس سے بھیجے۔ تو پھر وہ اپنے
دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں،
اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں، جو
اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے
ساتھ ہیں، خراب گئے اُن کے عمل پھر رہ
گئے نقصان میں۔ اے ایمان والو!
اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا
تو خدا کا کچھ ہرج نہیں، اللہ اپنے دین کے
لئے اور دوسرے لوگوں کو لائیگا جن سے راضی
ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے
جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں
پر بھاری ہوں گے،

اے ایمان والو! اہل کتاب

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا	اور کفار میں سے اُن کو جو تمہارے
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں، اپنا
مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ	رفیق نہ بناؤ، اور خدا سے ڈرو، اگر
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ-۹)	یقین رکھتے ہو،

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ، اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل قرآن کی اس آیت میں ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا	اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی
بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا	نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں
يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا	کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے، اُن کو
عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ	خوشی ہے، دشمنی اُن کی زبان سے
مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ	نکلی پڑتی ہے، اور جو اُن کے جی
صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ	میں چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ
بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ	ہے، ہم نے تم کو باتیں جتا دیں، اگر
كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ، (آل عمران-۱۲)	تم کو عقل ہے،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے، اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے، جس کی روک تھام

کے لئے مسلمانون کو اُن کی رفاقت اور سازباز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح

سورہ ممتحنہ مین ہی، فرمایا،

یَآیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا	اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنون
عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ	کو دوست نہ بناؤ کہ تم اُن کو دوستی
تُلْقُوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّةِ	کا پیغام بھیجو، اور وہ اس سچائی کے جو
وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ	تم کو ملی، منکر ہین، وہ رسول کو اور تمکو
الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ	اس لئے گھر سے نکالتے ہین کہ تم اپنے
وَاِیَّاکُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ	پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر
رَبِّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ خَرَجْتُمْ	تم میری راہ مین لڑائی اور میری خوشنودی
جِھَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَابْتِغَآءَ	کی طلب مین نکلو، تو تم اُن کو دوستی
مَرْضَاتِیْ تُسِرُّوْنَ اِلَیْھِمْ	کے چھپے پیغام بھیجو، اور مجھے خوب معلوم
بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ	ہے، جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے
اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ط وَمَنْ	ہو، جو تم مین سے ایسا کرتا ہے، وہ
یَّفْعَلْهُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ	سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو
سَوَآءَ السَّبِیْلِ، اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ	تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو
یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّ	موقع سے پائین، تو تمھارے دشمن ہون
یَبْسُطُوْآ اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ	اور تمھاری تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے

وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا
لَوْ تَكْفُرُوْنَ، لَنْ تَنْفَعَكُمْ
اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ،
(ممتحنہ-۱)

ہاتھ بڑھائین اور برائی کے ساتھ اپنی
زبانین کھولین، اور چاہتے ہین کہ
تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ،
تم کو تمھاری قرابت اور تمھاری اولاد
قیامت کے دن نفع نہین پہنچائیگی،

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیے،

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ
لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ
وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا
اِلَيْهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُقْسِطِيْنَ، اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ
اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا
عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ
وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ

خدا تم کو ان لوگون کے ساتھ نیکی اور
انصاف کرنے سے باز نہین رکھتا
جو تم سے مذہب مین لڑائی نہین
کرتے، اور نہ تم کو تمھارے گھرون
سے نکالتے ہین، خدا انصاف والون
کو پیار کرتا ہے، وہ انھی سے دوستی
کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب
مین لڑائی لڑین، اور تم کو تمھارے
گھرون سے نکالین، اور تمھارے
نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار
نہین، جو ان سے دوستی کا دم بھریگا،

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (ممتحنہ ۲) تو وہی بے انصاف ہون گے،

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمھاری فتح ہوگی، اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائیگی، فرمایا،

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ امید ہے کہ اللہ تمھارے اور تمھارے

وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ دشمنون کے درمیان دوستی پیدا

مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ (ممتحنہ ۲) کردے، اور اللہ قدرت والا ہے

ان آیتون کا مطلب اُن کے شانِ نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انہی مین سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بیخبری مین مکہ پر قبضہ کرلینا چاہتے تھے، تیاریان ہو رہی تھین، کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کردیا، کہ قریش خبردار ہو جائین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی، آپؐ نے دو سوارون کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئین، وہ خط آیا تو آپؐ نے حاطب سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی یارسول اللہ جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ مین قریش مین رہتا ہون، لیکن اُن سے میرا کوئی نسبی تعلق نہین، اور جس قدر مہاجر ہین وہان اُن کی قرابتین اور رشتہ داریان ہین، جن کے سبب سے اُن کے خاندان کے لوگ محفوظ ہین، میری وہان کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے، تو مین نے چاہا کہ مین اُن پر یہ احسان کرون تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کرین، مین نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا

نہین کیا، آپ نے فرمایا تم بدر والے لوگ ہو، خدا نے تمھارے گناہ معاف کئے ہین، اس پر یہ آیت اتری، یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا، اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنون کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ احکام اسی قسم کے ہین جو عہد عتیق مین بھی مذکور ہین، زبور مین ہے،

"اے خدا تو یقیناً شریرون کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتین کرتے ہین، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہین، اے خداوند کیا مین ان کا کینہ نہین رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہین، کیا مین ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہین، بیزار نہین مین شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہون، مین انھین اپنے دشمنون مین گنتا ہون" (۱۳۹-۱۹-۲۲)

یشوع کے صحیفہ مین ہی،

"اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو، اور ان لوگون کے بقیہ سے لپٹو جو تمھارے درمیان باقی ہین، اور ان کے ساتھ نسبتین کرو، اور ان سے ملو، اور وہ تم سے ملین تو یقین جانو کہ خداوند تمھارا خدا پھران گروہون کو تمھارے سامنے سے دفع نہ کریگا بلکہ وہ تمھارے لئے پھندے اور دام اور تمھاری بغلون کے لئے کوڑے اور تمھاری آنکھون مین کانٹے ہون گے، یہان تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمھارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے، (یشوع باب ۲۳-۱۲)

ف صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ۔

قرآن پاک اور احادیث مین بعض احکام ایسے بھی ہین، جنمین منکرون، ظالمون، بدکارون اور گنہگارون سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے،

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ،
(نسآء - ١٢)

وہ چاہتے ہین کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انھون نے کفر کیا، توان مین سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہان تک کہ وہ خدا کی راہ مین ہجرت نہ اختیار کرین،

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِىْ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۚ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ
(انعام - ٨)

اور جب تو اُن کو دیکھے، کہ جو میری آیتون کی شان مین لغو بکتے ہین، تو اُن سے کنارہ کرے، یہان تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات مین لگ جائین، اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان گنہگار لوگون کے ساتھ نہ بیٹھ،

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا

اور تم پر کتاب مین یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتون سے انکار ہوتے، اوران پر ہنسی ہوتے، تو

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (نساء-۲۰)

اُن کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے،

یہ احکام اس لئے ہین تاکہ بُری صحبت کا برا اثر مسلمانون پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہین، جو سینٹ پال کے ان فقرون کے ہین،

"مین نے خط مین تم کو لکھا کہ حرام کارون مین مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کارون یا لالچیون یا لٹیرون یا بُت پرستون سے نہ ملو، نہین تو تمہین دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر مین نے اب تمہین یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار، یا لالچی، یا بت پرست، یا گالی دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض کہ تم اس بُرے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو، (اوّل قرنتون ۵)

اور تم بے ایمانون کے ساتھ نالائق جُوے مین مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی مین کونسا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی مین کونسا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتون سے کونسی موافقت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم اُن کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو، اور ناپاک کو مت چھوؤ، (۲ قرنتون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام

دنیاوی معاملات اور اخلاق مین مسلمانون کو اُن سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت مین بھی یہ حکم ہے،

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	اور اگر مشرکون مین سے کوئی تجھ سے
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ	پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے، یہان
كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ	تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے،
مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ	پھر اسکو تو اسکی امن کی جگہ تک پہنچا دے،
لَّا يَعْلَمُوْنَ۝ (توبہ-۱)	یہ اس لئے کہ وہ نادان لوگ ہین،

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآنِ پاک مین یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہون تو بھی انکی خدمت بجا لانا، اور دنیاوی معاملات مین انکے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا،

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ	اور اگر وہ دونون (والدین) اس پر
بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا	ضد کرین کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک
تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا	کر جس کا تجھے علم نہین، تو اُن کی بات
مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ	نہ مان، اور دنیا مین اُن کے ساتھ
اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	نیکی کا برتاؤ کر، اور اسکی راہ چل جو
فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (لقمان-۲)	میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری

[illegible]

مذہبی دشمنون کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہوسکتی ہو کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور اُن کے ساتھ نیک برتاؤ مین کوئی کوتاہی کیجائے

سختی کا جائز موقع

اس مین شک نہین کہ اسلام مین نہ صرف کفار بلکہ اُن کے ساتھ بھی جنکو قرآن کی اصطلاح مین "منافقین" کہتے ہین بعض موقعون پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانون کو لڑائی درپیش ہو، اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانون کے ساتھ آباد ہین، وہ دھوکے سے دشمنون کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلین، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانون کے اندر رہ کر ان کی جماعت مین تفرقہ پردازی کرین اور طرح طرح کے شبہون اور افواہون سے مسلمانون کی جمعیت مین پریشانی پیدا کرین، اس حالت مین ان کافرون اور منافقون کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کیجائے اور مسلمانون کو اُن کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑین تو بہادری کے ساتھ اُن سے لڑا جائے، یہان تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز آجائین، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتین سورۂ توبہ مین ہین،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے پیغمبر اُن کافرون اور منافقون
وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ	سے جہاد کر اور اُن پر سختی کر، اور اُنکی
وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ	جاے پناہ دوزخ ہے، اور وہ کتنی
الْمَصِيْرُ، يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ	بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی

مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ — قسم کھاتے ہین کہ انھون نے ایسا نہین

الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ — کہا، حالانکہ انھون نے یقیناً کفر کی بات

وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا وَمَا — کہی، اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر

نَقَمُوْا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ — کیا، اور اس بات کا قصد کیا تھا جسکو

وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنْ — وہ نہ پاسکے، اور انھون نے عیب نہین

يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ — کیا، لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول

يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ — نے اپنی مہربانی سے انکو دولتمند کردیا،

عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَ — تو اگر وہ باز آجائین توان کے لئے یہ بہت

الْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي — اچھا ہے، اور اگر وہ منہ پھیرین تو اللہ انکو

الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ — اس دنیا مین اور آخرت مین دردناک سزا

(توبہ - ۱۰) — دیگا، اور زمین مین نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار

یہ آیتین اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہین، اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتین ہین وہ اس کی وضاحت کرتی ہین، آیتین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ مین مسلمانون کو رومیون[1] کے مقابلہ مین اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا — اے ایمان والو! اُن کافرون سے

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۰ صفحہ ۴۶، مصر،

اَلَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ	لڑو جو تمھارے ہم سرحد ہین، اور
وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَۃً	چاہیئے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائین
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ	اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگارون
(توبہ-۱۶)	کے ساتھ ہے،

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانون کو کمزور سمجھ کر اُن پر حملہ کی نیّت نہ کرین،

تحریم اور ایلاء کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیت نبوی مین پھوٹ ڈال کر مسلمانون کی جماعت مین افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا،

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ	اے پیغمبر! اُن کافرون اور منافقون
وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ	سے جہاد کر اور اُن پر سختی کر اور اُن کا
وَمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ	ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بازگشت
الْمَصِیْرُ، (تحریم-۲)	کی کتنی بری جگہ ہے،

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہین، اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ مین وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہین جو اس انتظام و نظام کی بربادی مین کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے،

قرآن پاک مین ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی

بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدعا پر غلط استدلال کرسکتے ہیں، اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف اُن کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے،

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ	محمد خدا کے رسول اور جو اُن کیساتھ
مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ	ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری)
رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ،	ہیں، اور آپس میں مہرو محبت
(فتح - ۴)	رکھتے ہیں ۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں، کہ کفار اُن سے مرعوب ہیں، اور مقابلہ میں مسلمان اُن پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کرسکتے، اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی اُن پر غالب، اور اُن کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، اُن سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں، جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں،

اَذِلَّۃٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّۃٍ	فرمانبردار ہین مسلمانون کے، اور بھاری
عَلَى الْكَافِرِيْنَ، (مائدہ -۸)	ہین کافرون پر،

یہ محاورہ قرآن مین کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورۂ ہود مین ہے،

يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ	اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے
مِّنَ اللّٰهِ، (ہود -۸)	زیادہ بھاری (مضبوط) ہے،

دوسری آیت مین ہے،

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (توبہ ۱۶)	تمھاری تکلیف رسول پر گران ہے،

لسان العرب مین ہے،

ورجلٌ شديدٌ قويٌّ و	مرد شدید یعنی قوی اور اس کی جمع
الجمعُ اَشِدَّاءُ (جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ مصر)	اشداء ہے،

قرآن پاک مین اشَدُّ قُوَّۃً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيْتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتون مین استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی مین آیا ہے، دوسرے مشتقات مین بھی یہ معنی مراد لئے گئے ہین،

اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ، (طٰہٰ -۲)	اس سے میری کمر کو مضبوط کر،
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا	اور تمہارے اوپر سات مضبوط
(نبا)	آسمان بنائے،
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ، (ص ۲)	اور ہم نے اُن کی سلطنت مضبوط کی،

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، (قتال-۱) پھر مضبوط باندھو،

شَدِید کے مشترک معنی یہ ہین کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلہ مین مضبوط اور سخت رہے، اور یہی صحابہ کرام کی صفت تھی، انھون نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتون کی پروانہ کی، تکلیفون اور مزاحمتون کا پُرزور مقابلہ کیا، دشمنون کی تلوار کے نیچے سر رکھدیا، اُن کے نیزون کو سینون مین جگہ دی، اُن کے تیرون کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا، اور جس کی تصدیق کرچکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود اُن سے دبنے لگے، اور مسلمانون کی ایمانی قوت کا رُعب اُن پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (آل عمران وانفال) کہ مین ان کافرون کے دلون مین مسلمانون کا رعب بٹھا دونگا، وہ بالآخر پوری ہوئی، اور فرمایا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب وحشر-۱) اُن کے دلون مین مسلمانون کا رعب ڈالدیا،

مخالفون کے دلون مین اسی رعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے،

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ — اُن کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے،

مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ — اور گھوڑون کا باندھنا وہ تم تیار رکھو

تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ، (انفال-۸) — کہ اس سے دشمنون کو مرعوب کرو،

اس آیت کا یہ مطلب نہین کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمھارا ساز وسامان اور

جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانون پر فرض ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی غرض سے گھوڑون کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ مین باندھتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، وہ اس کے لئے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے، اس کے لئے پردہ پوش ہے، اور جو نمایش کے لئے باندھتا ہے وہ اس کے لئے عذاب ہے[1] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ مین نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفون کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدمِ موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیون کے ساتھ عدل و انصاف، اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیرون کو نہین روکا ہے،

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی،

یہان کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیون نہین کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہین، اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکین، اور تمام جدوجہد، انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہین، اگر انسان

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد،

کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرمجوشیاں سرد پڑ جائیں، اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بنجائے، اس لئے یہ نہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے، کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے، اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لئے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو، صلح و جنگ، دوستی و دشمنی، رضامندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لئے ہو، الحبُّ فی اللہِ والبغضُ فِی اللہِ،

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے، کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو

شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکون سے دوستی کرے گا، تو شریرون سے علیحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا، تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ مین صرف ایک دل ہے، اور ایک ہی دل مین ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونون کی محبت یکجا نہین ہوسکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ (احزاب-۱) — خدا نے کسی کے سینہ مین دو دل نہین بنائے،

ع سینہ مین کسی شخص کے دو دل نہین ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ مین ادا کیا ہے،

"کوئی آدمی دو آقاؤن کی خدمت نہین کرسکتا، اس لئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا، یا دوسرے سے دوستی، یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا تم خدا اور مال دونون کی خدمت نہین کرسکتے، (متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولون نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس[1] نے خدا اور آدمی، یعقوب[2] نے خدا اور دنیا، یوحنا[3] نے خدا اور دنیا کے برے کامون کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہین،

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ مین ہے کہ محبت اور عداوت دونون

[1] گلیتون کے نام ۱-۱۰ [2] یعقوب ۴-۴ [3] یوحنا ۲-۱۵،

صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے، اپنی ذات کے لئے نہیں، بیہقی کی شعب الایمان مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر سے پوچھا کہ "ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے" عرض کی "خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے" فرمایا یہ "کہ باہمی میل جول خدا میں ہو محبت بھی خدا ہی مین ہو اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی مین ہو" مسند احمد مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت کیا کہ "کونسی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے" کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا "تمام نیکیون مین سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا ہی کے لئے محبت اور خدا ہی کے لئے مخالفت ہو"۔[1]

اسلام مین کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں

خدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا نارضامندی کے یہ معنی ہین کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ مین کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو، اور اس کے سبب سے اس شخص سے علٰحدگی و بیزاری ہو، جس مین یہ صفتین پائی جاتی ہون، قرآنِ پاک کی ایک آیت ہے،

حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَ	خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور
زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّهَ	اس کو تمہارے دلون مین مزین کیا
اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ	اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے
وَالْعِصْیَانَ، (حجرات-۱)	نزدیک کمروہ بنایا،

[1] مشکوٰۃ کتاب الادب، باب الحب فی اللہ،

اس آیتِ پاک مین اللہ تعالیٰ نے خود مؤمن یا فاسق وعاصی کی ذات کو نہین بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق وفجور اور عصیان کو نفرت وکراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری وناراضمندی کا بنیادی سبب کافر ومنافق کا کفر ونفاق ہے، یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	تو اگر وہ کفر سے توبہ کرین، اور نماز
وَاٰتَوُا الزَّكٰوۃَ فَاِخْوَانُكُمْ	پڑھین اور زکوٰۃ دین تو وہ تمہارے
فِي الدِّيْنِ، (توبہ - ۲)	دینی بھائی ہین،

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعۃً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے، اور ناراضمندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیونکہ اسلام مین شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت وکراہت کا وجود نہین، نہ ہندوؤن کی طرح اس کی نظر مین کوئی قابلِ نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے، نہ چنڈال ہے، نہ یہودیون کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیون کی طرح کوئی پاک نژاد اور بد گہر کی تفریق ہے، اور نہ عیسائیون کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر وایمان، اور شرک وتوحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل وابولہب ہو سکتا ہے، اور ایک معمولی حبشی وعجمی، مومن وموحد ہو کر بلالؓ حبشی صہیبؓ رومی اور سلمانؓ فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمرؓ وہی سفیانؓ، وہی عکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانون کے

سخت ترین دشمن تھے، بیک نظر اُن کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے، اور مسلمان اُن کے فدائی بنگئے، اور سب آپس مین بھائی بھائی ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا،

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا، (آل عمران - ۱۱)

(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلون مین باہم الفت پیدا کردی، اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بنگئے،

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے، جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے، مبشر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے گنہگارون کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر-۶)

اے میرے وہ بندو جنھون نے گناہ کرکے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، خدا سب گناہون کو معاف کر سکتا ہے، وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہی،

آپ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ[1] گناہ سے توبہ کرنے والا

[1] ابن ماجہ باب ذکر التوبہ

لیسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو" یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گنہگارون کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور اُن کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضاے الٰہی کی بشارت سنائی ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم مین پکڑ آئے تو صحابہؓ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا "تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو، خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے"[1] اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گنہگار پر بد دعا نہ کی جائے ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھون نے خدمت نبوی مین حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی، اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ اُن کی درخواست رد کی، لوگون سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہین، سب نے کہا ایسا تو نہین ہے، اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان مین کھڑے کئے گئے، اور اُن پر لوگون نے ہر طرف سے سنگ باری کی، اور اسی حال مین انھون نے جان دی صحابہ مین بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعزؓ کو برا کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا "ماعزؓ کے لئے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود مع فتح الباری شرح حدیث مذکور

وہ کسی پوری قوم مین بانٹی جائے تو اس مین سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔[۱]

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا، اور سزا کی درخواست کی آپنے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا، وہ اس کے بعد آئی، فرمایا بچہ کی پرورش کرلو، جب بچہ دودھ چھوڑدے تب آنا، وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی، اور اب بھی اس کے احساسِ گناہ کا جذبہ کم نہین ہوا تھا، آپنے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹین اڑکر حضرت خالدؓ بن ولید کے منہ پر پڑین، انھون نے عورت کو برا کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ مین میری جان ہے، اس نے وہ توبہ کی ہے، کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا"۔[۲]

ترکِ ہوی — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے، کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اسکی غرض وغایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے، اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے تو وہ نیکی نہین، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآنِ پاک مین ھوٰی ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال واعمال واخلاق کو ہوی سے پاک رکھے، کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے، جس کے لئے وہ کام کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے ان لوگون کو جو دینِ حق کے پیرو نہین اور اپنے کامون کی بنیاد اخلاص پر

[۱] و [۲] یہ دونون واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود مین ہین،

نہین رکھتے، یہ کہا کہ اُن کا دین و مذہب اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے، اور اُن کے سینون کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہش و ہویٰ کے بت چھپے ہین، قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتون مین متنبہ کیا،

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ، (جاثیہ -۳)	اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے

اسی لئے نفس کے تزکیہ و صفائی، اور روح کی بلندی و پاکی کے لئے شریعتِ محمدیؐ نے ترکِ ہویٰ کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہوجائے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہوجائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہر یگی، اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا، اسی لئے اسلام کی تعلیم مین ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہین، بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے، وحیِ محمدی نے فرمایا،

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ، (قصص -۵)	اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی،

پھر فرمایا،

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ	اور خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کر کہ

عَنْ سَبِیْلِ اللہِ (ص-۲) وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیگی،

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ہوی کے زہر قاتل سے مرجاتی ہے، فرمایا،

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰی اَنْ تَعْدِلُوْا (نساء-۲۰) عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو

ہوائے نفسانی تمام برائیون اور بدیون کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا، وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہی۔ فرمایا،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ	اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے
وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی	سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس
فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی،	کو بری خواہش سے روکا تو بیشک
(نازعات-۲)	جنت ہی اسکے امن سے رہنے کی جگہ،

اخلاق اور محبت الٰہی دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت الٰہی ہے، خالق کردگار کی محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعون سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان مین دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے، عقائد کے باب مین محبت الٰہی کے زیر عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل مین بھی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے، اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف

قرآن نے دیا ہے، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعیٔ خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا،

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ	کہدو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو
فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ،	میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت
(اٰل عمران - ۴)	کرے گا،

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنام اُس نے بتایا ہو کہ خدا کی محبت کے مستحق و سزاوار کون کون ہیں، اور اس دولت سے محروم کون ہیں، اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کاموں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق بھی ہے اور اُن امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے،

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں،

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ (اٰل عمران - ۷)	اور خدا ایمان والوں کا دوست ہے
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (بقرہ ۲۴ و مائدہ ۳)	خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (بقرہ - ۲۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ (اٰل عمران - ۱۷)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (مائدہ ۶ حجرات ۱)	خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ، (توبہ-۱)	خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ، (آل عمران-۱۵)	اور خدا صبر کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ، (توبہ ۱۳)	اور خدا پاک صاف رہنے والون کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ	خدا اُن کو پیار کرتا ہے، جو اس کی راہ
فِیْ سَبِیْلِہٖ، (صف-۱)	مین لڑتے ہین،

ان آیاتِ پاک مین نو باتین ایسی بیان کی گئی ہین جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہین، ایمان، احسان، توبہ، توکّل انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد، حسب ذیل صفتین وہ ہین جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہین،

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ، (آل عمران ۴)	تو خدا کافرون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ، (بقرہ ۲۴ و مائدہ ۱۲)	خدا حد سے بڑھنے والون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ	خدا اس کو پیار نہین کرتا، جو اترانے والا
مُخْتَالًا فَخُوْرًا، (نساء-۶)	اور شیخی مارنے والا ہو،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ	خدا اس کو پیار نہین کرتا جو خیانت کار
خَوَّانًا اَثِیْمًا، (نساء-۱۶)	گنہگار ہو،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ، (انفال)	خدا خیانت کرنے والون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ	خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار
کَفُوْرٍ، (حج-۵)	نہین کرتا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ، (قصص) — خدا اترانے والون کو پیار نہین کرتا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ، (قصص) — خدا فساد کرنے والون کو پیار نہین کرتا،

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ، (انعام-۱۷) — خدا فضول خرچ لوگون کو پیار نہین کرتا،

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ ، (نحل ۳) — خدا مغرورون کو پیار نہین کرتا،

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ، (شوریٰ ۴) — خدا ظالمون کو پیار نہین کرتا،

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ ، (بقرہ ۳۸) — خدا ناشکر گنہگارون کو پیار نہین کرتا،

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے مین حد سے آگے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیان ہین، جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہین ۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہو گا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب مین محبت الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے،

تعلیمِ اخلاق

کے

طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی، یعنی لوگون کو سکھانا اور بتانا، اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتون کا پابند اور بری باتون سے روک کر آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لئے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی، کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۔ (بقرہ ۔ ۱۵)

وہ (رسول) اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا اور پاک و صاف کرتا ہے

اور اسی لئے حدیث مین آیا ہے کہ

وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ابن ماجہ، فضل العلماء)

اور مین تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہون،

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقون سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا،

ایک کامیاب معلم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس مین اپنے اپنے موقع پر

سختی اور نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے، اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو، جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے، اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے، اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے[1]، قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم میں پکڑی گئیں، بعض مسلمانوں نے اُن کی سفارش کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب اُن میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتی تھیں، اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے[2]،

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی، تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اُس کو مارنے کو دوڑے، آپ نے

---

[1] صحیح بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [2] صحیح بخاری کتاب الحدود

روکا، اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہین بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہین، یہ نجاست کے لئے موزون نہین، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہین، پھر لوگون سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو[1]

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان مین بحالتِ روزہ ایک غلطی ہو گئی، اس نے لوگون سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو، انھون نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہین، فرمایا دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی مین تو یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلا دو، عرض کی ہم تو خود کنگال ہین، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلاؤ، اور جو بچے وہ تم اور تمھارے گھر والے کھائین، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ مین آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے، اور حضورؐ نے کتنی نرمی کی،[2]

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہان حدود الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہان نرمی نہین برتی جاتی تھی، لیکن جن امور مین وسعت ہوتی یا جہان مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول،
[2] ابو داؤد باب فی الظہار،

نرمی سے سمجھا دیتے، اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے، ع

قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے، کہین کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بتا کر، کہین اچھی اچھی مؤثر تشبیہون کے ذریعہ، کہین اس کے اچھے یا برے نتیجون کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے،

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم مین کہین فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ	بیشک اللہ عدل، اور احسان کرنے اور
وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ	رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بےحیائی
ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ	کی بات، اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ	سے منع کرتا ہے، تمھین وہ نصیحت فرماتا ہے
وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (نحل ۱۳)	تاکہ تم نصیحت پکڑو،

یہان اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے، اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور اُن سے بچو، تمام انسانون کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہین، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کرین، اس تعمیل مین بندون کے چون و چرا کی گنجایش نہین،

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہون کے ساتھ، اور رذائل کو

قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ کمثل حبۃ (بقرہ۔۳۶) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے، اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے،

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے، اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن نے اس کو یوں ادا کیا، کمثل صفوان (بقرہ) اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہ گئی، اور چٹان دھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ "جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں" (نساء۔۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی، "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے" (حجرات۔۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے، "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے" اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہو سکتی ہے؟

قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا، اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آکر عدالتِ نبویؐ مین اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضورؐ نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کئے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ "اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اُس نے اپنے آپ کو نہین چھوڑا، اور کتّے کی طرح سنگسار کیا گیا" حضورؐ یہ سُنکر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے، کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ نے پکارا کہ فلان صاحب کہان ہین، انھون نے کہا ہم یہ ہین یا رسول اللہ! فرمایا تم اُترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ" انھون نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا، فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق مین جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات ہے"[1]

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کامون کے اچھے اور برے کامون کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار، اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجون کو قرآن مین بوضاحت بیان کیا

"مسلمانو! شراب، جوا، اور پانسے کے تیر ناپاک ہین، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس مین عداوت اور دشمنی بڑھے، اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز

[1] سنن ابی داؤد کتاب الحدود ۱۲

سے غافل رکھے" (مائدہ ۱۲) شراب اور جوے کے برے نتیجے یہ ہین کہ اُن کا خاتمہ اکثر کھیلنے والون کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے، اور انسان ان مین پھنسکر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہوجاتا ہے، نتیجہ جانی ومالی بربادی ہوتی ہے،

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن مین اور رذائل کو شیطان کے خصائص مین داخل کرتا ہے، جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یون فرمایا،

إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ	اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو
أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ	چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کردو تو اللہ
كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ۔ (نساء - ۲۱)	ہے معاف کرنے والا قدرت والا"

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندون سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اسکا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے، اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہان بیان کیا ہے؛[1]

حدیث مین ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہون، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا نہین،

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ، ج ۳ صفحہ ۳۰۵،

ان اللہ جمیل یحب الجمال (صحیح مسلم و ترمذی) اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے

اس لئے بندون کو بھی چاہئے کہ اپنے طور و طریق و لباس مین سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھین،

مسلمانون مین عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اُنکو قرآن نے اس طرح کہا،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ تمھارے لئے اللہ کے رسول مین پیروی

اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، (احزاب ۳) کا اچھا نمونہ ہے،

حق کے مقابلہ مین ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت

ابراہیمؑ کے نمونہ سے دی گئی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمھارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیون

فِي اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (ممتحنہ-۱) مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے،

ان دونون آیتون مین اخلاق کی بعض صفتون کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کرکے

اس کی بڑائی ظاہر کی ہے، اور اُن کی پیروی کی ترغیب دی ہے،

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانون کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یون

ذہن نشین کرایا،

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا بے شبہہ فضول خرچ شیطانون

اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (بنی اسرائیل ۳) کے بھائی ہین،

اب کون ہے جو شیطانون کا بھائی ہونا پسند کرے گا،

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبون سے اسلام نے اخلاقی

فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی، جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی، جابر بن سلیمؓ ایک صحابی دربارِ نبوت مین اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہین، کہ مین نے دیکھا کہ مجلس مین ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجا لاتے ہین، مین نے پوچھا یہ کون ہے، لوگون نے کہا یہ اللہ کے رسول ہین، یہ سُن کر مین نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپ پر سلام (علیک السلام) آپ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، مین نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہین؟ فرمایا ہان مین اُس اللہ کا رسول ہون جس کو تم تکلیف مین پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے، اور جس سے خشک سالی مین مانگتے ہو تو وہ اُگا دیتا ہے، اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر مین ہو، تمھاری سواری وہان گم ہو جائے تم دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمھارے پاس لوٹا دیتا ہے، مین نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا، کسی کو برا نہ کہو، جابرؓ کہتے ہیں کہ آپ کے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ مین نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہان تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہین کہا، آپؐ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کئے جاؤ، اور تم کو چاہئے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمھارا چہرہ کِھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے، اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہین تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے[1] اور اللہ غرور کو پسند نہین فرماتا، اور

[1] عرب امراء فخر و غرور کیلئے ایسا کرتے تھے، جیسے عبا کے دامن یا کرتہ کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا، دوسری قومون مین شاہانہ غرور کی نشانی تھی۔

اگر تمہین کوئی گالی دے، اور تم مین جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اس کی عار دلائے، تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ، کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا۔[1]

اس طریقہ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے کہ آپ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی مین خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہون گے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھکر نسخہ تجویز کرے، یہ نہین کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پوچھنے والون کے جواب مین ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتین بتائین، حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیرین بتائین،

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر، اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا، آپنے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر،[2] اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص مین غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیان ہو جاتی ہونگی، اس لئے آپنے اس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ بادی النظر

---

[1] سنن ابی داؤد، باب فی اسبال الازار [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب،

مین معمولی سمجھا، اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو،

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کامون مین بہتر کام کیا ہے، فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ مین جہاد کرنا، پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر مین زیادہ پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کامون مین سے کچھ نہ کر سکون؟ فرمایا تو کسی بیکس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو، پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے، فرمایا کہ شر سے لوگون کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو،

(ادب المفرد بخاری صفحہ ۵۴ مصر)

کبھی آپ یہ کرتے کہ لوگون سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو اُن کے دل مین اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہؓ سے آپ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگون نے عرض کی ہم مین مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری امت مین مفلس وہ ہے جو قیامت مین گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیان لے کر آئے گا، لیکن اس نے اس کو گالی دی ہو گی، اس پر تہمت لگائی ہو گی، اس کا مال کھا گیا ہو گا، اس کا خون بہایا ہو گا، اس کو مارا ہو گا، تو اُس کی نیکیون مین سے کچھ کچھ ان لوگون کو دے دیا جائیگا، اگر اس کی نیکیان ختم ہو گئین، اور اس کے ذمہ لوگون کا کچھ باقی رہ گیا، تو ان کی برائیان

اس کے نام لکھدیجائینگی، پھر وہ جہنم مین ڈال دیا جائیگا،[1]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے،

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو، لوگون نے کہا جس کو لوگ کشتی مین پچھاڑ نہ سکین، فرمایا نہین یہ پہلوان نہین ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ مین اپنے نفس پر قابو رکھے،[2]

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہون، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو، صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہین، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہین بھیجی،[3] (احادیث مین ہے کہ جو بچے کمسنی مین مرجائین اور اُن کے والدین صبر کرین تو وہ قیامت مین اُن کی شفاعت کرینگے) اس طریقۂ ادا نے کس خوبی سے یہ دل مین بٹھادیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہین، بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت مین درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی،

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور دریافت فرمایا کہ کیا مین تمھین بتاؤن کہ تم مین سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہون کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگون کے نام لینے لگے) آپ نے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا ہان، یارسول اللہ فرمائیے، ارشاد ہوا تم مین سب سے اچھا وہی جس سے اچھائی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر باب تحریم الظلم [2] ایضاً باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب [3] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔

کی اُمید کی جائے، اور جس کی برائی سے لوگ امن مین ہون، اور تم مین سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے، اور جس کی برائی سے کوئی امن مین نہ ہو[۱]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے کون یہ باتین سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے، اور دوسرون کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کرین" ابوہریرہؓ نے کہا مین اے اللہ کے رسول، ابوہریرہؓ کہتے ہین کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتین گن کر فرمائین، گناہون سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولتمند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگون کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے، اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[۲] (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے اپنے دو جبڑون اور دونون پاؤن کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے مین اُسکے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون[۳] کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اٹھے ہون گے، ان فقرون کی بلاغت پر غور کرو، دونون جبڑون کے بیچ مین زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیون کی جڑ ہے، اور دونون پاؤن کے بیچ مین انسان کی شرمگاہین ہین، جو ہر قسم کی بیحیائیون اور بدکاریون کی جگہ ہین، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیون کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے،

---

[۱] ترمذی اواخر کتاب الفتن صحیح [۲] جامع ترمذی ابواب الزہد [۳] صحیح بخاری باب حفظ اللسان،

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے،[۱] میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپ کے غلام ثوبان رضی اللہ عنہ نے اٹھکر کہا میں اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو، چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا،

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے، حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا، لوگو! آج کون دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر پوچھا یہ کون مہینہ ہے، پھر سب چپ رہے، سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائینگے فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے، پھر سب خاموش رہے، کہ آپ کوئی اور نام بتائینگے، فرمایا کہ کیا یہ بلد الحرام نہیں ہے، سب نے کہا جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن، اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا، مسلمانوں کا خون، مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمھارے لئے ایسی ہی محترم ہے، جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں[۲]،

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھکر خاص خاص طور کی نصیحتیں

---

[۱] مسند احمد ج ۵ صفحہ ۲۷۵ [۲] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ،

فرماتے حضرت ابوذر غفاریؓ گو یا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر اُن سے فرمایا! اے ابوذر، جہان رہو خدا سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اُس کو مٹا ڈالوگے، اور لوگون کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو[1]،

لوگ عام طور سے سمجھتے ہین کہ صدقہ اللہ کی راہ مین صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگون کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تمھارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول مین پانی اونڈیل دینا بھی صدقہ ہے[2]،

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانون کے دلون مین تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیون کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ ادا سے ان نیکیون کی کتنی اہمیت مسلمانون کے دلون مین بٹھا دی،

کبھی آپ مسلمانون سے مختلف اخلاقی باتون پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآنِ پاک مین ہے کہ جو عورتین ایمان لانا چاہین وہ بیعت مین رسول سے ان باتون کا عہد کرین کہ وہ چوری نہ کرینگی، بدکاری نہ کرینگی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالینگی بہتان نہ باندھا کرینگی، اور کسی بھلے کام مین رسول کی نافرمانی نہ کرینگی (سورۂ ممتحنہ ۲)

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی معاشرۃ الناس [2] ترمذی فی صنائع المعروف،

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ "ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے، اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے، اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرینگے"[1]

یہی عبادہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے، اور ان میں چند آدمیوں کو چنکر آپ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی "ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کرینگے، اور نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملیگی، اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے"[2] اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے، سوال سنکر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں، خود ہی جواب دیدیتے تھے، دریافت فرمایا کہ افترا کس کو کہتے ہیں، پھر خود ہی فرمایا "وہ چغلی ہے، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا"[3] ایک بار ارشاد ہوا کہ "تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں" لوگوں نے

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۵ صفحہ ۳۱۸ [2] صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۱۱ کتاب الدیات [3] صحیح مسلم باب تحریم النمیمۃ

جواب دیا اللہ اور اُس کا رسول جانتا ہے" فرمایا تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو" کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان[۱] ہے، ایک موقع پر ارشاد ہوا، میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اس کی قسم پوری کر دے، پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور[۲]۔

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اُس کو بار بار دہراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اُس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے، اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جسکا اثر دل کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا "خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا" صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یا رسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہو[۳]، ایک دفعہ ارشاد فرمایا، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کس کے ساتھ، فرمایا اللہ کیساتھ، اسکی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کیساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کیساتھ اور عام مسلمانوں[۴] کیساتھ"۔

۱؎ ابوداؤد باب تحریم الغیبۃ، ۲؎ ابوداؤد باب ...، ۳؎ مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین، ۴؎ ابوداؤد و صحیح مسلم

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصولِ اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے، کہ ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملین، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصون مین تقسیم کر دیا ہے، حقوق، فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانون بلکہ حیوانون اور بے جان چیزون تک کے کچھ فرائض عائد ہین، اور یہ اُن کے حقوق ہین، جنھین ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہین،

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اسکا نام فضائلِ اخلاق، اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے، مثلاً سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل مین سے ہے،

تیسری قسم، کامون کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجا لانا ہے، اس کو آداب کہتے ہین، مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور طریق،

ذیل مین اسلامی اخلاق کی ان تینون قسمون کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے،

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی | حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی، لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کردی جائے، قرآن پاک مین اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ	خدا نے تمہارے (کام کے) لئے
جَمِيعًا، (بقرہ - ۳)	زمین کی ساری چیزین پیدا کین،

اس لئے انسان کو دنیا کی ہر اُس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گو نہ لگاؤ ہے، اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت مین کوشش کی جائے، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے، اوران موقعون پر اس کو صرف کیا جائے جن مین خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے، اور اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام حق ہے، جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد ہوا۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ	اور ان کے مالون مین سائل کا، ور
وَالْمَحْرُومِ، (ذاریات - ۱)	اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو،

وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور
حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَ	اس کا مقررہ حق ہو جس پر آفت
الْمَحْرُوْمِ، (معارج-۱)	پڑی ہو،
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ	اور قرابت والے کو اس کا حق دے
وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (بنی اسرائیل)	اور مسکین کو اور مسافر کو،
فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ	تو قرابت والے کو اس کا حق دے
الْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ، (روم)	اور مسکین کو اور مسافر کو،

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اُس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے تھوڑا دیا جائے، یہ اُن کا حق ہے، اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے،

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ	اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے
وَلَا تُسْرِفُوْا، (انعام-۱۷)	کے دن ادا کرو، اور فضولخرچی نہ کرو

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا، اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی، اور پھل پھول نکلے، اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے، اور اس میں اُن کو بھی کچھ دے، جن کو یہ نعمت نہیں ملی۔ اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کر کے ضائع نہ کرے کہ یہ

بھی اس کے حق کے منافی ہے، اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچانا ہے،

حدیث مین آتا ہے،

ان لزوجک علیک حقًا و	تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق، اور تیرے
لزورک علیک حقًا، (بخاری صوم)	ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے،
ولاھلک علیک حقًا (" ")	تیری بیوی بچون کا تجھ پر حق ہے،

ایک اور حدیث مین آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اُس کو کھانا کھلائے کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے" (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہین، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اُس کے اوپر حق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

فان لنفسک علیک حقا (بخاری صوم)	بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے،
فان بجسدک علیک حقًا و	تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، اور
لعینیک علیک حقًا (" ")	تیری آنکھون کا بھی تجھ پر حق ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے،

حقوق کی وسعت | جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے، تو

ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اُس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ اُن کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ اُن کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اُن کے آرام و آسایش کا خیال کیا جائے، اور انسانون سے بھی کہ اُن کی ہر ضرورت مین مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے،

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات مین اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے، انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہین، لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزون کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لئے مفید ہے،

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزون کے دو حق انسان پر ہین، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہین ان سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما، پرورش اور ترقی مین وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے، اور اس کے مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونون حقوق اصل مین قرآن پاک کی اسی حقیقت کے

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ — زمین مین جو کچھ ہے وہ خدا نے تمھارے

جَمِيعًا، (بقرہ ع-۳) (یعنی انسانون کے) لئے پیدا کیا،

کے صریح نتیجے ہین، کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزین پیدا ہوئین، تو انسان کا فرض ہے کہ اُن سے وہی کام لے جس کے لئے وہ بنائی گئین، اور اس لئے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانون کو اپنا نفع پہنچا سکین، اُن کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے مجمع مین ایک تمثیلی حکایت مین اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ "ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا، کہ دفعۃً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ مین تو اس کے لئے پیدا نہین کیا گیا، مین تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہون[1]" اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہین، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]" اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]" ایک اور تمثیلی حکایت مین آپ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی، اور ایک اور شخص پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہین دیا یہانتک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ایک اور شخص نے

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعۃ جلد اول صفحہ ۳۱۲ [2] صحیح بخاری و مسلم باب مذکور [3] فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکور، جلد خامس صفحہ ۷، مصر،

چیونٹی کو جلادیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی[1]،

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہین، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانون تک نہین بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزون تک پھیلا ہوا ہے، جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی،

حقوق کی ترتیب مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی مین اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل مین ہے،

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہین تو توراۃ و انجیل کی طرح مختصر یون کہہ سکتے ہین کہ دوسرون سے محبت کرنا لیکن صرف "محبت کرنا" کہدینا کافی نہین، بلکہ ان چیزون کی تفصیل کرنی چاہئے جو اس محبت کا تقاضا اور اُس کے مظاہر ہین، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ نے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لئے رکھتے ہو[2]" اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لئے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسرون کے لئے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سر عنوان ہے، لیکن اسلام مین یہ سر عنوان تشریح کا محتاج ہے، اور اس تشریح کے ضمن مین انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے، جس کو اسلام

[1] یہ دونون واقعے صحیح بخاری مین ہین [2] صحیحین کتاب الایمان،

نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے، اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے، مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ مین ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ مین ایک دوست کی، غیرون اور بیگانون کے مقابلہ مین ایک عزیز کی، اور ان عزیزون مین بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اُس کے مقابلہ مین اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح مین عصبیت (تعصب) ہے، جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کیگئی ہے،[1]

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مین انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہین ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خطِ فاصل نہین قائم کیا گیا ہے، مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات مین انسان اور حیوان سب کے، اور پھر انسانون مین اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہین، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس مین کوئی دفعہ نظر نہین آتی، اسی طرح ہندو قانون مین ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے، اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی مان کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت مین تمام قرابتدارون کو چھوڑ کر صرف مان باپ

[1] سنن ابی داود ج ۲ باب فی العصبیۃ،

کا ذکر کیا گیا ہے، اور اُن کے برترانہ حقِ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندون اور رشتہ دارون کو ان مین کوئی مرتبہ نہین دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ مین پوری تفصیل سے کام لیا ہے،

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب مین جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص جو ایک وقت مین ایک ہی کی مدد کرسکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار مان ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت مین اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے، اور اسی حالت مین اس کا کوئی ہموطن بھی ہے، تو اسکو کس کی امداد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس مین تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے مان کے ہین، پھر باپ کے ہین، پھر بھائی کے ہین، پھر پڑوسی کے ہین، پھر ہموطن کے ہین، اور اسی ترتیب سے اُن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار مان کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہوجائے، یہ ایثار نہین بلکہ ظلم ہے، ہان یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کرکے دونون کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کرسکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعت محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتون مین پیش کیا ہے،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّ — اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، او

وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	رشتہ دار کیساتھ، اور یتیمون اور مسکینون
وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی	کے ساتھ، اور رشتہ دار پڑوسی
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ	کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ،
بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَ	اور ساتھی کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ
مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (نساء-۶)	اور لونڈی غلام کے ساتھ،
قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ	اے پیغمبر ان سے کہہ کہ تم جو خرچ
فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ	کرو وہ اپنے مان باپ، اور عزیزون
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ	اور یتیمون اور غریبون، اور مسافر
السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ	کے لئے، اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو،
خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ، (بقرہ-۲۶)	اللہ اس سے آگاہ ہے،
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ	اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین
وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ	کا، اور مسافر کا، اور فضول
تَبْذِیْرًا، (بنی اسرائیل-۳)	خرچی نہ کر.

عام طور سے اکثر مذہبون نے سب سے زیادہ اہمیت مان باپ کو دی ہے، اور اسلام مین بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے. مگر اس کی تکمیلی شان اس باب مین بھی اسی طرح نمایان ہے. جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب مین،

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مین یکسان ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینون مین اُن کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتون مین سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کیگئی ہے، تورات مین توحید کی تعلیم کے بعد ہے،

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو" (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے،

"تم مین سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے، اس کا خون اسی پر ہے" (احبار ۲۰-۹)

"اور وہ جو اپنی ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے، (خروج ۲۱-۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل مین انہی احکام کو دہرایا، اور اس بات پر زور دیا کہ ان

احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے، بلکہ ان کے روح ومعنی کا خیال کیا جائے فرمایا

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا، اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل[1] کیا۔ (متی ۱۵-۴)

نبوت محمدیؐ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے، اس نے توراۃ وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی، اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا،

۱- اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دلدہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ — اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ

[1] اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے، مثلاً متی ۱۹-۱۹ مرقس ۷-۱۰-۱۰-۱۹ لوقا ۱۸-۲۰،

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی	کے واسطے تاکید کی، اسکی ماں نے
وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ	اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں
(لقمان ـ ۲)	رکھا، اور دو برس تک دودھ پلایا،
وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ	اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ
اِحْسَانًا، حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ	اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے
کُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ کُرْهًا،	اُس کی ماں نے اس کو تکلیف کیساتھ
وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ	پیٹ میں رکھا، اور تکلیف کیساتھ
شَهْرًا،	جنا پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلاکر
(احقاف ۲)	چھڑانا تین مہینے میں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں: اس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری ماں: تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ[۱]: ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا، اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا، اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے[۲]، ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ!

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب ص ۸۸۳؛

مین نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری
مان زندہ ہے؟ جواب دیا نہین، دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی ہے، فرمایا تو
اس کے ساتھ نیکی کرؔ یہی اس کی توبہ بتائی، ایک اور صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ
مین نے جہاد مین شرکت کا ارادہ کیا ہے، اور آپ سے مشورہ چاہتا ہون، فرمایا کیا
تمھاری مان ہے؟ جواب اثبات مین دیا، فرمایا "تو اسی سے چمٹے رہو کہ جنت اس
کے پاؤن کے پاس ہےؔ"۔

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مین مخلوقات انسانی
مین جنسِ لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے، اور یہ برتری بالکل
فطری ہے، انسان سب سے زیادہ اپنے وجود مین جن کا ممنون ہے، اور جو اس کی تخلیق
کی مادّی علت ہین، وہ خالقِ اکبر کی علتِ فاعلہ ذات کے بعد مان اور باپ ہین،
لیکن باپ کی مادی علت چند لمحون اور چند قطرون سے زیادہ نہین، مگر مان وہ ہستی
ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا، اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہکر
اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ مین رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کو
ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پیدا مضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیون سے لگا کر اپنا
خون پانی کر کے پلایا، اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت مین اپنی ہر راحت قربان
اپنا ہر آرام ترک، اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی، ایسی حالت مین کیا مان سے بڑھ کر انسان

ؔ جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ ؔ ترغیب و ترہیب منذری جلد ۳ صفحہ ۲۲۸ بحوالۂ ابن ماجہ، نسائی و حاکم۔

اپنے وجود مین مخلوقات مین کسی اور کا محتاج ہے، اس لئے شریعت محمدی نے اپنی تعلیم مین جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اُس کی سزاوار ہے،

۲۔ مان کے ساتھ جو دوسری ہستی، بچہ کی تولید و تکوین مین شریک ہے، وہ باپ ہے، اور شک نہین کہ اس کی نشو و نما اور تربیت مین مان کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششین شامل ہین، اس لئے جب بچہ اُن کی محنتون اور کوششون سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس مان باپ کی کوششون سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ مان باپ کی خدمت کی صورت مین ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفون کی طرح اُن کی "عزت" کرنے اور اُن سے "ڈرتے رہنے" کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ اُن کی خدمت، اُن کی اطاعت، اُن کی امداد، اور اُن کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہانتک تاکید کی کہ اُن کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، اُن کے سامنے ادب سے جھکے رہو، اُن کی دعاؤن کو اپنے حق مین قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے، قرآن پاک مین والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتون مین نازل ہوئی ہے، اور اکثر موقعون پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے، کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ مین ہے، جس مین تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا،

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ — اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ — کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو، اور ماں

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ، (بقرہ ۱۰) — باپ کے ساتھ نیکی کرو،

یہ آیت پاک گو اُس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں، بلکہ "نیکی کرنے" کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے، اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے،

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ — فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۔ الآیۃ — باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ)

(بقرہ ۵-۲۶) — کے لئے،

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا — اور اللہ کو پوجو، اور اس کے ساتھ

بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ — کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ

اِحْسَانًا، (نساء - ۶) — کے ساتھ بھلائی کرو،

کفار کو جنھوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمی وخیالی باتیں پیدا کرلی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کرکے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے

کی چیزین حرام نہین، آؤ ہم بتائین کہ حقیقت مین حرام چیزین کیا ہین، خدا کے ساتھ شرک کرنا، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا،

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ	کہ (اے پیغمبر!) آؤ مین تمہین پڑھ کر سناؤن
رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا	کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا
بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ	حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ
إِحْسَانًا ج	کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں
(الانعام - ١٩)	باپ کے ساتھ نیکی کرنا،

معراج کے احکام دوازدہ گانہ مین خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، اُن کے حق مین دعاے خیر کرو، اور بڑھاپے مین اُنکی خدمت کرو،

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا	اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے
إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو،
إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ	ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر
أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا	اُن مین سے ایک یا دونون تمہارے
تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا	سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائین تو انکو
وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا	اف بھی نہ کہو، اور نہ ان پر خفا ہو،
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	اور ان سے ادب سے بولو، اور ان کے

مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ	لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکا دو
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا	اور کہو کہ اسے میرے پروردگار تو
(بنی اسرائیل - ۳)	ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے،

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت مین شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہین قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہون تو اس حالت مین بھی اُن کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہین، بجز اس کے کہ اگر وہ اس شرک کی دعوت دین، تو اُن کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں
حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ	باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اگر وہ تجھکو
بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا	مجبور کرین کہ تو خدا کے ساتھ اس کو
تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	شریک کر جس کا تجھ کو علم نہین، تو اُن
فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس
	لوٹ کر آنا ہے، تو مین تم کو تمھارے کرتوت
(عنکبوت - ۱)	سے آگاہ کرون گا،

اتنا ہی نہین، بلکہ اگر تمھارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دین تو صرف اُن کی اس دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن اُن کی دنیاوی خدمت، اور

حسنِ سلوک مین کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت مین بھی اپنی جگہ پر قائم رہے، فرمایا،

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ، وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

(لقمان - ۲)

اور ہم نے انسان کو جتایا کہ اپنے مان باپ کے ساتھ نیکی کرو، اسکی مان نے اس کو تھک تھک کر پیٹ مین رکھا، اور دو سال مین اسکا دودھ چھڑایا، کہ وہ میرا اور اپنے مان باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہی، اگر وہ دونون اس پر تجھ کو مجبور کرین کہ میرے ساتھ اسکو شریک کر جسکو تو نہین جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان، اور دنیا مین اُنکے ساتھ بھلائی سے گذران کر

اس اہتمام کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ مان باپ کی احسانمندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کیساتھ کرتا ہی اور اس شرک پرستی کی دعوت، اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب مین ان کی بات اولاد نہ مانین، مگر دوسری دنیاوی باتون مین اُن کا ادب، اُن کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے،

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسنِ خاتمہ پر مرے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ،	اے میرے پروردگار مجھے اور میرے
(ابراهیم - ۶)	ماں باپ کو بخش دے،

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی،

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ،	میرے پروردگار مجھے اور میرے
(نوح - ۲)	ماں باپ کو بخش دے،

اس لئے والدین کے حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیا علیہم السلام کی پیروی ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں، ان کی خدمت بجا لاتے ہیں، اور ان کے لئے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں اُن کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت اُن کو عطا فرماتا ہے،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہدیا
إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ	کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا
كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا،	اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے
وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ	پیٹ میں اٹھایا، اور تکلیف کر کے
شَهْرًا حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ	جنی، اور تیس مہینوں تک اس کو

وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ، قَالَ
رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ
وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِيْ
فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ، اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ
مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ
سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ
وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ
كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ،

(احقاف - ۲)

پیٹ مین رکھنا، اور دودھ چھڑانا،
یہانتک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان
ہوا اور چالیس برس کا ہوا اس نے
کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق
دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا
کرون جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں
باپ پر کیا، اور اس کی کہ مین وہ کام
کرون جس کو تو پسند کرے، اور میری
اولاد نیک کر، مین تیری طرف لوٹ
کر آیا اور مین تیرے فرمانبردارون
مین ہون، یہی وہ ہین جن کے اچھے
کام ہم قبول، اور ان کے برے کامون
سے درگذر کرتے ہین، یہ جنت والون
مین ہون گے، یہ سچائی کا وعدہ ہے... جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا

ان آیتون نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو
وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہون کی فرد دُھل کر صاف ہوجاتی ہے، احادیث مین
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی منشاے الٰہی کو مختلف عبارتون، اور طریقون مین

ادا فرمایا ہے، کبھی فرمایا ہے کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت[1] ہے" کبھی ارشاد ہوا، "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے" کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گذارش کی پھر کون، چوتھی بار فرمایا تیرا باپ، اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہو، پھر جو اس سے قریب ہے، ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس قدس میں تشریف فرما تھے، جان نثار حاضر تھے، فرمایا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، صحابہ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، اور پھر (انکی خدمت کرکے) جنت نہ حاصل کرلی، ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا پھر کون، فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا، (جہاد)

ایک دفعہ آپ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اُس غار کا منہ بند ہوگیا، (اب اُن کی بیکسی و بیچارگی اور

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد و نسائی و بیہقی، کتاب الآداب فی البر والصلۃ،

اضطراب وبیقراری کا کون اندازہ کرسکتا ہے، اُن کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی، اس وقت انھون نے پورے خضوع وخشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی مین دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے، اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، مین بکریان چراتا تھا، اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، مین شام کو جب بکریان لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دُوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت مین لاتا تھا، جب وہ پی چکتے تب اپنے بچون کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ مین بکریان چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے، مین دودھ لے کر اُن کے سرھانے کھڑا ہوا، نہ اُن کو جگاتا تھا کہ اُن کی راحت مین خلل آجاتا، اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھین کھلین، اور دودھ مانگین، بچے بھوک سے بلک رہے تھے، مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہون، مین اسی طرح پیالہ مین دودھ لئے رات بھر سرھانے کھڑا رہا، اور وہ آرام کرتے رہے، خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ مین نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹادے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی، اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافرون کی باری آئی اور انھون نے بھی اپنے نیک کامون کو وسیلہ بنا کر دعا کی، اور غار کا منہ کھل گیا،

اسلام مین جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے، مگر والدین کی خدمتگذاری کا

درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہین، کہ جہاد کے میدان مین سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے، اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہی اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے اس جسم وجان کو کھونے کا حق نہین، جس کو اُن کی خدمت گذاری کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، اسی لئے ابھی اوپر گذر چکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کامون مین جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر خدمتِ اقدس مین آکر شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی، دریافت فرمایا کہ تمھارے ماں باپ بھی ہین، عرض کی جی ہان، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کرو،

قرآن پاک کی صریح آیتون مین خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے، احادیث مین بھی اُس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے، صحابہؓ سے فرمایا کہ تم پر خدا نے ماؤن کی نافرمانی حرام کی ہے"۔ ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت مین حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤن کہ دنیا مین سب سے بڑے گناہ کیا ہین، انھون نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ، فرمایا خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے، اور فرمانے لگے "اور جھوٹی گواہی اور ہان جھوٹی گواہی"[1]۔

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتبِ حدیث مین مذکور ہین خصوصیت کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلہ، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ، مشکوٰۃ باب مذکور،

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بیحد سخت تھے، وحی محمدی نے بعض حیثیتوں سے اُن میں تخفیف کردی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا، جس کے معنی یہ ہین کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں، اور مجرم کو اپنے فعل پر نظرِ ثانی کی تا زندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اُس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون مین ایک دفعہ یہ بھی ہے، کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتون مین وہ اس کے قصاص مین قتل نہ ہوگا، بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے، تا آنکہ اُس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو، [1]

[1] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہین، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہین لیا جائے گا، امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہین، اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت مین قصاص ہے، اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفورِ شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے، اس لئے اکثر فقہا نے اسکو قتل خطا سمجھکر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے، الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہون،

اسی سلسلہ مین ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، توراۃ نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے اُن کو بالکل بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے،

اس واسطے مرد اپنے مان باپ کو چھوڑے گا، اور اپنی جورو سے ملا رہیگا اور وہ ایک تن ہونگے، (پیدایش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) مان باپ اور بیوی تینون سے ناآشنا تھے، تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ مین ہے، مان باپ کے مقابلہ مین بیوی کی طرف داری اور حمایت کی، اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰-۷ و ۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو، اور اس لئے ان دونون مین سے کسیکو مجبورًا ترجیح دینی پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال مین بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے، جو ٹوٹ کر جڑ سکتا، اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھین جن سے وہ راضی تھے، مگر اُن کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھین، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کرین،

اولاد کا حق

اصولی تعلیم جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں، اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں مین نہین ملتا، اور اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہین کیا گیا تھا، اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت مین حقوق کے مسئلہ مین بڑون چھوٹون کی تفریق نہین، وہ جس طرح چھوٹون پر بڑون کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹون کے بھی بڑون پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ مین وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، اُن حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے، یہ متن اُن سب پر محیط ہے، فرمایا،

لیس منا من لم یرحم صغیرنا	جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے
ولم یوقر کبیرنا،	اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے
(ترمذی)	وہ ہم مین سے نہین۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئین، اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ

کرین، یہ وہ اصول ہے، جس پر چھوٹون اور بڑون کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام مین قائم کی گئی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت مین چھوٹون، بڑون، افسرون، ماتحتون، آقاؤن، نوکرون اور بزرگون اور عزیزون کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹون اور بڑون مین کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونون پلڑون مین توازن قائم نہین رہا ہے، حکیمون اور مقننون کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدون کا بے پایان دفتر جو کام نہین کرسکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہین، اور دیتے ہین، اگر واقعاً کسی جماعت مین یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونون کا بار گران بھی پھر اس کو برابر نہین کرسکتا،

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنین، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کے نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کرین جو ان کی قوت اور استطاعت مین ہے، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے، اور ذریعۂ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہین سمجھا ہے، اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے،

اولاد کشی کا انسداد | عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی، سنگدلی کا کام

معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود ذبح کر کے اُن پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ[1] کی قربانی کریں گے، یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں[2] اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی بازپرس نہ تھی، اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا، ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے، اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کی خوشی اور نذرانے کے لئے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے[3]،

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ | (جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ اُن کے دیوتاؤں

[1] سیرۃ ابن ہشام، وطبقات ابن سعد وتاریخ طبری وغیرہ، کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک باب مالا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ [2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول صفحہ ۲۲
[3] کشاف زمخشری کی تفسیر آیت ذیل،

شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ
وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ

(انعام-١٦)

نے اپنا حصہ لگا لیا ہے، اسی طرح بہت سے
مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات
خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد
کو قتل کر دیں، تاکہ یہ دیوتا انکو (ہمیشہ کیلئے)
ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر
مشتبہ کر دیں، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ
کرتے، تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ خدا پر
وہ افترا کرتے ہیں کہ خدا نے انکو ایسا حکم دیا ہے...

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے،

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا
أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام)

گھاٹے میں ہیں وہ جنہوں نے اپنی
اولاد کو نادانی سے بیجا نے قتل کیا،

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لئے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے، نبوّتِ محمدیؐ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا، بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے، اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے،

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ	اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن کہ
اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُهَا (هود-۱)	اسکی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے،

اس لئے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی،

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ	اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے
اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ	مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو
وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ کَانَ	اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں
خِطْأً کَبِیْرًا (اسراء-۴)	ان کا مارڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے

قتلِ اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنھوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ	کہدے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو جو کچھ
رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا	سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے
بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ	تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو
اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا	شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ
اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ	اچھا سلوک کرنا، اور مفلسی کے ڈر سے
نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاهُمْ	اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تمکو اور انکو
(انعام-۱۹)	دونوں کو روزی دیتے ہیں،

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد، فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اس کے بعد، فرمایا یہ کہ "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی"۔ یہ جواب حقیقت مین آیتِ بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرِ توفیق نے دلون مین یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق خدا ہے، اسی کے ہاتھ مین رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو گئی،

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیون کا زندہ دفن کر دینا تھا، کہ لڑکیان شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھین، جب گھر مین لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگون سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیان ہین، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمھاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیون کا باپ کہو تو شرم نہ آئے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ	اور جب اُن مین کسی کو اُسکے ہونے کی
لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ	خوشخبری دیجائے جسکی وہ رحمت والے
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ،	خدا پر تہمت باندھتے ہین تو اندر ہی اندر
(زخرف - ۲)	غصہ کے مارے اسکا منھ سیاہ پڑ جاتا ہے،

لہ صحیح بخاری کتاب التوحید، وتفسیر سورۂ بقرہ، و سورۂ فرقان، و کتاب الادب و کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان،

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم وعار کے مجسمہ کو پردۂ خاک مین چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکرین کرتے، قرآن مجید نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا ہے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى	اور جب ان مین سے کسی کو لڑکی کی
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ	خوشخبری دیجاتی ہے تو اس کا منہ کالا
كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ	پڑجاتا ہے، اور غصہ کے گھونٹ پی کر
مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ	رہجاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے
اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ	وہ لوگون سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ
يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ	آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس
(نحل - ۷)	رہنے دے یا اسکو مٹی مین چھپا دے (یعنی زندہ دفن کردے)

یون تو اس رسمِ بد کا رواج تمام عرب مین تھا، مگر اخبارِ عرب کے بعض واقف کہتے ہین کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم مین اس کا رواج سب سے زیادہ تھا[۱]، بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار کیا کہ انھون نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیون کو زندہ دفن کیا ہے[۲]، یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ

---

[۱] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۰۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ خیریہ مصر، زیر مثل اصدل من موؤدۃ [۲] ابن جریر و ابن کثیر و در منثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزاز و مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر،

انجام دی جاتی تھی، اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سُنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت[1] ہے، کہ ایک شخص نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے، اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی، ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی، میں آگے بڑھا، اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی، میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا، اور لڑکی اس کے قریب پہنچی، تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہکر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی یہ رحمت کونین صلی اللہ علیہ وسلم اس پُر درد افسانہ کو سُنکر آنسو ضبط نہ کر سکے، ایک صحابی نے اُن صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کر دیا، فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے، پھر اُن صاحب سے فرمایا" ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر تو سُناؤ" اُنھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریشِ مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو"

[1] سنن دارمی صفحہ اوّل، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس سے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے،

قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھون نے عرض کی کہ یارسول اللہ! مین نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیان زندہ دفن کی ہین، فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ مین ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یارسول اللہ میرے پاس اونٹ ہین، "فرمایا" اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ مین ایک اونٹ قربانی کرو[1]"

مردون کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتین بھی اس جرم مین مردون کی شریک تھین، مائین خود اپنی لڑکیون کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے حوالہ کرتی تھین، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے،

مالقی المؤد من ظلم اُمّہ　　　کما لقیت ذھل جمیعًا و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت مین ایک عورت نے آکر کہا کہ مین نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کرون گی، فرمایا "ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ[2] دے دو"

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لئے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیون نے ایسی لڑکیون کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا، اور اُن کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس مین بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آیا تو عرض

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالۂ عبدالرزاق و بزاز و در منثور سیوطی بحوالۂ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ،

کی یارسول اللہ! مین نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیون کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا، فرمایا! ہان تم کو اس کا ثواب میگا، کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے[1]، اسی طرح زیدؓ بن عمرو بن نفیل جو بعثت نبوی سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیون کو اپنے آغوشِ شفقت مین لیتے تھے، اُن کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھین تو وہ اُن کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو مین تم کو واپس کر دون، چاہے اُن کو میرے ہی پاس رہنے دو[2]، یہ شخصی کوششین تھین جو ملک مین بارآور نہ ہوئین، لیکن بعثتِ محمدیؐ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتون کے موسم پر ہمیشہ کے لئے خزان چھاگئی،

لوگ عموماً لڑکیون کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوتِ محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنادیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئین، فرمایا "جو کوئی ان لڑکیون مین سے کسی لڑکی کی مصیبت مین مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بنکر حائل ہو جائے گی[3]؛ نیز فرمایا جو دو لڑکیون کی بھی پرورش کرے یہان تک کہ وہ جوان ہو جائین تو قیامت مین میرا اور اُس کا مرتبہ دو انگلیون کو اٹھا کر فرمایا کہ یون برابر ہوگا[4]؛ غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدی

---

[1] تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی، تفسیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰ [3] صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر [4] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق،

مین آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی،

ان اخلاقی نصیحتون کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ نے عورتون اور مردون سے بیعت لی، صلحِ حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتین اسلام لائین اُن سے تو یہ کی جو بیعت لی جائے اس مین ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ (ممتحنہ) کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرین گی" چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتون سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتحِ مکہ کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کیلئے حاضر ہو رہے تھے تو آپ نے عورتون سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا، اور انھون نے اقرار کیا[2]، عید کے اجتماعِ عام مین عورتون کے مجمع مین آپ تشریف لائے، اور دوسری باتون کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا[3]، کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہون گی، دوسرے موقعون پر بھی جو خاتونین دربارِ رسالت مین حاضر ہوتین ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا[4] بعض روایتون سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحین تھین ان مین ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعتِ عقبہ مین سب سے پہلے انصار سے جن باتون پر عہد لیا گیا تھا، اُن مین ایک یہ بھی تھا کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرین گے[5]"

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت مین

---

۱ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء ۲ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۳۳ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید ۳ ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمیٰ بنت قیس ۴ تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۲۴۳ برحاشیہ فتح البیان بحوالۂ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۳ علی شرط مسلم،

حاضر تھے، آپ نے فرمایا کہ "ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کروگے، بدکاری نہ کروگے، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے، جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے، اور اگر کسی نے ان مین سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا، اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا مین مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخشدے چاہے عذاب دے۔[1] صحیح سے فرمایا کہ "خدا نے تم پر ماؤن کی نافرمانی اور لڑکیون کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے"[2]

ان تمام تدبیرون کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتون، ان تمام سنگدلیون اور ان تمام سفاکیون کو مٹانے مین وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہین کرسکتی تھین، قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہین، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمالنامے شہادت مین پیش ہین کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیان خون سے رنگین کپڑون مین آکر کھڑی ہو جاتی ہین، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم مین ماری گیئن۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ — یاد کرو جب (قیامت مین) زندہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان وباب وفود الانصار ومسلم کتاب الحدود ومسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۲۰ ومستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب وکتاب فی الاستقراض وصحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل،

بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ، دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائیگا

(کورت) کہ تو کس جرم مین ماری گئی،

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیون کو خود اپنے ہاتھون سے دفن کر دیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ اداے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہین، سیدالشہدا، حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ مین رہگئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علیؓ ہاتھون مین اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہرا کے حوالہ کرتے ہین کہ یہ تو تمھارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعوی کرتے ہین کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے، کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، اور اس کی خالہ میرے گھر مین ہے، حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہین کہ حضور! یہ لڑکی مجھکو ملنی چاہیے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؓ کا دعوی ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میرے ہی گود مین آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوشکن منظر کو دیکھتے ہین، پھر سب کے دعوے مساوی دیکھکر اس کو یہ کہکر اسکی خالہ کے گود مین دے دیتے ہین کہ "خالہ مان کے برابر ہوتی ہے"[1]

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم وعار کا موجب تھی جس کی پیدائش کی خبر سُنکر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑجاتا تھا، اور وہ لوگون کے مجمع مین منہ دکھانے کے قابل نہین رہتا تھا، یا یہ حال ہے کہ ایک ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعتًہ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء،

چار چار گود خالی ہو جاتے ہین، اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی، آنکھون کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے،

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	(جنت ان کو بھی ملیگی جو......) اور
ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ	جو کہتے ہین کہ ہمارے پروردگار ہماری
ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ،	بیویون اور ہماری اولاد سے ہم کو
(فرقان - ۶)	آنکھون کی ٹھنڈک عنایت فرما،

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا،

غدا الناس مذ قام النبی	پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے
الجوا دیا،	کہ سب لڑکیان ہی لڑکیان ہین،

رضاعت وحضانت اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اسکی نشو ونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کیجائے، اور اس کے بعد اُس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی، اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونون باتون کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہان تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابون مین مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے، کہ بچّہ کو شیر خوارگی کے عالم مین ماں دودھ پلائے، اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علحدہ ہو چکی ہو تو

باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا، اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا، اور
اس شیرخوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے،

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ	برس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے
أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ، وَعَلَى	لئے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت
الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ	پوری کرے، اور لڑکے والے (باپ)
كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ،	پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا
(بقرہ - ۳۰)	کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے

اور شیرخوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر
اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت
کو قبول کیا، اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی
بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا،

وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ	اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں
وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ ،	جنھوں نے تم کو دودھ پلایا، اور
(نساء - ۴)	تمہاری دودھ شریک بہنیں،

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو ونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور
احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے،

اوپر کی پہلی آیت مین جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے، اور باپ نہ ہو تو دادا پر، اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے،

تعلیم و تربیت | ظاہری اور جسمانی نشو و نما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر فقرہ مین جو صرف چار لفظون سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے، کہ اس کی تفصیل و تشریح مین دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہین، فرمایا،

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا	اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے
اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا، (تحریم-۱)	اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ،

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگِ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود اُن تمام برائیون، خرابیون اور ہلاکتون سے اُن کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہین، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے،

خدا نے اُن لوگون کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچون کے حق مین دعائے خیر کیا کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ بارِ الٰہا! تو اُن کو ظاہر و باطن کا حُسن، صورت و سیرت کی خوبی، اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھون کی ٹھنڈک بنا، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہین) جو

هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا	کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ،	ہماری بیویون اور ہماری اولادون
(فرقان - ۶)	کی طرف سے آنکھون کی ٹھنڈک عنایت فرما،

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادتمند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیئے، ایک سورہ مین خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق مین مغفرت کی دعا مانگتے ہین، اور اُن کی خدمت کی توفیق چاہتے ہین، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق مین اپنی کوششون کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہین،

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ	اور (اے خداوندا!) میرے لئے
اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ	میرے کامون کو میری اولاد مین
الْمُسْلِمِيْنَ،	صالح بنا، مین اپنے گناہون سے
(احقاف - ۲۰)	تیری طرف باز آیا، اور مین فرمانبردارون مین ہون

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب مین وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیمِ ربانی پا کر مختلف طریقون سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبوی مین آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت

حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا کیا آپ بچوّں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں میں نے اُن میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم وشفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں"[2] ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوّں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آنا چاہئے، کہ جو اپنے بچوّں پر رحم نہیں کرتا خدا اُس پر رحم نہیں کرتا،

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس ایک غریب عورت سائل بنکر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں، اس وقت کاشانۂ نبوی میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کردی:

ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سدِ رمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضورؐ نے سنکر فرمایا جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ انکے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کیلئے

[1] و [2] یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد میں ہیں، نیز دیکھو ابو داؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ،

آ پہنچائیں گی؟ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہان تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اُس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور مین (دو انگلیون کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہون گے۔[1] اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔[2] ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔[3]

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو، اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے، اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت مین داخل فرمائے گا۔[4] باہم لڑکون مین بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی مین قائم نہیں، اسی لئے دنیا کی اکثر شریعتون اور قانونون کے برخلاف اسلام مین بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان مین سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہان تک کہ اگر لڑکون مین سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکون مین

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات [2] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی ادب الولد [3] ... [4] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہو، انھون نے خدمتِ اقدس مین حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچون کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہین، فرمایا تو مین ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ ہونگا۔[1]

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیون، رومیون، ہندوون، اور دوسری پرانی قومون مین رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اُس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کر دی گئی، اور باپ کی نظر مین اس کے تمام لڑکون کو برابر کا منصب حاصل ہوا، اور چھوٹون پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اُس کا خاتمہ ہوا،

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست مین تیسرا درجہ زن و شو کا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھون کی تسکین روحانی کا ذریعہ، اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچون کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانون کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے،

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، اُن سب مین عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح

[1] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل۔

کی ترقی مدارج کے لئے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان مین بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب مین تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ تھا، اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد مین ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج مین ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی مان نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے، اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہین؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لئے اس کو کون سے فطری موقع مل سکتے ہین؟ پھر دنیا مین اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے، اس تجرد کی زندگی مین کتنی یقینی ہے، مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ مین محفوظ ہے، اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے،

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا،

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ	اور اپنے مین سے بن شوہر کی عورتون
وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ	کا (خواہ وہ کنواری ہون یا رانڈ)
وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ	اور اپنے غلامون اور لونڈیون مین سے

لہ انجیل قرنتیون ۷-۸،

يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۔ (نور - ۴)

صالحون کا نکاح کردیا کرو، اگر وہ غریب ہون گے تو اللہ اُن کو اپنی مہربانی سے غنی کردیگا، اور اللہ گنجایش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیتِ پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب و تنگدست ہون گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے اُن کو غنی بنادے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر مین غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر مین فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا، اور دنیاوی لحاظ سے دو سببون سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجاے گھر مین دو کام کرنے والے ہون گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہون گے، اس فلسفہ کا راز اہلِ دولت نہین، غریب ہی سمجھ سکتے ہین، خصوصاً مزدور اور کاشتکار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤن ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لئے جو بیکاری سے غریب ہے، بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا، کہ وہ کام کہین سے پیدا کرے، خصوصاً اس لئے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کامون پر آمادہ کردے گی، جن کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر مین فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجایش مین سب کچھ ہے، اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لئے اُس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہین،

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرے، فرمایا،

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا	اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ
اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ	رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے
الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ	نکاح کرسکے تو تمہاری اُن مومن
اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ	باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے
الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ	جو تمہارے قبضہ میں ہو، اور اللہ
بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ	تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے، تم
(نساء - ۴)	ایک دوسرے کے ہمجنس ہو،

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف وآزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرو، اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں، ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا، اور خدا کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہہ یہ تھا کہ یہ نو مسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہوں گی، تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے، اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں، یہ اہتمام بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے

بازنہ رہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اتزوج النسآء فمن رغب	میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں،
عن سنتی فلیس منی،	توجس نے میرے طریقہ سے روگردانی
	کی تو وہ مجھ سے نہیں،

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہمجنس کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن وشو کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا،

ومن ایتہ ان خلق لکم	اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے
من انفسکم ازواجا لتسکنوا	ایک یہ ہے کہ اس نے تمھاری جنس
الیھا وجعل بینکم مودۃ	سے تمھاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم
ورحمۃ ان فی ذلک لایت	اُن کے پاس سکون پاؤ، اور تمھارے
لقوم یتفکرون،	آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بیشک
(روم ۳۰)	اس میں سوچنے والوں کیلئے کتنی نشانیاں ہیں،

قرآن پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر

۱؎ صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح،

کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث، اور مشکلات کے تلاطم مین امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لئے میان بیوی کے باہمی تعلقات مین اتنی خوشگواری ہونی چاہئے کہ اُن سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثار قدرت مین شمار کیا ہے، پورے ہون، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر و محبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہون، تو اس مین دونون یا دونون مین سے ایک کا قصور ہے۔

میان بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اُن لوگون کی سخت برائی کی ہے جو زن وشو کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت مین فرق ڈالین، فرمایا،

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ	تو وہ (یہود) اُن سے وہ سیکھتے ہین
بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ	جس سے شوہر اور اس کی بیوی مین
...... مَا لَهٗ	تفرقہ ڈالتے ہین......
فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ،	...اس کے لئے آخرت مین کوئی
(بقرہ ۔ ۱۲)	حصہ نہین ہے،

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری، اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن وشو باہم اپنے

اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے، اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے، اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ	مرد، عورتوں کے سردھرے ہیں،
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى	اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ	پر بزرگی دی ہے، اور اس لئے کہ مرد
اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ	اپنا مال اُن پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ	بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں، اور غائبانہ
اللّٰهُ ط	نگہبانی کرتی ہیں، کہ خدا نے انکی حفاظت
(نساء - ٦)	کی ہے،

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بی بیاں شوہر کی غیر حاضری میں، اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں، اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے اُن کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلاف فطرت ہے،

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو

ان کی معاشی، اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہین، قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ مین ادا کر دیا ہے،

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ	عورتین تمھاری پوشاک ہین، اور
لِبَاسٌ لَّهُنَّ، (بقرہ - ۲۳)	تم ان کی پوشاک ہو،

اس پوشاک کے پردہ مین جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیون معنی پوشیدہ ہین، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمھارے لئے، تم ان کی زینت ہو، وہ تمھاری، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمھاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمھاری، یہی نکاح کے اغراض ہین، اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے،

ایک اور آیت مین اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق، اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا:-

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ	لحاظ کرو، جس نے تم کو ایک ذات
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا	سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونون
رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ج	سے بہت سے مردون اور عورتون

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ	کو پھیلایا، اس خدا کا جس کا واسطہ دیکر
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ، اِنَّ اللّٰهَ	تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے
كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا،	ہو، اور رحمون (رشتون) کا لحاظ رکھو
(نساء-۱)	اللہ تمھاری دیکھ بھال کر رہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو نکاح کے خطبون مین عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیتون مین انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑون مرد و عورت پیدا ہوئے، اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ توہم چاہیئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات مین اپنے اس خالقِ حقیقی کا، اور ان رحمون (رشتون) کا لحاظ کرین جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہین، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتون اور رشتہ داریون کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوسکتا، اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود مین آیا ہے، اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا مین نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودّت کا آغاز ہوتا ہے،

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت مین صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ مین کہا ہے، مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ (مائدہ-۱) "پاکدامنی کے لئے، نہ شہوت رانی کے لئے" اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جوانون کو خطاب کرکے فرمایا "اے جوانون کے گروہ! تم مین نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح

کرے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے، (ابن ماجہ، نکاح)

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں مین صلح اور یکجہتی کا رجحان نمایان رہے اور ہر موقع پر جہان تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہئے، اور اصلاحِ حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہئے، اسی لئے زوجین مین مناقشہ پیش آنے کی صورت مین بھی اصلاحِ حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے، فرمایا، اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا۔ (بقرہ ۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہین، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا، (نساء ۱۹) اگر اصلاح کرو اور تقوی کرو، کہین اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدون کو قائم کرنا کہا گیا ہے،

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللہِ، (بقرہ ۲۹)	یہ کہ میان بی بی دونون اللہ کی حدون کو قائم رکھین گے،

جاہلیت مین دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویون کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ نہین کرینگے، اور جب انھین کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہین، مجبور ہین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگون کو فرمایا،

وَلَا تَجْعَلُوا اللہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ،	اللہ کو اپنی قسمون کا ہتھکنڈا نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو، اور تقوی اور لوگون کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو،

وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ (بقرہ ۲۸-۲۰) اور اللہ سنتا اور جانتا ہے،

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھاکر علٰحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملہ سے ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بِرّ) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی، اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے،

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں،

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ، (نساء-۶) تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردا ہوتی ہیں، اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کی پیٹھ پیچھے (کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی نگہبانی کرتی ہیں،

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں، اُن کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت اُن کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں، اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود اُن کی اپنی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیرحاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کرے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کردے اور شوہر گھر پہ نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اسکے مال کی پوری حفاظت کرے۔" (ابن ماجہ نکاح)

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین ان الفاظ مین فرمائی،

"لوگو! عورتون کے حق مین میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمھارے ہاتھون مین قید مین تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہین رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کرین اگر ایسا کرین، تو اُن کو خوابگاہ مین علحدہ کردو، اور ان کو ہلکی مار مارو، تو اگر وہ تمھاری بات مان لین تو پھر اُن پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمھارا عورتون پر، اور عورتون کا تم پر حق ہے، تمھارا حق تمھاری عورتون پر یہ ہے کہ وہ تمھارے بستر کو دوسرون سے پامال نہ کرائین جن کو تم پسند نہین کرتے، اور نہ تمھارے گھرون مین ان کو آنے کی اجازت دین، جن کا آنا تم کو پسند نہین، اور ہان! اُن کا حق تم پر یہ ہے کہ اُن کے پہنانے اور کھلانے مین نیکی کرو، (ابن ماجہ، کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے فرمایا جب خود کھائے تو اُسکو کھلائے، جب خود پہنے تو اُسکو پہنائے، نہ اُسکے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے، اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علحدہ کرے، (ابن ماجہ ایضاً)

دوسری طرف آپ نے عورتون کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہرون کی پوری اطاعت کرین، یہان تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا مین کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے،" آپ نے یہ طریقۂ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کیلئے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام مین خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہین،

ایک مشہور حدیث مین آپ نے فرمایا،

خیرکم خیرکم لاھلہ، (ترمذی و دارمی و ابن ماجہ)	تم مین سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے سب کا بہتر ہے،
خیارکم خیارکم لنساءھم، (ترمذی)	تم مین سب سے بہتر وہ ہین جو اپنی بیویون کے لئے بہتر ہین،

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ مین ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنون کے ساتھ انصاف اور احسان نہین کرسکتا وہ دوسرون کے ساتھ کیا کرسکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے،

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہین کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا،

ولزوجک علیک حقًّا (بخاری کتاب النکاح)	اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے،

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ مین بیویون کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی قصورون پر ماری پیٹی جاسکتی تھین، حضرت عمرؓ فرماتے ہین کہ ایک دفعہ مین نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہین کہ "ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتون کو کسی شمار و قطار مین نہین سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اُن کے بارہ مین احکام اتارے، اور اُن کے حق مقرر کئے"[1]

[1] صحیح بخاری، باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا و تفسیر سورۂ تحریم،

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہانتک بڑھایا کہ اُن کو قانوناً مردون کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، اور آپس کے قانونی حقوق مین اُن کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ مین مردون کو تھوڑی سی اعزازی برتری دیگئی، ارشاد ہوا،

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ	اور عورتون کا حق دستور کے مطابق مردون
بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ	پر ویسا ہی ہے جیسا مردون کا عورتون
دَرَجَةٌ ، (بقرہ - ۲۸)	پر، اور مردون کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے،

لیکن یہ منزلت بھی اُن کو بے وجہ نہین دی گئی ہے، یہ اس لئے ہے تاکہ وہ عورتون کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکین یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہین، یہ نکتہ اس سے سمجھ مین آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میان بیوی کے خانگی جھگڑون کے دور کرنے کے سلسلہ مین ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشون کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ دونون کے قانونی حقوق یکسان ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے،

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہین، قرآنِ پاک نے اس کی مصلحتین بھی بتا دی ہین، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ	مرد عورتون کے نگران ہین، اس سبب سے
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى	کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے
بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (نساء - ۶)	اور اس لئے کہ انھون نے اپنا مال

یعنی مردون کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طورسے مردون کو عورتون پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ مین جسمانی وذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید مین ہین، اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دَین مہر، نان ونفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست، اور آپس مین تعلقات کی خوشگواری قائم رہے،

اکثر عورتون مین ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید اُن کی فطری کمزوری یا عدمِ تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہین کہ اُن کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ مین سختی اور درشتی سے کام لے کر اُن کی یہ ٹیڑھ نکال دین، آپ نے اُن کو ایک نہایت عمدہ تنبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ "عورتون کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ اُن کی پیدایش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو، اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالوگے"! آپ نے مردون کو بیویون کے معاملہ مین خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا، "اپنی بیوی مین کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کروگے تو اس مین کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی" یہ نصیحت حقیقت مین قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے،

له صحیح بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	اور بیویون کے ساتھ معقول طریقہ سے
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ	گذران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائین تو
تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ	ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے
فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ، (نساء-۳)	اور خدا نے اس مین بہت خوبی رکھی ہو

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتون کو دو حصّون مین بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتون کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتون کا بار گران مرد کے کندھون پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کامون کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یکجہتی کے ستونون پر قائم کیا ہے، اپنے لئے خود روزی کمانا، اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہین، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے، اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ، اور ضروریات کا کفیل ہو اگر وہ ادا نہ کرے، تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اسکی وصولی کا حق حاصل ہے، اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علحدگی کے دعوی کا اختیار حاصل ہے[1]، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات مین عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن مین مذکور ہین،

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتون کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی مین اس کی دولت سے اُس کی

---

[1] اس اختیار کی تشریح مین فقہا مختلف ہین، تفصیلات کیلئے فقہ کی کتابون مین کتاب النفقہ دیکھنا چاہیے، نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ صفحہ ۲۶۳ مصر،

حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابو سفیان کی بیوی ہند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو سفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں اُن کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔[1]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا "تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اسکی نسبت بازپرس ہوگی..... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی" (بخاری اول صفحہ ۷۷، باب قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ	اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ	ہو تو اُن کو سمجھاؤ، اور خوابگاہوں
فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	میں اُن سے علحدگی برتو، اور اُن کو

[1] صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل صفحہ ...

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا، (نساء - ٦)

مارو، تو اگر وہ تمھارا کہنا مان لین تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو،

لغت مین "نشوز" کے معنی "اٹھ جانے" کے ہین، اور عورت کے حق مین اس کے اصطلاحی معنی جو ہین وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ مین حسب ذیل ہین:-

ومعنی ذالك اذا رأيتم منهن ما تخافون ان ينشزن عليكم من نظر الی مالا ينبغی لهن ان ينظرن اليه ويدخلن ويخرجن واسترِبتم بامرهن، (تفسیر طبری ۳۰ مصر)

اور اس کے معنی یہ ہین کہ جب تم ان عورتون کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے "نشوز" کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہین چاہیئے اور وہ آئین اور نکل جائین، اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے،

عن محمد بن كعب القرظی اذا رأی الرجل تقصيرها فی حقه فی مدخلها و مخرجها قال يقول لها بلسانه قد رأيتك منك كذا و كذا فانتهی، (ایضًا)

محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے مین اس کے حق مین قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ مین نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تو اب باز آجا،

---

[1] اصل متن تفسیر مین واستبریتم غالبًا غلط چھپا ہی،

فقہ کی کتابون مین ہے،

الناشزۃ ھی الخارجۃ عن	نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر
منزل زوجہا المانعۃ	کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے
نفسہا منہ، (عالمگیری، نفقات)	آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے،

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس مین بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتین پائی جائین، کچھ مفسرون نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رُخی کرے، اور اس سے بغض رکھے، (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال مین یہ دونون تفسیرین درست ہین، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہین، آیتِ مذکور پوری یہ ہے،

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد عورتون کے نگران ہین (ایک)
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ	اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک
عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ	پر بڑائی دی ہے، اور (دوسرے)
اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ	اس لئے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ
قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ	کرتے ہین، تو نیک بیویان فرمانبردار
بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ	ہوتی ہین، اور شوہر کے، پیٹھ پیچھے
نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْ هُنَّ	(شوہر کے گھر بار اور عزت و آبرو کی)

ف اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوئی ہے، ۱۲

فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	حفاظت کرتی ہین، کہ اللہ نے انکی
فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا	(یعنی عورتون کی) حفاظت کی ہے اور
عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا،	جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو اُن کو
	سمجھاؤ، اور اُن کو خوابگاہون مین علٰحدہ
(نسآء - ۶)	کردو، اور اُن کو مارو، تو اگر وہ تمھارا کہا مان لین تو پھر اُن پر راستہ تلاش نہ کرو،

اس آیتِ پاک مین مرد کی ترجیح کی جو دو باتین بیان کی ہین، اُن کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویان وہ ہین جو اپنے شوہرون کی فرمانبردار ہین، اور اُن کے پیٹھ پیچھے ان کے گھربار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہین، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمھین نشوز کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت مین اس سے کنارہ کرو، یا اُس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اسکو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لئے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو،

اب جب اوپر مین بتا چکا کہ مردون کو عورتون کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا چکا کہ نیک بیویان وہ ہین جو شوہرون کی فرمانبردار ہین، اور شوہرون کے پیچھے اُن کے گھربار، مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہین، اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمھین عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے، کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہین یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے

پیچھے اُس کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت، جو عورت ان دونون کو یا ان دونون مین سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہین کرتی وہی ناشزہ ہے، اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے،

"شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے، اس کی تصریح احادیث مین موجود ہے، آپ نے فرمایا سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے، اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے،" اپنی جان کی حفاظت" سے مقصود عفت و عصمت ہے،

حجۃ الوداع کے خطبہ مین عورتون کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فقرے ہین، اُن مین نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے، صحیح مسلم مین ہے،

واتقوا اللہ فی النساء فانھن	عورتون کے بارہ مین خدا سے ڈرو
عندکم عوان ولکم علیھن	کہ وہ تمھارے بس مین ہین، تمھارا
ان لا یوطئن فرشکم احدًا	انپر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے بستر
تکرھونہ فان فعلن فاضربوھن	کو کسی سے نہ روندوائین جس کو تم
ضربًا غیر مبرح،	ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کرین تو
(مسلم)	اُن کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو،

ابن ماجہ مین یہ الفاظ ہین،

استوصوا بالنساء خیرا فانھن	عورتون کے ساتھ نیک سلوک کرنے
عند کم عوانٍ لیس تملکون	کے بارہ مین میری وصیت کو قبول
منھن شیئاً غیر ذٰلک الا	کرو، وہ تمھارے قبضہ مین ہین، تم کو
ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ	اس کے سوا اُن پر کوئی اختیار نہین،
فان فعلن فاھجروھن	مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بیحیائی کا کام کرین، اگر
فی المضاجع واضربوھن	ایسا کرین تو انکو خوابگاہون مین علٰحدہ کردو،
ضرباً غیر مبرح فان اطعنکم	اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ
فلا تبغوا علیھن سبیلاً	نہ ہو، تو اگر وہ تمھارا کہا مان لین تو
(کتاب النکاح)	اُن پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو،

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر مین آنے جانے نہ پائین جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو، اور "کھلی بیحیائی" سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہین، لیکن بعض نے اس مین بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بد زبانی اور مشتبہ[1] چال چلن سب کو فاحشۃ مبینہ کی تفسیر مین داخل کیا ہے" (تفسیر سورۂ نساء رکوع ۳) الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات مین ہے، اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ "ضرب غیر مبرح" یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان

[1] یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت مین عورت کی اصلاح کے لئے ہے، ورنہ ثبوت کی صورت مین اس جرم کی سزا سنگ ساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے،

نہ پہنچے، بلکہ یہان تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے، (تفسیر طبری جلد ۵۔ ص۲۲ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آسکتی، ورنہ عورتون کو عام طور سے یون مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے ایاس بن عبداللہ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ "خدا کی بندیون (اپنی بیویون) کو مارا نہ کرو" تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہؐ بیویان اپنے شوہرون پر دلیر ہوگئین تو آپؐ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتین اہلبیتِ نبویؐ کے سامنے اپنے شوہرون کی شکایتین لیکر آئین، یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا "آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گرد بہت سی عورتین چکر کاٹتی رہین جو اپنے اپنے شوہرون کی شکایتین لے کر آئی تھین، یہ (یعنی بیویون سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم مین سے اچھے لوگ نہیں" (ابوداود و ابن ماجہ و دارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپؐ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہین اُتارتا"[1] یعنی وہ مارپیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا، ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دیدو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے، اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا تو اس کو سمجھایا کرو، اس مین صلاحیت ہوگی تو قبول کریگی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو[2]۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہین کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہمبستر ہو"[3]

[1] صحیح مسلم باب الطلاق ثلث، [2] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ ابوداؤد، [3] ایضاً بحوالہ صحیح بخاری و مسلم،

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شو کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلہ رحم" ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحیِ محمدیؐ میں اس کی طرف باربار توجہ دلائی گئی ہے، قرآنِ پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے، اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا،

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (روم-۴) تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کر،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ، (اسرائیل-۳) اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر،

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے،

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ (اور اصل نیکی اسکی ہے جس نے ....)

ذَوِی الْقُرْبٰی، (بقرہ - ۲۲) | اور مال کو اسکی محبت پر قرابت مندوں کو دے،

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ | فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں

وَالْاَقْرَبِیْنَ (بقرہ - ۲۶) | باپ اور رشتہ داروں کے لئے ...

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک خدا تعالیٰ کے اُن خاص احکام میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا،

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی | (اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا [illegible]

(بقرہ - ۱۰) | ہی کو پوجا) اور ماں باپ اور رشتہ دار

سورۂ نحل میں اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ | بے شک اللہ انصاف اور حسنِ سلوک

وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی، (نحل ۱۳) | اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے،

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ | کہدے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز

فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ | تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ،

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ، | قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں

(بقرہ - ۲۶) | کے لئے،

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے، تو اہلِ دولت کو زیبا نہین کہ وہ اسکی سزا مین اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لین، ارشاد ہوا،

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ	اور جو لوگ تم مین بڑائی اور کشایش
وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْا اُولِی	والے ہون وہ قرابت مندون
الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ، (نور ۳)	اور محتاجون کے دینے کی قسم نہ کھائین،

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا	اور اللہ کی عبادت کرو، اور کسی
بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ	چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ، اور ماں
اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی	باپ اور قرابت والے کے ساتھ
(نساء - ۶)	نیکی کرنا،

حقِ قرابت کو اسلام مین وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعیِ اسلام علیہ السلام اپنی ان تمام محنتون، زحمتون، تکلیفون اور مصیبتون کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق مین اُن کو پیش آئین اور اپنے اُس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہین، کہ رشتہ دارون اور قرابت مندون کا حق ادا کرو، اور اُن سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا،

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا	کہہ اے پیغمبر! کہ مین تم سے اس پر

اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ ۔ بجز اس کے کوئی مزدوری نہین مانگتا

(شوریٰ ۔ ۳) کہ ناتے مین محبت اور پیار کرو،

عربی زبان مین قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہین، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے، اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہین، کہ رحمِ مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے، کسی امر مین دو انسانون کا اشتراک اُن کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہین ہم عمری، کہین ہم درسی، کہین ہم سایگی، کہین ہم مذاقی، کہین ہم پیشگی، کہین ہم وطنی، کہین ہم قومی کی مختلف صورتون مین نمایان ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائضِ محبت کی ادائگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندہ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکون سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن، رحمِ مادر ہے، یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیون کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کردیتی ہے، اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لئے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانون پر سب سے زیادہ ضروری ہے،

ان لوگون کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کرین، وحیِ محمدیؐ نے **فاسق** کا خطاب دیا ہے، اور اُن کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے،

وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۔ اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ	جو خدا کا عہد باندھکر
مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ	توڑتے ہیں، اور خدا نے جس کے جوڑنے
مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖ اَنْ یُّوْصَلَ (بقرہ ۳)	کو کہا اس کو کاٹتے ہیں،

ایک حدیث مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانون کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ مین فرمائی ہے کہ رحم (شکمِ مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے، اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کرکے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا، اس کو مین نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو مین نے کاٹا"۔[1] اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یون ادا فرمایا کہ "رحمِ انسانی عرشِ الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے، "جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے، اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے"۔[2]

ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحمِ انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل مین حقوہ ہے) تھام لیا، خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہین کہ جو تجھ کو ملائے اس کو مین اپنے سے ملاؤن، جو تجھ کو کاٹے اس کو مین اپنے سے کاٹون"۔[3] یعنی رحمِ مادر اور اس رحمان کے رحم (و کرم) کے درمیان حرفون کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے، اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر مین اہلِ قرابت

---

[1] صحیح بخاری کتاب البر والصلۃ [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ [3] ایضاً

کی ہے،

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآنِ پاک کی ایک آیت مین بھی اشارہ ہے، سورۂ نساء مین فرمایا،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ	اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ،	دوسرے سے درخواست کرتے
(نسآء - ۱)	ہو اس کا، اور رشتون کا خیال رکھو،

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت مین لے جائے، فرمایا خدا کی بندگی کرو، کسی کو اسکا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا کرو[۱]۔

جبیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا[۲] (یعنی جنت مین اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا، جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

ابوہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی مین وسعت اور اس کی عمر مین برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلۂ رحمی

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم [۲] ایضاً باب اثم القاطع،

کرے۔[1] اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت مین فراخی اور عمر مین زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتین ہین، ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ دارون کی مالی مدد کی جائے دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر مین سے کچھ حصہ اُن کی خدمت مین صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی، اور دوسرے کا نتیجہ عمر مین برکت اور زیادتی کی صورت مین ملتا ہے،

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے۔ انسان کے خانگی انکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لئے اضمحلال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہین، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والون کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلۂ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہین، ان کی زندگی مین خانگی مسرت، انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے، جس کی وجہ سے اُن کی دولت اور عمر دونون مین برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی مین یہ حدیث ان لفظون مین ہے: "صلۂ رحم سے قرابت والون مین محبت، مال مین کثرت اور عمر مین برکت ہوتی ہے"

احادیث مین اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہین ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے، بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے،[2] یعنی جو قرابت کا حق ادا نہین کرتے ہین ان کا حق ادا کیا جائے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق بصلۃ الرحم [2] ایضاً باب لیس الواصل بالمکافی،

ہمسایے کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہین، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہین، انسانیت اور اس کے تمدُّن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا مین ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے مین سے اُس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے، اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانون کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریون کی گرہ مین بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادّی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علٰحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا، اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لئے ہر مذہب نے ان دونون انسانون پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہون، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اورون سے پہلے ایک دوسرے کی مدد

کو پہنچ سکتے ہین،

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اُسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہین، اس لئے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہی تاکہ برائیون کا سدِ باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو، اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کرکے گھر سے باہر نکلے، اور گھر مین قدم رکھے،

اسلام نے انہی اصولون کو سامنے رکھ کر ہمسائگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہین، عربون مین دوسری قومون سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لئے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا، اور اس لئے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا اسلام نے آکر عربون کے اس احساس کو چند ترمیمون اور اصلاحون کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا،

وحیِ محمدیؐ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے، جن کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہین کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائگی ہے، اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے ان سب قسمون

کے ہمسایون مین تقدم اُس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوسرا تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہی،

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ (نساء - ٦)

اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنون مین اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار و عزیز، اور "بیگانہ" کے معنی غیر اور اجنبی کے ہین، دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہین، اور "دور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہین، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ[1]، لیکن حقیقت مین یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمدی کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیون اور ہمسایون مین اُن کو ترجیح دیجائیگی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو، یا ہم مذہبی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے،

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقون سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع مین آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا" خدا کی قسم وہ

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور،

مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا" جان نثارون نے پوچھا "کون یا رسول اللہ!" فرمایا "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتون سے محفوظ نہین[1]" ایک اور موقع پر آپنے فرمایا "جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[2]" ایک اور حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا "جو شخص خدا اور روزِ جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے[3]"

ایک اور موقع پر اس کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیون مین بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہے، اور پڑوسیون مین بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے[4]" ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ مین سمجھا کہ کہین ان کو وراثت کا حق نہ دلا دین[5]" حقیقت مین یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایون کا تعلق رشتہ دارون کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے،

پڑوسیون مین محبت کی ترقی، اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیون اور تحفون کا تبادلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویون کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہین تو مین ان مین سے کس کے پاس بھیجون" فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمھارے گھر سے زیادہ قریب ہو[6]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ [2] صحیح بخاری کتاب الادب [3] صحیح بخاری کتاب الادب [4] ترمذی ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی حق الجار [5] صحیح بخاری کتاب الادب [6] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب،

اس ہدیہ اور تحفہ کے لئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہین، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزین بھی اس کے لئے کافی ہین، کچھ نہ ہوسکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو، اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیون نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ "اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو، اور اس سے اپنے ہمسایون کی خبر گیری کرتے رہو[1]"

ان تحفون کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتون کو پیش آتا ہے، اس لئے آپ نے خصوصیت کے ساتھ عورتون کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے مسلمانون کی بیویو! تم مین کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھر ہی کیون نہ ہو[2]" یہ نصیحت دونون بیویون کے لئے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے، اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اس کی حقارت کرے،

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہین کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن وہ نہین جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو مین بھوکا رہے[3]"

برائی برائی ہے جہان بھی ہو، اور گناہ گناہ ہے جہان بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہان لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہون اور برائیون سے بدرجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب الوصیۃ بالجار [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا [3] مشکوۃ از بیہقی و ادب المفرد امام بخاری باب لایشبع دون جارہ

مگر ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان مین چوری کرنا کتنا برا ہے، بدکاری ہر جگہ اُس سے ممکن ہے، مگر پڑوس کے گھر مین جہان سے دن رات کی آمد و رفت ہے، اور جہان کے مرد پڑوس کے شریف مردون پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہین، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے، اسی لئے توراۃ مین یہ حکم تھا،

"تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام، اور اسکی لونڈی، اور اس کے بیل، اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ نہ کر" (خروج ۲۰-۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے، دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے" (احبار ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ مین فرمائی، جن مین توراۃ کی طرح صرف ممانعت پر بس نہین کی ہے، بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کرکے دکھایا، ایک سوال کے جواب مین فرمایا،

"زنا حرام ہے، خدا و رسول نے اُس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریون سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، خدا و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھرون مین چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے"[1]

دو صحابیہ تھین جن مین سے ایک رات بھر نمازین پڑھا کرتین، دن کو روزے

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار،

رکھتین، صدقہ وخیرات بھی بہت کرتین، مگر زبان کی تیز تھین، زبان سے پڑوسیون کو ستاتی تھین لوگون نے اُن کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا، اُن مین کوئی نیکی نہین، اُن کو دوزخ کی سزا ملیگی، پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتین، اور معمولی صدقہ دے دیتین، مگر کسی کو ستاتی نہ تھین، فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی[1]"

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا،

تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو، (مرقس ۱۲-۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم مین نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت، یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے،

"تم مین کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لئے پیار رکھتا ہے[2]"

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہین، بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا،

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے[3]"

اسی لئے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی مین سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ

[1] ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان [3] مشکوۃ از بیہقی،

پیش ہون گے، جو پڑوسی ہون گے، انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اُس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ہمین کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہین یا بُرا، فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سُنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو، اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔[۱]

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بدلہ مین تم اُس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہی عرض کی، فرمایا جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ مین ڈال دو، (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) اُن صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والون نے پوچھا بات کیا ہے، انھون نے حقیقتِ حال بتائی، سب نے اُن کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ اُن کو منا کر پھر گھر مین واپس لایا، اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا۔[۲]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گذار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہین، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیرالمومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت

---

[۱] احمد بن حنبل، مسند عقبہ بن عامر [۲] سنن ابن ماجہ [۳] ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار،

خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی[۱]،

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا	جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے
عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ	(اُن سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے
فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ	اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور
بِهَا، (احقاف-۲)	اس سے فائدہ اٹھا چکے،

غور کرو کہ گوشت کا وہ تھوڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو، دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جس کے مواخذہ کا اُن کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم وغیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، اُن کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبرئیل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اُس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنادیں گے[۲]،

---

[۱] موطا امام مالک باب ما جاء فی اکل اللحم [۲] ابو داؤد، کتاب الادب باب حق الجوار،

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبت مین لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اُس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیون کی حفاظت اور اُن کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہین جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا،

عربون مین روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیمون کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہئے اُن کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچون کو وہ وراثت نہین دیا کرتے تھے[1]، اور نہ سنگدل عربون مین عام طور سے اُن کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک مین اُن کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے،

[1] تفسیر ابن جریر طبری، سورۂ نساء ج ۴ صفحہ ۱۷۱،

اَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ	کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو
بِالدِّيْنِ، فَذٰلِكَ الَّذِيْ	جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو
يَدُعُّ الْيَتِيْمَ، (ماعون)	دھکے دیتا ہے،

ایک اور آیت مین اُن متوتیون کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیمون کے جوان ہوجانے کے ڈر سے ان کے باپون کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہین،

كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ،	نہین یہ بات نہین، بلکہ تم یتیم کی عزت
وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ	نہین کرتے، اور نہ ایک دوسرے
الْمِسْكِيْنِ، وَتَاْكُلُوْنَ	کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو،
التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا، وَتُحِبُّوْنَ	اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا
الْمَالَ حُبًّا جَمًّا،	جاتے ہو، اور دنیا کے مال و دولت
(الفجر-۱)	پر جی بھر کر ریجھتے ہو،

اسلام سے پہلے کے مذاہب مین اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور اُن کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ مین عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین مین دوسرے لوگون کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہون وہ آئین اور کھائین اور سیر ہون" (استثناء ۱۴-۲۹ و ۲۶-۱۲) انجیل نے ان بیچارون کی کوئی دادرسی نہین کی ہے، اور نہ کسی تعلیم مین اُن کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اُس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لیکر

دنیا مین آیا، وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کرکے یاد دلادیا،

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝	کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہین پایا، تو اُس
..... فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا	نے پناہ دی .... تو
تَقْهَرْ ، (الضحیٰ)	یتیم کو نہ دبا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ مین بے بسی کے عالم مین رہے، یتیمون کے متعلق اخلاقی ہدایتین فرماتے رہے، اور قریش کے جفا پیشہ رئیسون کو اس بیکس گروہ پر رحم وکرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتون مین یہ تعلیمات وحی ہوتی رہین، دولتمندون کو غریبون کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ مین فرمایا گیا، کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کرسکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتارون کی گردن کو چھڑا کر، بھوکون کو کھلاکر اور یتیمون کی خدمت کرکے،

اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ	یا بھوک والے دن مین کسی رشتہ دار
مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (بلد-۱)	یتیم کو کھلانا،

نیکون اور نیک بختون کی تعریف مین فرمایا، کہ یہ وہ ہین جو

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی	اور اُس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی
حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا ، (دھر-۱)	غریب اور یتیم کو کھلاتے ہین،

مدینہ مین آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتون نے قانون کی صورت اختیار کی، سورۂ نسا مین اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، اُن کو وراثت کا حق دلایا گیا، اور

متولی جو جاہلیت مین طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، اُن سے کہا گیا،

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا	اور یتیمون کو اُن کے وارثون کا چھوڑا
تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ	ہوا مال دے دو، اور اُن کے اچھے
وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ	مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ
اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا	کرو، اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر
كَبِیْرًا ، (نساء-۱)	اُن کا مال کھاجاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے

دولتمند یتیم لڑکیون کو اُن کی جائداد پر قبضہ کرلینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح مین لے آتے تھے، اور بے والی ووارث جان کر اُن کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا،

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی	اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیون کے حق
الْیَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ	مین انصاف نہ کرسکو گے تو (اُن کو
مِّنَ النِّسَآءِ ،	چھوڑ اور) عورتون سے جو تمھین پسند
(نساء-۱)	ہو نکاح کرلو،

یتیم بچون کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہین کردینا چاہیے، اور نہ جب تک اُن کو پورا شعور آئے، وہ اُن کے سپرد کیا جائے، بلکہ اُن کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد اُن کی عقل کو دیکھ بھال کر اُن کی یہ امانت اُن کو واپس کی جائے، فرمایا،

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ	اور بے وقوفون کو اپنے مال جس کو
الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا	خدا نے تمھارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے

وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ	ـ بگڑا دو، اور اُن کو کھلاتے اور پہناتے
وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔	رہو، اور اُن سے معقول بات کہو،
وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا	اور یتیمون کو جانچتے رہو جب وہ
النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ	نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچین تو اُن مین
رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ	اگر ہوشیاری دیکھو تو اُن کا مال اُن کے
اَمْوَالَهُمْ ج (نساء-۱)	حوالہ کر دو،

ان آیاتِ پاک مین بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع مین جہان متولیون کو ناسمجھ یتیمون کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہان مال کی نسبت متولیون کی طرف کی ہے، کہ "تم اپنا مال اُن کو نہ دو" اور آیت کے آخر مین جہان بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیون کو یتیمون کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہان اُس مال کی نسبت یتیمون کی طرف کی گئی کہ "تم اُن کا مال اُن کو واپس کر دو" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیون کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی، اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چُن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہین،

متولیون کو جو یتیمون کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھین، اس بد دیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی،

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ	اور اڑا کر اور جلدی کر کے اُن کا مال
بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ (نسآء-۱)	نہ کھا جاؤ کہ کہین یہ بڑے نہ ہو جائین،

صاحب جائداد یتیمون کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہون، تو اُن کے لئے ان یتیمون کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا، اور اگر تنگدست ہون تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی،

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ	اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو
وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ	چاہئے کہ بچتا رہے، اور جو محتاج ہو
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ (نسآء-۱)	تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے،

اور آخرین یہ جامع تعلیم دی گئی،

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ	اور یہ کہ یتیمون کے لئے انصاف
(نسآء-۱۹)	پر قائم رہو،

سورۂ انعام مین یہودیون کی ظاہری شریعت نوازی، اور جانورون کی حلّت و حرمت مین بے معنی جزئیات پرستی، اور روحانی گناہون سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، اُن مین ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا	اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے
بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ	مال کے پاس نہ جاؤ، یہانتک کہ وہ
اَشُدَّهٗ ۚ (انعام-۱۹)	اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے،

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول مین سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائداد یتیمون کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ بھٹکنا چاہیے، اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے (سورۂ اسراء)

یہ تو صاحب جائداد یتیمون کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب و مفلس ہون، اُن کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانون کا فرض ہے، چنانچہ قرآنِ پاک نے بقرہ، نساء، انفال، اور حشر مین بار بار اُن کی پرورش اور اُن کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے،

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح مین بے والی ووارث اُمت کے سرپرست (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امت کے اُن نیک دلون کو جو بے والی و وارث یتیمون کے کفیل ہون، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا" مین اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت مین یون دو انگلیون کی طرح قریب ہون گے[1]" یہ بھی فرمایا کہ" جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اُس کو کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اُس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشایش کے لائق نہ ہو[2]" نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانون کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس مین کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے اور

[1] صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیماً و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم [2] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲ و ص ۱۳۳، بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح)

سب سے بدتر گھر وہ ہے جس مین کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کیجاتی ہو[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتوان یتیمون کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے، اور ہر ایک اُس کی پرورش اور کفالت کے لئے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا، بدر کے یتیمون کے مقابلہ مین جگر گوشۂ رسول فاطمہ بتول اپنے دعوی کو اٹھا لیتی ہین[2] حضرت عائشہ صدیقہ اپنے خاندان[3] اور انصار وغیرہ[4] کی یتیم لڑکیون کو اپنے گھر لیجا کر دل و جان سے پالتی ہین، حضرت عبداللہ بن عمر صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہین کھاتے تھے[5]

صحابہ نے صرف یہی نہین کیا کہ یتیمون کو اُن کا حصہ دینے اور اُن کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی مین دیانتداری برتنے لگے بلکہ ان کی جائدادون کی حفاظت مین فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت مین ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعوی پیش کیا، مگر وہ دعوی ثابت نہ ہو سکا، اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا، اور اُس مدعا علیہ

---

[1] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ بحوالۂ ابن ماجہ، و ادب المفرد باب من یعول یتیما [2] صحیح بخاری باب عمرۃ القضا [3] ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس [4] موطا امام مالک کتاب الزکوۃ زکوۃ اموال الیتیمی و زکوۃ الحلی و کتاب الطلاق [5] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۶۹ [6] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی، و مسند جلد ۶ صفحہ ۳۱ [7] ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیما،

سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو، خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا، وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابو الدحداحؓ صحابی حاضر تھے، انھون نے اُس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلان باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمادگی ظاہر کی، انھون نے فوراً بدل دیا، اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا،[1]

آج دنیا کے شہر شہر مین یتیم خانے قائم ہین، مگر اگر یہ سوال کیا جائے، کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی مین ملیگا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے جہان کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہان جہان مسلمانون نے اپنی حکومتون کی بنیادین ڈالین، ساتھ ساتھ ان مظلومون کے لئے بھی امن و راحت کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائدادین وقف کین،[2] اور دنیا مین ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی، اور قانوناً اپنے قاضیون کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیمون کے سرپرست ہون، اُنکی جائدادون کی نگرانی، اُن کے معاملات کی دیکھ بھال اور اُنکی شادی بیاہ کا انتظام کرین،[3] اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکون مین کیجاتی ہے، اور لندن کے لارڈ میر یا آرفنس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیون کے ان فرائض کی نقل کرتے ہین،

السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابون مین قاضیون کے یہ فرائض لکھے ہین، قاضیون کو ولایت کی نسبت فقہا نے شرائط لگائے وقت تخصیص کے ساتھ ان کی تصریح ہوئی تھی، ۱۲

[1] استیعاب ابن عبد البر تذکرہ ابوالدحداحؓ [2] تاریخ اسلام مین یہ واقعات مذکور ہین [3] حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا

بیوہ کیساتھ حُسنِ سلوک

یتیمون کے بعد اصنافِ انسانی مین سب سے ناچار اور ناتوان گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہرون کے سایہ سے محروم کر دیا ہے، اب وہ بے یار و مددگار، اور بے مونس و غمخوار ہین، نہ اُن کے کھانے پینے کا کہین سہارا ہے، اور نہ اُن کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے، عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا، اور اس کی ذمہ داری اُس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی، اب وہ ناچار اُن سے دُوچار ہے، اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر، نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے، بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہین، اور موقع کی تاک مین رہتے ہین، دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعین کافی سے زیادہ ثبوت ہین،

یہودی مذہب مین بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اُس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی، وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا، عورت کی

مرضی کو اس زن وشوئی کے مجبورانہ تعلق مین کوئی دخل نہ تھا، عیسوی مذہب مین یہ جبری قانون تو جاتا رہا، مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کرسکا، ہندؤن مین اب اس کی زندگی کی ضرورت نہین سمجھی جاتی تھی، اب اُس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہئے، اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرایشون اور لذتون سے علحدہ ہوکر ساری عمر سوگ مین گذار دے، عربون مین رواج یہ تھا کہ وہ شوہرون کے وارثون کی ملکیت بن جاتی تھی، اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کرسکتے تھے، اس کو تکلیفین دے دے کر اس سے دینِ مہر معاف کراتے تھے، اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہین شادی نہین کرنے دیتے تھے،

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریادرسی ہوئی، اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کردیا، اور صرف اتنی مدت تک کے لئے رکھا جس مین تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہوسکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہین، اس کے لئے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی، اور اس کا نام **عدت** رکھا، یعنی "شمار کے دن" اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اُس کو ہر قسم کے جائز زیب وآرایش کی اجازت دے دی، اس کا دینِ مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ مین سب سے اوّل ضروری ٹھہرایا، پھر اس ترکہ مین سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھوان حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا، عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری

آزادی بخشی، اور اس کے سرسے دیورون اور شوہر کے دوسرے عزیزون کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع وقمع کردیا، اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق، بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا،

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اسکو اورون نے نکال دیا ہے، اس مین دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے، اور جس مہرو عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ مین صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہین کی، بلکہ مسلمانون کو صریحًا یہ حکم دیا،

وَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ، اور اپنے مین سے بے شوہر والی عورتون کا نکاح کردو، (نور-۴)

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی، اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہین، اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ نے پچیس برس کی عمر مین چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی، اور پچیس برس تک اس طرح اُس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا مین کوئی دوسرا نکاح نہین کیا، اُن کی وفات کے بعد وقتًا فوقتًا دس عورتون سے نکاح کئے،

جن میں سے آٹھ حضرت سودہ، حفصہؓ، زینبؓ ام المساکین، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپؐ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا، اور اس طرح اپنے پیروون کے لئے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا، یہ تو آپ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپؐ نے ایسی نیکی قرار دیا، کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والا بآسانی کر سکتا ہے''

الساعی علی الارملۃ	بیوہ اور مسکین کیلئے دوڑ دھوپ کرنے
والمسکین کالساعی فی	والا ایسا ہی جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا
سبیل اللہ واحسبہ	(اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں
قال کالقائم لا یفتر،	کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی
وکالصائم لا یفطر[1]	جو نماز سے نہیں تھکتا، اور وہ روزہ دار
	جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا،

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں،

الساعی علی الارملۃ والمسکین	بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ
کالمجاھد فی سبیل اللہ	کرنے والا، خدا کی راہ کے مجاہد کی
وکالذی یصوم النھار	طرح ہے، اور اس کے برابر ہی جو

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و مؤطا امام مالک بحوالۂ مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق،

ويقوم الليل، (كتاب الآداب)   دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں، اور اس لئے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر اُن سے علیحدہ نہ ہو جائیں، اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا، "میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے، یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مر جائیں[۲]"۔ اسی مقصد کو ابو یعلی کی مسند میں ہے کہ آپ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے، تو وہ کہیگی، کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے[۳] تھے"۔

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیما [۲] حاشیہ سنن ابی داؤد بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبد اللہ ابن نور الدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ،

حاجتمندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحبِ دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اُس کو دوسروں کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے، اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لئے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے، اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجتمند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے، اور نہ یہ سمجھے کہ اُنکو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی،

قرآنِ پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے،

فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ (ذاریات-۱)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لئے حق ہے،
فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ، (معارج-۱)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کیلئے مقررہ حق ہے

سائل، مانگنے والے کو کہتے ہیں، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف

"بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہین ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو، محروم کی تشریح مین اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اس کو محروم کہتے ہین، جس کا مالِ غنیمت مین کوئی حصہ نہین، کسی نے اس کے ظاہر معنی لئے ہین کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو، اور اب وہ دوسرون کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو، اسی معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآنِ پاک[1] سے ہوتی ہے،

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے، یا عام صدقہ، مفسرین دونون آیتون مین دونون طرف گئے ہین، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات مین جس مین مطلق "حق" کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج مین جس مین مطلق "حق" کا نہین، بلکہ "مقررہ حق" کا بیان ہے، "زکوٰۃ" مراد ہو، کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہین، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجتمندون کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونون طرح سے مدد مسلمانون کے حقوق مین سے ایک حق ہے،

قرآنِ پاک مین دوسرے موقع پر ہے،

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ، (ضحیٰ-۱) — اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر،

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف اور تفسیر ابن جریر مین سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ اور سورۂ قلم مین اصحاب الجنۃ کے قصہ مین محرومون اور سورۂ واقعہ مین بل نحن محرومون کے معنی،

یہاں "سوال کرنے والے" کے معنی غنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم، وسعت کو چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورتمند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو[1]، یہانتک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت مین ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو، اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو،

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً	جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو
يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ	اس کے ثواب مین اس کا بھی حصہ
مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً	ہوگا، اور جو بری بات کی سفارش
يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۚ وَكَانَ	کرے گا تو اس کے گناہ مین وہ بھی
اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ،	حصہ پائے گا، اور اللہ ہے ہر چیز
(نساء - ۱۱)	کا نگہبان،

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم ونسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ مین ہے، یعنی

[1] طبری مین ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے واما من سائلک من ذی حاجۃ فلا تنھر زمخشری نے کشاف مین لکھا ہے کہ بعضون نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے،

اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ مین اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام مین اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے، تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے، اور اس مین یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جد وجہد مین جتنا حصہ بھی لیا جائے، حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب مین شریک ہوگا، ایسا ہی برے کام کی جد وجہد مین حصہ لینا اس کے گناہ مین شریک ہونا ہے،

ایک اور آیت مین ارشاد ہے،

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی	اور نیکی اور پرہیزگاری کے کامون
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ	مین ایک دوسرے کی مدد کیا کرو،
الْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ	اور گناہ اور زیادتی کے کامون مین
اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ،	ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو اور
(مائدہ-۱)	ڈرو اللہ سے، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجتمندون کی حاجت برآری ضرورت مندون کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمھاری طاقت مین ہو تو وہ اس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے،

من کان فی حاجۃ اخیہ	جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری

کان اللہ فی حاجتہ ومن	کرنے مین لگا رہیگا، توخدا اسکی ضرورت
فرج عن مسلم کربۃ فرج	پوری کرنے مین لگا رہے گا، اور جو کسی
اللہ عنہ کربۃ من کربات	مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا
یوم القیامۃ،	تو اللہ قیامت کی مصیبتون مین سے
(صحیحین)	کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائیگا،

ایک دوسری روایت مین ہے کہ فرمایا،

واللہ فی عون عبدہ ما	اللہ اپنے بندہ کی مدد مین اس وقت
کان العبد فی عون اخیہ	تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے
(ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)	بھائی کی مدد مین رہتا ہے،

صحیح بخاری مین ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمھین بھی ثواب ملیگا[1]، ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہوسکے تو بیکس حاجتمند کی مدد ہی کیا کرو[2]، یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے[3]، یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلتے مین کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالی اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے، اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے[4]،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ [2] ایضاً باب کل معروف صدقۃ [3] ترمذی کتاب البر والصلۃ [4] ایضاً،

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیون کا مستحق ہے، بیمارون اور مریضون کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت مین اپنی خبرگیری اور خدمت آپ نہین کرسکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانون کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے، اور اس فرض کا نام عربی مین "عیادت"[1] ہے،

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہین یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت مین دیکھنے کو جانا، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں، اور اس کی تیمارداری، غمخواری، اور خدمت گذاری کے بھی ہیں، بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادۃ کی معمولی قسم ہے اس سے بڑھکر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری، اور خدمت گذاری کرے، عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا، کہتا ہے،

ذهب الرقاد فما يحس رقاد   مما شجاك ونامت العواد

مجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی، اور عیادت کرنے والے سو گئے

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیماردار اور خدمت گذار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت مین جاگتے رہتے ہین، یہان تک کہ ان کی کئی کئی راتیں جاگتے کٹ جاتی ہیں لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے، اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے، اور وہ سو جاتے ہیں اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا، اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت میں خدمت گذاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں، اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہو گا،

ان بیارون کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہین، یا جن کے ادا کرنے سے اُنکی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، اُن کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے، اور قرآن نے اس کے لئے ایک کلی اصول بنا دیا ہے،

وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ۔ (نور-۳)	اور نہ بیار پر کوئی تنگی ہے،
لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد مین
عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى	شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ
الْمَرِيضِ حَرَجٌ، (فتح-۲)	بیار پر،
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى	نہ کمزورون پر اور نہ بیارون پر (جہاد
الْمَرْضَىٰ، (توبہ-۱۲)	کے عدم شرکت کی بازپرس ہے)

بیارون کے لئے وضو معاف ہے، وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ (یا تم بیار ہو تو تیمم کرو) (مائدہ-۲) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازین معاف ہین، عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَىٰ (خدا کو معلوم تھا کہ تم مین کچھ بیار بھی ہون گے) (مزمل-۲) اسی طرح حج کے احکام مین بھی بیار کے لئے رعایت فرمائی گئی، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا (تو تم مین جو بیار ہو) (بقرہ-۲۴) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندون کو کس حد تک اُن سے

اپنے اخلاقی مطالبہ مین کمی کر دینی چاہئے،

اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت مین غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے،

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا مین جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، وہ اُس کے گناہون کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفون کو برداشت کرے تو آخرت کے عذابِ شدید سے بچانے کے لئے وہ اُس کے گناہون کا معاوضہ بن جاتی ہین، اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے[1]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیمارون کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کئے ہین، اس کی دعائین سکھائی ہین، اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا، خدا اُس[2] کے غم کو ہلکا کرے گا، اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہین، جن مین ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اسکی عیادت کرے[3]، صحابہ کہتے ہین کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتون کا حکم دیا تھا، جن مین سے ایک بیمار کی عیادت[4] ہے، ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہین، اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لئے بارگاہِ الٰہی مین دعا کرتے ہین،[5] یہ بھی

---

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابی داؤد، اوائل کتاب الجنائز [2] ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] ایضاً [5] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز،

آیا ہے کہ "جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے"[1] فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کیلئے جائے تو اُس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اُس کو تسلّی اور دلاسا دے، اور اس کو شفا پانے کے لئے خدا سے دعا کرے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ مین مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپنے یہودیون کی عیادت فرمائی ہے[3]، منافقون کی عیادت کو تشریف لے گئے ہین[4] اور اسی سے علمانے غیر مسلمون کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے[5]۔

حضرت سعد بن معاذ جب زخمی ہوے تو آپنے اُن کا خیمہ مسجد مین نصب فرمایا، تاکہ بار بار اُن کی عیادت کی جاسکے[6]، رفیدہؓ ایک صحابیہ تھین جو ثواب کی خاطر زخمیون کا علاج اور اُن کی خدمت کیا کرتی تھین، اُن کا خیمہ بھی اسی مسجد مین رہتا تھا، تاکہ لڑائیون کے مسلمان زخمیون کی تیمارداری اور مرہم پٹی کرین[7]، غزوات اور لڑائیون مین بھی بعض ایسی بی بیان فوج کے ساتھ رہتی تھین جو بیمارون کی خدمت اور زخمیون کی مرہم پٹی کرتی تھیں[8]،

آپ نے اپنے پیروون کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ، اور بیمار کی عیادت کرو[9]"،

---

[1] صحیح مسلم باب عیادۃ المریض، بطرق مختلفہ [2] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] ایضاً [5] مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ [6] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز [7] سیرۃ ابن ہشام، غزوہ بنی قریظہ وادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت واصابہ ابن حجر وغیرہ مین حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھیے [8] صحیح مسلم، غزوۃ النساء [9] مسند احمد صفحہ ۲۹۴، ۴

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ "اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی" وہ کہیگا "اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیونکر کرتا" فرمائے گا "کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا، مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا[1]"

تعلیم کی یہ طرز ادا بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے، اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے، اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے، اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماروں کی خدمت کرکے خدا کا قرب پاتے ہیں،

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتوان طبقوں مین غلامون کی بھی ایک جماعت ہے،
ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قومون نے ہمیشہ
مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیرون مین جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بنکر عیش و راحت،
سیر و تفریح، اور حکومت و شہنشاہی کے کام کئے، اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری
اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لئے، ہندوؤن مین اچھوت قومین اسی کی
یادگار ہین، مصریون مین قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیون مین غیر رومی اسی
غلامی اور مشقت و محنت کے کامون مین مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربون مین بھی
اُن کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربون مین قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی
قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیون کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا، کیونکہ اس کو
اپنی حفاظت کے لئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز مین ظالم قریشیون
نے جن لوگون پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے،

اسلام زیر دستون کی مدد اور کمزورون کی حمایت مین اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاہدۂ فضول مین شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیر دستون کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسون سے پہلے قریش کے غلامون اور کنیزون نے لبیک کہا، چنانچہ زیدؓ بن حارثہ، خبابؓ بن الارت، بلال حبشیؓ، یاسر یمنیؓ، عمارؓ، صہیبؓ رومی، ابو فکیہہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور سالمؓ غلامون مین اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ، اور سمیہؓ لونڈیون مین سب سے پہلے اسلام کے آغوش مین آئین، اور زیدؓ بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ مین پرورش پارہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت مین سخت سے سخت کڑیان جھیلین، اور بعض نے اسی راہ مین اپنی جانین بھی دین،

اسلام نے غلامون کی آزادی اور اُن کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزو بنالیا تھا، غلامون کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد مین جو مکہ مین نازل ہوتی تھی، جن کامون کو "گھاٹی" بتایا گیا ہے، اُن مین ایک فَکُّ رَقَبَۃٍ "گردن سے غلامی کی رسّی کو کھولنا" بھی ہے، چنانچہ مکہ کی پُرخطر زندگی مین بھی حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہلِ ثروت مسلمانون نے بہت سے غلامون کو کافرون سے خرید خرید کر آزاد کردیا تھا،

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا، تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ یعنی گردن کو آزاد کرنا،

بہت سی فروگذاشتون کا کفارہ قرار پایا، اور غلامون کے آزاد کرنے کے لئے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز مین غلامون کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی، حضرت حکیم بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہین اسلام کے بعد سو غلام آزاد کئے[1]، حضرت عائشہ نے صرف ایک قسم کے کفارہ مین چالیس غلام آزاد کئے[2]، حضرت عبد اللہ بن عمر نے ایک ہزار اور حضرت عبد الرحمان بن عوف نے تیس ہزار غلامون کو آزادی کی نعمت عطا کی[3]،

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اُس کے بندون کے ساتھ نیکی کی جائے، ان بندون مین سرِ فہرست جن لوگون کے نام ہین، اُن مین یہ مظلوم فرقہ بھی ہے، فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا	اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی
بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ	نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی
اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى	کرو، اور رشتہ والے کے ساتھ اور یتیمون
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ	کے ساتھ، اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ
الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ	پڑوسی کے ساتھ، اور پہلو کے رفیق
الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ	کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ اور

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرۃ [3] یہ دونون تعدادین امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق مین نقل کی ہین،

وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ	اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ
اَيْمَانُكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ	مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور
مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا،	اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں
(نساء - ۶)	کرتا،

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے، بلکہ فتای میرا جوان کہے، اور اسی طرح غلامون کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤن کو ربّ نہ کہین، بلکہ مولیٰ کہین [1] اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا، اور فرمایا کہ یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہین، جن کو خدا نے تمہارے تحت مین کر دیا ہے، پس جس کو خدا نے تمہارے تحت مین کر دیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو، اور اس کو اتنا کام نہ دے دو، جو اُس پر بھاری ہو جائے، اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام مین خود بھی شریک ہو کر اُس کی مدد کرے [2] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ اُن کے غلامون اور آقاؤن کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی [3]، ان بے خانمان افراد کو اُن کے آقاؤن کے گھرون کا غلام بنا کر نہین، بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا، کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ما ینہی عن السباب،
[3] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ما ینہی عن السباب،

اسی کے علاقہ مندون (موالی) مین شمار ہوگا[1]، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ مین اپنے فوجی افسرون کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہوگئے ہون اُن کو اُن کے قدیم آقاؤن کے خاندانون مین شمار کرو، جو اُن کا حق ہو وہ اِن کا ہو، اور اگر یہ غلام چاہین تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالین[2]، ان تعلیمات نے ان غلامون کو غلام نہین، بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتون کا بادشاہ بنادیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آیندہ جلد مین اپنے مناسب موقع پر آئے گی،

---

[1] حدیث مین ہے انما الولاء لمن اعتق، ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے، دوسری حدیث مین ادا انتمیٰ الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت، امام نودی شرح مین لکھتے ہین بل ھو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے، (صحیح مسلم کتاب العتق) [2] کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر، ص ۲۲۵

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدّن مین گو مہمانی کی زحمت ہوٹلون اور ریسٹرانون نے اپنے سرلے لی ہے، مگر گذشتہ نظامِ تمدّن مین اس کی جگہ نہایت اہم تھی، اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدّن کے خمیر مین داخل ہے، اور مغربی تمدّن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ سوسائٹی کے نظام مین اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کرینگے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گذشتہ مذاہب کے اخلاق مین مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہین، لیکن اہلِ عرب مین مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا،

قرآن مجید مین حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مہمانون کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتون مین آیا ہے،

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ
اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝
اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا
سَلٰمًا، قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ
مُّنْكَرُوْنَ، فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ
فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ، فَقَرَّبَهٗٓ
اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ،
فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً،
قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ
بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝

(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانون کی حکایت
بھی تم تک پہنچی ہی؟ کہ جب (یہ لوگ)
اُن کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک
کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا،
(اور دل مین کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ)
اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہین، پھر جلدی
سے اپنے گھر جا (ایک) موٹا تازہ بچھڑا
(یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانون کیلئے)
لائے اور ان کے سامنے رکھا تو انھون
نے تامل کیا، (ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے
کیون نہین (اس پر بھی انھون نے کھانے
سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی
جی مین ڈرے، انھون نے (انکی یہ حالت
دیکھکر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں،
(اور انکو ایک صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی،

(ذاریات-۲)

اس حکایت سے آداب مہمانداری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہین،

(۱) مہمان اور میزبان مین کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیئے،

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیئے، کیونکہ "رَاغَ" کے معنی سرعت

کے ہین،

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہون سے دیکھنے کے بھی ہین، اس لئے مہمانون کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر اُن کی نگاہ بچا کر کرنا چاہئے، کیونکہ اگر مہمانون کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لئے کچھ سامان کیا جا رہا ہے، تو وہ ازراہِ تکلف اس کو روکین گے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہین کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے،

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے مہمانون سے الگ ہو جانا چاہئے، تاکہ اُن کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے مین تکلیف نہ ہو، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے اُن سے الگ ہو گئے،

(۵) مہمانون کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا،

(۶) کھانا مہمانون کے سامنے پیش کرنا چاہئے، اُن کو کھانے کا حکم نہین دینا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ کیون نہین کھاتے، یہ نہین کہا کہ آپ لوگ کھائیے،

(۷) مہمانون کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے، کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہین وہ کھانا تو مہمانون کے سامنے پیش کر دیتے ہین، لیکن اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے، کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اور اُن کے اہل وعیال

کے کام آئے، اسی لئے جب اُن لوگون نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور اُن کے دل مین خطرہ پیدا ہوا، کہ یہ دشمن بن کر تو نہین آئے ہین،

(۸)، نہ کھانے کی حالت مین مہمانون کو عمدہ الفاظ مین عذر کرنا چاہئے، اسی لئے ان فرشتون نے کہا کہ اگر ہم نہین کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ہم لوگ کھا ہی نہین سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لئے آئے ہین،

سورۂ حجر مین حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتون کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسایش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لئے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتون کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے

قَالَ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا	کہا یہ میرے مہمان ہین تو ان کے بارے
تَفْضَحُوْنِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا	مین) مجھ کو فضیحت نہ کرو، اور خدا سے
تُخْزُوْنِ ، (حجر - ۵)	ڈرو، اور مجھے رسوا نہ کرو،

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق مین مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک

جزو قرار دیا، اور فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے، اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے" کہا گیا کہ یا رسول اللہؐ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ "ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا"[1] نیز فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے"[2]۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا بیشک، فرمایا ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمان کا حق ہے، اور تمہاری بی بی کا حق ہے[3]۔

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے، چاہے چھوڑ دے"[4]۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ [2] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین [3] بخاری کتاب الادب باب حق الضیف [4] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لئے بہرحال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے، اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہی، اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم کی ہدایت کی گئی ہو وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کردی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے کیونکہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔[1] اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہوجائیگی، جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کرے گا۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ،

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتون تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانون مین لڑائیون کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطرون مین گھرا ہوا پاتا تھا، اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اُس پر حملہ نہ کر بیٹھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے، اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے بچھڑون کو ملا دیا، دشمنون کو بھائی بھائی بنا دیا، اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی اُن کے اندر پیدا کر دی، جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتون کا خاتمہ کر دیا، اور باہمی دشمنیون کو ان کے دلون سے ایسا بھلا دیا، کہ وہ حقیقت مین بھائی بھائی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ — اے مسلمانو! خدا سے ڈرو، جیسا کہ

حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا — اس سے ڈرنے کا حق ہے،

وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا — اور نہ تم مرو لیکن مسلمان، اور خدا کی

بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا — رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ — رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ — اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو

قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ — کہ تم دشمن تھے، تو اللہ نے تمہارے

اِخْوَانًا ۝ (آل عمران - ۱۱) — دلون کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہو گئے

مسلمانون کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنون کو باہم ملا کر ایک نہین کر سکتا تھا،

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ — اور خدا نے مسلمانون کے دل ملا دیے،

اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا — اگر تو زمین مین جو کچھ ہے سب خرچ

مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ — کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلون

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ — کو ملا نہ سکتا، لیکن خدا نے ملا دیا، بیشک

اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ — وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا

(انفال - ۸) — اور مصلحت جاننے والا ہے،

تو اب مسلمانون کو یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کرین، اور سب

مل کر خدا کے دین کی رسّی کو جو اُن کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے، مضبوط پکڑین، اور باہم اختلاف پیدا کرکے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائین، کیونکہ اس رسّی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہین، فرمایا،

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا	اور اللہ اور رسول کا کہا مانو، اور
تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ	آپس مین جھگڑا نہ کرو، (کہ ایسا ہوگا
رِیْحُکُمْ،	تو) ہمت ہار دوگے، اور تمھاری
(انفال - ۶)	ہوا اُکھڑ جائے گی،

یہی باہمی اتفاق و اتحاد، ملّتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے، اور مسلمانون کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانون مین باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے اُن مین اختلاف پیش آجائے، تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونون خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرین،

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ	تو اگر تم (مسلمانون) مین کسی بات
اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ،	مین جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور
(نساء - ۸)	رسول کی طرف لوٹا دو،

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانون کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑین اور اس کو صلح پر مجبور کرین، اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے اُن مین صلح کرا دین،

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اگر مسلمانون کے دو گروہ لڑ پڑین
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا	تو اُن مین صلح کرادو، پھر اگر ایک
فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى	دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ	والے سے لڑو، یہانتک کہ وہ
حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ،	خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو تو
فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا	اگر وہ رجوع کرے تو اُن مین عدل
بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا	کے ساتھ صلح کرادو، اور انصاف
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	کرو، خدا منصفون کو دوست رکھتا
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا	ہے، مومن تو آپس مین بھائی ہی ہین
بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ،	تو اپنے دونون بھائیون کے درمیان
(حجرات - ۱)	صلح کرادو،

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانون مین بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہین کٹتا، انہی آیتون کے تحت مین وہ حدیث ہے جس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ	تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ
مَظْلُوْمًا ، (بخاری - مظالم)	ظالم ہو یا مظلوم ،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے

لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا اس طرح کہ اُس کے ہاتھون کو ظلم سے روکا جائے،

کیسا ہی بڑا سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اُس نے کلمۂ شہادت پڑھا، اور شریعتِ اسلامی کو قبول کیا وہ دفعۃً ہمارا مذہبی بھائی ہوگیا، خدا نے فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلین،
وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ	اور نماز کھڑی کرین، اور زکوٰۃ دین
فِی الدِّیْنِ ط (توبہ - ۲)	تو وہ تمھارے مذہبی بھائی ہین،

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے، تو وہ اسلام کے رشتہ مین داخل ہوگیا، گو اس کے باپ کا نام و نسب نہین معلوم تو کوئی حرج نہین، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا،

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ	تو اگر تم اُن کے باپون کے نام نہ
فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْکُمْ	جانو تو وہ تمھارے دینی بھائی
(احزاب - ۱)	ہین، اور علاقہ مند،

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کردے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ دارون کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اُس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ (بقرہ - ۲۲)	تو اگر قاتل کو اسکے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کردیا جائے

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ — کیا تم مین کوئی پسند کریگا کہ وہ اپنے

لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا، (حجرات ۱-۲) — مردہ بھائی کا گوشت کھائے،

یتیمون کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متو لیون کا فرض ہے، اور اگر وہ اُن کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جزو بنالین، اور ملا جلا کر خرچ کرین، تو یہ بھی درست ہی، کیونکہ یہ اُن کے بھائی ہین، جن کی خیر خواہی اُن کا فرض ہی، فرمایا،

وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ — اور اگر تم ان کو اپنے مین ملالو تو

(بقرہ ۲۷-۲۷) — یہ بھی جائز ہے، کیونکہ وہ تمھارے بھائی ہین،

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق مین دعاے خیر کرین، وہ یون کہتے ہین،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا — اے ہمارے پروردگار ہم کو اور

الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ — ہمارے اُن بھائیون کو جو ہم سے

(حشر-۱) — پہلے ایمان لائے معاف کر،

ایک مسلمان کے دل مین دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے، جس کے دور کرنے کے لئے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیے، اور کہنا چاہیے

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا — اور ہمارے دلون مین مسلمانون

غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (حشر۔۱)

کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے،

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں، خدا نے مدح فرمائی،

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (فتح۔۴)

وہ (مسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں،

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے، اور نرمی کا برتاؤ کرے،

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (مائدۃ۔۸)

مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے: "مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے، اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھوگے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بیخوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں"[1] صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا "سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۸ کتاب الادب وصحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۰۹ کتاب البر والصلۃ والآداب، مصر،

محسوس کرتا ہے، اور اگر سر مین درد ہو تو پورا جسم تکلیف مین ہوتا ہے[۱]،" مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے، اور اُس کے سارے افراد اس کے اعضا ہین، بدن کے ایک عضو مین بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہین، اور اس دکھ درد مین شریک ہوتے ہین، یہی مسلمانون کا حال ہونا چاہئے، کہ اُن مین سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانون کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہئے،

ایک دوسری تمثیل مین آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہین جیسے دیوار، کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے[۲]،" بخاری مین ہے کہ یہ کہہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیون کو دوسرے ہاتھ کی انگلیون مین ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل مین آپنے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن وحصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعت اسلامیہ ایک قلعہ ہے، جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اُس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی، تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائیگی،

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ

---

[۱] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۰۹ مصر، کتاب البر والصلۃ والادب [۲] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۰ وصحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۳۰۹ مصر،

اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے، اور نہ اس کی تحقیر کرے، ...... انسان کے لئے یہ برائی کیا کم ہے، کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصّہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اُس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے،

ابو داؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اُس پر ظلم کرے، اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہیگا، تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اُس کی تنگی کو دور فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا[2]"

ابو داؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا، اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا، تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کریگا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھیگا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اُسکا پردہ رکھیگا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جبتک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے[3]"

فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں[4]" یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ!

---

[1] صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ صفحہ ۳۸۲ مصر [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۰ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۱۹۴ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶،

سب سے اچھا مسلمان کون ہے، فرمایا "جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں"[1] یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے،

جریرؓ بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے، کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا"[2] کئی روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے، اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے"[3] یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے، اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا، اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے چنانچہ اسی لئے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لئے مخصوص ہے، فرمایا "کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے"۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا	کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ	وہ اس میں پڑا رہے گا، اور خدا کا

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۳۶ مصر [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۳ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲ و ج ۲ صفحہ ۸۹۳۔

وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ۔ (نسآء-۱۳)

خفا ہوا اور لعنت کی اور اُس کیلئے بڑا عذاب تیار کیا ۔

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ مین آپ نے پہلے لوگون کو چپ کرایا، پھر فرمایا: "دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو[۱]" ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم (مسلمانون) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم مین سے نہین[۲]"۔

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا "سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے[۳]"۔ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ مین گرفتار ہو جس مین اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا، جس مین اس کی عزت پر حرف آتا ہو، اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا[۴]"

اگر دو مسلمانون مین کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہین کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳ [۲] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ صفحہ ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ صفحہ ۱۰۴۰ [۳] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۰۹ [۴] ایضاً ۔

تو وہ اودھر منھ پھیرلے اور یہ ادھر منھ پھیرلے، اور ان دونون مین بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے[1]، ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "آپس مین کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہوجاؤ، اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہین کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے[2]"

ایک مسلمان کے لئے اس کی عزت وآبرو سے بڑھ کر معاملہ اُس کے ایمان کا ہی، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہارِ اسلام کے لئے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہین،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا، (نساء ۱۲۰)	اور اس کو جو تمھاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ تو مومن نہین،

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہین پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہین، ایک لڑائی مین ایک صحابی نے ایک کافر کو زد مین پاکر حملہ کیا، اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا، مگر اس پر بھی اُن صحابی نے اس کو قتل ہی کردیا، یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، آپ نے اُن کو بلاکر دریافت کیا، انھون نے عرض کی، یارسول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ نے کس

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۹۲۱ وسنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲،
[2] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۶،

بلیغ انداز مین فرمایا" تم اس کے لاالٰہ الااللہ کے ساتھ کیا کروگے" ایک روایت مین ہے کہ فرمایا "کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا"[1]

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ "مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اُس کے قتل کے برابر ہے"[2] یہ بھی فرمایا کہ "جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دو مین سے ایک پر لوٹے گا"[3] یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا، اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے،

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ "جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لئے دوزخ واجب، اور جنت حرام کریگا" ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی، فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیون نہ ہو"[4]

فرمایا "ہر مسلمان پر اُس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہین، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا، اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا"[5] یعنی یہ کم سے کم حقوق ہین، جن سے دو مسلمانون کے درمیان خوش خلقی اور حسنِ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، ارشاد ہوا کہ "جب کوئی

[1] پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات مین ہے، دوسری روایت کے لئے دیکھیو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور [2] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۳،
[3] ایضاً صفحہ ۹۰۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۳۳ ۲ مصر [4] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۵ مصر
[5] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۲۰۱،

مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے[1]" حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہان تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے، اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے، جن مین سے ہر رتی اُحُد کے پہاڑ برابر ہوگی[2]" یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی مین پہاڑ کا حکم رکھتا ہے،

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہین ہو سکتا اُس برادرانہ الفت و محبت کے فروع ہین جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہین ہوتا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والون کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا، کہ "تم مین سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے[3]" الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابو داؤد مین ہے کہ آپ نے فرمایا، مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے، اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے، اور اس کے پیچھے مین اس کی

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۰۸ کتاب البر والصلۃ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲،
[3] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶،

حفاظت کرتا ہے[1]

دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیوارین ایسی شکستہ نہ رہین، جیسی آج ہین، ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا مین بنی ہے، اور آیندہ بھی بنے گی،

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲، تیسرے فقرے کے مطلب مین شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے۔ تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے، کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اُس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے، اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآنِ پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، (بقرہ۔۱۰) اور لوگوں سے اچھی بات کہو،

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر
عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف

هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ، (مائدہ-۲)

نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال مین) کرو کہ یہ بات تقوی کے قریب ہے

ہر قسم کا برا سلوک اور بیرحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان، اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق مین عدل سے کام نہین لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ آیتِ پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے، ابو ہریرہؓ اور انس ابنؓ مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللّٰہ اخوانا، (بخاری-۲)

آپس مین ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس مین بھائی بھائی بن جاؤ،

بعض روایتون مین الفاظ یہ ہین۔

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللّٰہ اخوانًا، (بخاری)

ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے خدا کے بندو آپس مین بھائی بھائی بن جاؤ،

اس حدیث پاک مین انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر سچائی سے عمل

کیا جائے، تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتہً جنت بن جائے، فرمایا من لا یرحم لا یرحم (بخاری) "جو رحم نہین کرتا، اس پر رحم نہین کیا جاتا" جو بندون پر رحم نہین کرتا اس پر خدا رحم نہین کرتا، یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہین کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہین کریگا، مستدرک حاکم مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "تم زمین والون پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائیگا"[1] یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا، اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا" (بخاری) اس فیض کے عموم مین انسانیت کی قید بھی نہین ہے، ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اسکو اسکے اس کام پر ثواب ملا، صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول! کیا جانورون کے ساتھ نیک سلوک کرنے مین بھی ثواب ہے، فرمایا: ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے مین ثواب ہی یعنی ہر اُس ہستی کے ساتھ جس مین زندگی کی تری ہے نیک سلوک کرنے مین ثواب ہے[2] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ مین ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے،

جامع ترمذی مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا "جہان بھی ہو خدا کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دوگے، اور لوگون کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آو" (باب ماجاء فی معاشرۃ الناس صفحہ ۳۳۱) ابوہریرہؓ

---

[1] مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ ج ۴ ص ۱۵۹ [2] یہ حدیثین صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب مین ہین۔

کہتے ہین کہ ایک دفعہ حضورؐ نے پانچ باتین کہ ئین جن مین سے ایک یہ تھی کہ واحبّ للناس ما تحب لنفسک. یعنی تم لوگون (ناس) کے لئے وہی چاہو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤگے[1]: الناس کا لفظ عام ہے جس مین تمام انسان داخل ہین. اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانون کی بھلائی کا جذبہ دل مین نہ ہو انسان پورا مسلمان نہین بنتا.

کیونکہ دوسرون کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث مین یہ تعلیم ان لفظون مین ہے، کہ "تم اپنے بھائی کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو" بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے، اور ایک عام انسان بھی. تورات اور انجیل کے اندر بھی تعلیم ان لفظون مین ہے کہ "تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو" اسلام مین پڑوسیون کے حقوق کا بیان علٰحدہ باب مین گذر چکا ہے اس پر یہان ایک نظر ڈال لینی چاہئے، کہ صحابۂ کرام نے اس تعلیم کی پیروی مین یہودی اور عیسائی پڑوسیون کا حق بھی مسلمان پڑوسیون ہی کی طرح مانا ہے.

صدقہ و خیرات کے باب مین گو فقرا اور مساکین مین مسلمانون کی ترجیح ایک قدرتی بات ہے، تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ مین نامسلمان ذمی مسکینون کے حق کو بھی تسلیم کیا: قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین لکھا ہے کہ ایک دفعہ

[1] ترمذی ابواب الزہد عن ابی ہریرہؓ.

حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہون، حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اُس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا، اور کہلوا بھیجا کہ اس کو اور اس جیسے لوگون کو دیکھو، خدا کی قسم ہم انصاف نہین کرین گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائین اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دین، قرآن مین صدقہ کی اجازت فقرا اور مساکین کے لئے ہے، فقرا تو وہی ہین جو مسلمان ہین، اور یہ لوگ مساکین اہلِ کتاب مین ہین، اُن سے جزیہ نہ لیا جائے[1]،

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلمون کو دیئے جا سکتے ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ دارون کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہین کہ قرآن[2] نے "اسیر" کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے، اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ مین مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہؓ اور عمرو بن میمونؓ اور عمرو بن شرجبیلؓ صدقۂ فطر سے عیسائی راہبون کی مدد کیا کرتے تھے[3]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین حضرت عمرؓ نے

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۲، مصر، [2] سورۂ دہر، [3] کتاب الاموال امام ابو عبیدہ صفحہ ۶۱۳ و ۶۱۴ مصر،

اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا[۱]، اور خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بعضوں کو انکے مشرک والدین کیساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی[۲]،

تفسیر کی روایتوں مین ہے کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکون کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری[۳]،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ	ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات
اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ	نہین، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ
مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (بقرہ ۳۷)	پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی خرچ کرو وہ تمہارے ہی لئے ہے

یعنی تم کو تمھاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا،

مسند احمد مین ہے کہ آپ نے مسلمانون کو خطاب کرکے فرمایا،

لا یومن احدکم حتی یحب	تم مین سے کوئی اس وقت پورا مومن
للناس ما یحب لنفسہ	نہین ہوگا جب تک وہ اور لوگون
وحتی یحب المرء لا یحبہ	کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے
الا للہ عزوجل،	پسند کرتا ہے، اور جب تک وہ آدمی
(جلد ۳ صفحہ ۲۷۲)	کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے،

اس حدیث مین محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دیگئی ہے

۱؎ بخاری کتاب الجمعہ ۲؎ مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین، ۳؎ طبری،

جانورون کے حقوق

اسلام دنیا مین لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقون سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانورون کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے، اور لوگون سے کہتے تھے کہ تم اُن کو کھاؤ، اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رُک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت مین نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب مین موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اُس کی قبر پر باندھتے تھے، اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہین دیتے تھے اور وہ اسی حالت مین سوکھ کر مر جاتا، ایسے جانور کو بلیّۃ کہتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا، عرب مین ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اُس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جانورون کے گوشت کو ناجائز

قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے[1]، ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا، اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کردو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ملعون قرار دیا ہے[2]، اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مُردار ہے[3]، یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی اُن کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[4]،

بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[5]، ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ اس کا

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ صفحہ ۲۵۵ [2] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فہو میت [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [5] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۰۲،

حق کیا ہے ؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہین کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے[1]، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانورون کا گوشت کھایا نہین جاتا، اور وہ درندہ بھی نہین اُن کا مارنا جائز نہین، سنن نسائی مین ہے کہ "جو شخص کنجشک کو بلا ضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہان فریاد کرے گی کہ فلان نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا[2]" جو جانور کوئی نقصان نہین پہنچاتے یا اُن سے انسانون کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اُن کا مارنا بھی جائز نہین، چنانچہ آپنے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]،

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہین، اُن کے مارنے یا ذبح کرنے مین بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، تم مین ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[4]،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ مین بکری کو ذبح کرتا ہون تو مجھے اس پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کرے گا[5]، یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانورون کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی[6]، کیونکہ

[4] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل و تحدید الشفرۃ [5] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۳۶ [6] نسائی صفحہ ۲۰۳

[1] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۵۰ [2] نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۲۰۰ [3] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۶۲

اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر، پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی، اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[۱]، مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے،

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا، اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مر گئی[۲]، بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں، اس لئے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گنہگار ہیں، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر خدا اُن کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے[۳]،

ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے، آپ ضرورت سے

---

[۱] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ [۲] بخاری کتاب الانبیاء صفحہ ۴۹۵،
[۳] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۱۔

کہین تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے، جہان زمین مین یا درخت پر چیونٹیون کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے، اُن صاحب نے کہا یا رسول اللہ یہ مین نے کیا ہے، آپ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ،[1] (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیون کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائین)

ایک حدیث مین ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو اُن کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انھون نے پہلے اپنا سامان اُس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیون کو آگ سے جلا دیا، اس پر خدا نے اُن کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیون نہین جلایا،[2] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیون کا قصور نہ تھا، ایک حدیث مین ہے کہ ایک سفر جہاد مین صحابۂ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے اُن کے گرد منڈلانے لگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضاے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچون کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچون کو چھوڑ دو صحابۂ کرام نے چیونٹیون کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لئے سزاوار ہے،[3]

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانون کے ساتھ سلوک کرنا ثواب

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبد اللہ بن مسعودؓ [2] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق صفحہ ۴۶،

[3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار،

کا کام ہے، بعینہ اسی طرح جانورون اور پرندون کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے، اسی عدمِ واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ مین نے خاص اپنے اونٹون کے لئے پانی کے جو حوض بنائے ہین، اُن پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہین، اگر مین اُن کو پانی پلا دون تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[1]،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک شخص راستہ مین جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی، اتفاق سے اس کو ایک کنوان مل گیا اور اس نے کنوئین مین اتر کر پانی پی لیا، کنوئین سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے، اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اُس پر ترس کھایا اور کنوئین مین اتر کر پانی لایا اور اُس کو پلایا، خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اس کو بخشدیا، صحابۂ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانورون کے ساتھ سلوک کرنے مین بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجبِ ثواب ہے[2]، صرف جانداروں ہی تک نہین بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے، اور اُس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ[3] یعنی ثواب کا کام ہے،

---

[1] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء، [2] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم
[3] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ،

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانورون کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی

(۱) جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اُس سے وہی کام لینا چاہئے چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑکر کہا کہ مین اس کے لئے نہین پیدا کیا گیا ہون، صرف کھیتی باڑی کے لئے پیدا کیا گیا ہون[۱]، نیز فرمایا کہ اپنے جانورون کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے اُن کو تمھارا فرمانبردار صرف اس لئے بنایا ہے کہ وہ تم کو اُن مقامات مین پہنچا دین جہان تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمھارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتین اسی پر پوری کرو[۲]، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعون پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانورون کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہین کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت مین اس پر سوار ہونا چاہئے۔

(۲) جانورون کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ مین سفر کرو تو اونٹون کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانہ مین سفر کرو تو اُس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ[۳]، تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ مین ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے،

---

[۱] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الوقوف علی الدابۃ [۳] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق،

ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا ان بے زبان جانورون کے معاملہ مین خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت مین رکھ کر سوار ہو، اور اُن کو کھاؤ تو اُن کو اچھی حالت مین رکھ کر کھاؤ[۱]،

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ مین رفع حاجت کے لئے گئے، اس مین ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہوگیا، آپ اس کے پاس گئے، اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! فرمایا اس جانور کے بارہ مین جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہین ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو[۲]،

(۳) جانورون کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا[۳]،

(۴) جانورون کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[۴]، کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہین،

پچھلے صفحون پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ مین جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم وکرم سے بھرا ہوا ہے،

[۱و۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم [۳] ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب [۴] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہین کہ اُن کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکماے اخلاق نے ان کی دو قسمین کی ہین، ایک اُمّہاتِ اخلاق، اور دوسری فروعِ اخلاق. امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہین، جو دوسرے اخلاق کی اصل ومرجع ہین، اور جن مین کمی وبیشی سے اخلاق کی مختلف قسمین پیدا ہوتی ہین، اور جن کے اعتدال سے فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے.

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتین ہین. قوّتِ علیہ، قوّتِ شہوانیہ اور قوّتِ غضبیہ. قوّتِ علیہ کے اعتدال کا نام **حکمت**. قوّتِ شہوانیہ کے اعتدال کا **عفت** اور قوّتِ غضبیہ کے اعتدال کا **شجاعت** ہے، اور انہی کے عدمِ اعتدال کو رذائل کہتے ہین. پھر ان دونون قسمون کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور مین آتے ہین،

یہ تقسیمین محض فلسفیانہ ہین، یا یون کہئے کہ علمی اور نظری ہین. لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی ونظری حیثیت نہین. بلکہ عملی ہے، کیونکہ اُس کا منشا انسان کو فقط اخلاق

کا علم بحث نہیں، بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا، اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لئے اُس کو اس سے بحث نہیں کہ فلان خلق کی اصلیت کیا ہے، اور اس نے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہین، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لئے اپنی تعلیم مین اُس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے، اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے مین خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اُس مین عقلی خوبیان، اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس مین عقلی برائیان اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمین ہین: وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہین، اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہین، ہم نے اوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی کے عنوان مین وہ آیتین لکھدی ہین جن مین اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے اُن کو ابھی ہم نے اصطلاح مین فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہین، اور قرآنِ پاک اور احادیثِ شریفہ مین جابجا اُن کی تصریح ہے، لیکن اُن کے بیان مین اخلاقِ شرعی کے مصنفون نے کوئی خاص ترتیب نہین رکھی ہے، اسی لئے اُن کی اہمیت کے ذرجے اور رتبے نہین مقرر ہوئے،

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل مین سب سے پہلے اُس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولون اور پیغمبرون کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانون کو اُس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبوی مین زیادہ زور دیا گیا ہو، اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیون کی بنیاد ہو،

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے، اور غور و فکر کرنے والون مین اس بارہ مین اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہان تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے، اس مین کامیابی کی کوشش کرون گا،

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتون کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور جن کو گنا کر اُس نے اپنے اچھے بندون کی توصیف کی ہے، یا اُن اوصاف والون کے لئے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآنِ پاک اور احادیثِ نبوی مین جا بجا اُن کی تفصیل ہے، جیسے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ	ایمان والے مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی
هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝	نماز مین عاجزی کرتے ہین، جو بیکار
وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	باتون کی طرف رُخ نہین کرتے
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ	جو زکوۃ دیتے، اور اپنی شرمگاہون
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	کی حفاظت کرتے ہین، لیکن اپنی
حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ	بیویون سے اور اپنی (شرعی) باندیون

أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (مومنون-۱)

ہے، کہ ان پر کوئی الزام نہیں، تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں، اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں: نکمی اور بے کار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے،

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي

اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا، اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو

الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ	کو اور گردنون کو چھڑانے مین دیا، اور
اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ	نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی، اور اپنے
اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ	قول کو جب انھون نے اقرار کرلیا
فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ	پورا کرنے والے، اور مصیبت مین
الْبَاْسِ ط،	اور تکلیف مین اور لڑائی کے چل چل کے
(بقرہ ۲۲)	وقت ثابت قدم رہنے والے،

ان آیتون مین جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہین وہ یہ ہین، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا اور مشکلون مین ثابت قدمی،

سورۂ آل عمران مین ہے،

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَ	ثابت قدم رہنے والے، اور سچ ہی
الْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ،	بولنے والے، اور (خدا کی) فرمانبرداری
(آل عمران ۲۰)	کرنے والے، اور (خدا کی راہ مین) خرچ [illegible]

اس آیت مین ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ مین ان متقیون کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہون گے

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ	جو خوشحالی اور تنگ دستی دونون
وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ	حالتون مین (خدا کے نام) خرچ

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ — کرتے ہیں، اور غصہ کو روکتے، اور لوگوں
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ، — کو معاف کرتے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے
(آل عمران-۱۴۰) — والوں کو دوست رکھتا ہے،

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ معارج میں ہے،

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ — اور جن کے مال میں مانگنے والے، اور
مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ — مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو
وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ — روزِ جزا کو سچ مانتے ہیں، اور جو اپنے
الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ — رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ
عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ — اُن کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی
اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ — چیز نہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ — حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں
حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ — اور شرعی باندیوں سے، کہ اس میں اُن
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ — پر کوئی ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى — چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ — ہیں، اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے
الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ — عہد کا پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں

لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (معارج-۱)
پر قائم رہتے ہیں،

ان آیتون مین سخاوتِ نفس، عفت وعصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتون مین شمار کیا ہے جو اس کے جنت مین جانے کی سبب ہوئی ہین،

سورۂ احزاب مین اُن مردون اور عورتون کا ذکر ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشایش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے،

وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے
وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ	والیان، صبر کرنے والے اور صبر
وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ	کرنے والیان، اور عاجزی کرنے
وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ	والے اور عاجزی کرنے والیان،
وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ	اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے
وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ	والیان، اور روزہ رکھنے والے اور
وَالْحٰفِظٰتِ،	روزہ رکھنے والیان، اور اپنی شرمگاہون
(احزاب - ۵)	کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت

ان مین سچائی، صبر، عاجزی، اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے،

سورۂ فرقان مین خدا کے اچھے بندون کی پہچان یہ بتائی گئی ہے،

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ	(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ
یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا	ہین جو زمین مین ہولے چلتے ہین، اور

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ	اور جاہل جب اُن سے جہالت کی
قَالُوْا سَلٰمًا۔ (ع-۶)	باتین کرین تو وہ کہین سلامت رہئے
(۲) وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ	(۲) اور جب وہ خرچ کرین تو نہ تو
يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ	فضول خرچی کرین اور نہ تنگی کرین
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (رر)	اور دونون کے بیچ کی راہ ہو
(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ	(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان
حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (رر)	نہین لیتے، اور نہ بدکاری کرتے ہین
(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ	(۴) اور جو جھوٹی گواہی نہین دیتے
الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا	اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے
كِرَامًا۔ (رر)	گذرین تو شریفانہ وضع سے گذر جاتین

پہلی آیت مین عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت مین اعتدال اور میانہ روی
تیسری مین عدم ظلم اور عفت اور چوتھی مین سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف
کی گئی ہے، سورۂ رعد مین وہ صفتین بتائی گئی ہین جو عقبیٰ مین کام آئین گی،

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہین
وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَ	اور قول کو توڑتے نہین، اور جس کے
الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ	جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اُس کو
بِهٖ أَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ	جوڑے رکھتے ہین، اور اپنے مالک

لے یا سلام کہین

رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ
الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا
ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝

(رعد-۳)

سے ڈرتے ہین، اور بری طرح حساب
ہونے سے ڈرتے رہتے ہین، اور جنھون
نے اپنے مالک کی خوشی کے لئے
صبر کیا، اور نماز کھڑی کی، اور ہم نے
جو اُن کو دیا اس سے چھپے اور کھلے
(اچھے کامون مین) خرچ کیا، اور
برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہین،
انھی کے لئے پچھلا گھر ہے،

اس ایفاے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے، اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہلِ قرابت اور حقدارون کے حقوق ہین، ان دو کے سوا ان آیتون مین اُن کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگون سے بھلائی کرتے ہین، یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہین،

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا
لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا
فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا

اس پچھلے گھر کو ہم اُن کے لئے کرینگے
جو زمین مین غرور اور فساد کرنا نہین
چاہتے، اور آخر انجام پرہیزگارون

یعنی غرور و نخوت نہین کرتے،

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ (شوریٰ-۴) — اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ، (مائدہ-۶) — بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے،

عدل وانصاف کی فضیلت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (بقرہ-۲۴) — بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے،

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گذر چکی ہیں، اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی،

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیون کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال مین سچائی ہے، اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتین آجاتی ہین،

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کے لئے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہون، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہین، اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے، اور جو سچا ہے اس کے لئے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہین کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ مجھ مین چار بُری خصلتین ہین، ایک یہ کہ بدکار ہون، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہون، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہون، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہون، ان مین سے جس ایک کو فرمایئے، آپ کی خاطر سے چھوڑ دون، ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو، چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا، اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اسکا جی چاہا، اور پھر بدکاری کیلئے

آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوچھین گے کہ رات تم نے شراب پی، اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دون گا، اگر ہان کہون گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی، اگر نہین کی تو عہد کے خلاف ہوگا، یہ سونچ کر ان دونون سے باز رہا جب رات زیادہ گذری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لئے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا، کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہون گا ہان کرون گا تو ہاتھ کٹے گا اور نہین کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا، صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی مین حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چارون بری خصلتین مجھ سے چھوٹ گئین، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے،

یہ روایت سند کے رو سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیون سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل مین نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسے کے قابل ہوگا، لوگون کو اس کے

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۂ نسا مین کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے، لیکن مجھے اس کا ماخذ نہین معلوم ہوا،

قول وفعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیون کی اصلی بنیاد قرار پائے گی،

صدق، صفاتِ ربانی مین سے بھی سب سے بڑی صفت ہے، خدا سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ مین خدا آپ فرماتا ہے،

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (نساء ۱۱)	اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہو بات مین

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے،

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۔ (نساء ۱۸)	وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہو اللہ سے زیادہ سچا بات مین،

خدا سچا ہے، اس لئے اسی کی ساری شریعت سچی ہے، فرمایا

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۔ (انعام ۱۸)	اور ہم ہین سچے،
قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ (آل عمران ۱۰)	کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا، تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو،
وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (زمر ۴)	اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہین،

اس آخری آیت مین "سچائی" سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے، مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگارون کی شان یہ ہے،

کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہین، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہین، اور اپنے ہر قول اور عمل مین سچائی کو پیش کرتے ہین،

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اسکے رسولونکو وعدونکو سچا ہوتے اپنی آنکھون سے دیکھتے ہین تو پکار اٹھتے ہین،

وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، (احزاب) اور خدا اور اُس کے رسول نے سچ کہا،

چونکہ رسول، خدا سے علم پاتے ہین، اس لئے وہ بھی سچے ہوتے ہین،

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ، (یٰس۔۴) اور پیغمبرون نے سچ کہا،

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبرون کا سب سے پہلا وصف ہے، کیونکہ اُن کی ساری باتین، دعوے، دلیلین اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہون تو اُن کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبرون کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا، (مریم۔۳) اور کتاب مین ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا، (مریم۔۴) اور کتاب مین ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

حضرت مریمؑ جنھون نے اللہ کی باتون کے سچ ماننے مین ذرا بھی پس و پیش نہین کیا، اس وصف سے ممتاز ہوئین، فرمایا گیا،

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ، (مائدہ-۱۰) اور اُن (عیسیٰ) کی مان بڑی سچی تھین

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر مین ایسے سچے نکلے، بندون کی زبان سے صدیق کہلائے،

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ. (یوسف) یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اور کتاب مین اسماعیل کا
اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ ذکر کر، بے شبہہ وہ وعدہ کا سچا
كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا، (مریم-۴) اور بھیجا ہوا نبی تھا،

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگون کو ملے گی اُن مین وہ بھی ہون گے جو دنیا مین دوسری صفتون کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے،

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ، (اٰل عمران-۲) صبر کرنے والے اور سچے،

خدا نے جن لوگون کے لئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہین اُن مین اسلام و ایمان اور خدا کی فرمان برداری کے بعد پہلا درجہ سچون اور راست بازون کا ہے، فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ	بے شک اسلام قبول کرنے والے
وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے
وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ	مرد اور عورتیں، اور فرمانبردار مرد
الصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	اور عورتیں، اور سچے مرد اور سچی
الآیہ	عورتیں . . . .
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ	خدا نے اُن کے لئے مغفرت اور
اَجْرًا عَظِيْمًا، (احزاب - ۵)	بڑی مزدوری رکھی ہے،

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملیگا، اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے،

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ	یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو اُن کا
صِدْقُهُمْ ط (مائدہ - ۱۶)	سچ کام آئے گا،

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ	تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو انکی
بِصِدْقِهِمْ (احزاب - ۳)	سچائی کا عوض دے،

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم ہر علم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچو (۱)

ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو، اور ان ہی کی صحبت مین رہو، کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو، کعب بن مالک اور اُن کے دو ساتھیون نے جو تبوک کے سفر مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفین سہکر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اُس کی طرف اشارہ کر کے خدا فرماتا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ	اے ایمان لانے والو، خدا سے
وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ . (توبہ ۱۵)	ڈرو اور سچون کے ساتھ ہو،

اہل تفسیر کے نزدیک یہان ان سچون سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہین، جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا، مگر بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت سے ہر دور کے مسلمانون کو سچون کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے،

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہین، مگر اسلام کی نگاہ مین اس کے بڑے وسیع معنی ہین، جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہین، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی رح نے احیاء العلوم مین بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمین کی ہین، اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہین، بات مین سچائی، ارادہ اور نیت مین سچائی، عزم مین سچائی، عزم کو پورا کرنے مین سچائی، عمل مین سچائی، اور دینداری کے مقامات اور مراتب مین سچائی، لیکن ذرا معنی مین وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسمون مین ساری سچائیان آجاتی

ہین، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی،

زبان کی سچائی یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے، اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اسی قسم مین داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب مین ایک آیت ہے،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ	تاکہ اللہ سچون کو اُن کی سچائی کا
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ	عوض دے اور منافقون کو سزا
الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ الآیہ (ع۳)	دے اگر چاہے۔۔۔۔۔۔

اس آیت پاک مین صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کے مختلف پیرایون مین ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہو سکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہو سکتا ہے، جواب دیا ہو سکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے، فرمایا نہین[1]، کئی صحابی کہتے ہین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے، لیکن خیانت کاری

---

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب

اور جھوٹ پر[1] (نہین) مطلب یہ ہے کہ مومن مین ہر برائی ہو سکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہین ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے ارشاد ہوا "کسی بندہ کا ایمان پورا نہین ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سی چھوڑ دے، یہان تک کہ مذاق اور جھگڑے مین بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیون نہ ہو"[2] ان روایتون کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابون مین ہے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس مین چار باتین ہون وہ پکا منافق ہے، اور جس مین اُن مین سے ایک بات ہو تو اس مین نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اُس کو چھوڑ نہ دے، جب[1] امانت اُس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب[2] بات کرے جھوٹ بولے، جب[3] کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے، اور جب[4] جھگڑے تو حق کے خلاف کہے[3] یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ "منافق کی علامتین تین ہین، جب[1] کہے تو جھوٹ بولے، جب[2] وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب[3] امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے"[4] صحیح مسلم مین اس کے بعد ہے۔ "اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیون نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان

---

[1] عن ابی امامۃ عند احمد، وعن سعد بن ابی وقاص عند البزاز وابی یعلیٰ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمر وقد روی مرفوعا وموقوفا [2] مسند احمد عن ابی ہریرۃ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلیٰ عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثین حافظ منذری کی ترغیب وترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لیگئی ہین [3] صحیح بخاری کتاب الایمان، وصحیح مسلم وابوداؤد وترمذی ونسائی [4] صحیح بخاری کتاب الایمان وکتاب الادب وصحیح مسلم،

ہی کیوں نہ کہتا ہو۔[1]

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے، اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے، اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے، اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔"[2]

دل کی سچائی صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بنجاتے ہیں، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار اُن کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ، (منفقون - ۱)	اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں،

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح بخاری، کتاب الادب،

یعنی اپنی شہادت مین جھوٹے ہین، زبان سے تو یہ کہتے ہین کہ ہم اقرار کرتے ہین کہ آپ خدا کے رسول ہین، لیکن اُن کا یہ اقرار اور اُن کی یہ گواہی اُن کے دل کا اقرار اور گواہی نہین، اُن کے دل مین کچھ ہے، اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عل کی دلی غرض کچھ اور ہو، اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولتمند پیش ہون گے، اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارنامون کو سن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہین گے؛ یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہین کئے گئے تھے تاہم چونکہ اُن مین اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھوٹ کہا، کہ ان کے کارنامون کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہان کوئی معاوضہ نہین،

ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعۃ،

عل کی سچائی: عل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، یا یون کہئے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہون، مثلاً ایک شخص نماز مین خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اُس کا مقصود صرف نمایش ہے تو

یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھکر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لئے ایسا نہین کرتا، تاہم ظاہری طور پر اُس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے، اُس کے باطن مین وہ خشوع وخضوع نہین ہے، اس لئے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہین کرتے، اس بناپر وہ بھی اپنے ان اعمال مین صادق نہین، اس لئے زبان کی سچائی، اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لئے جن مسلمانون نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ مین جان ومال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدانے فرمایا،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا	مسلمان تو وہی ہین جو اللہ اور اس
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا	کے رسول پر ایمان لائے، پھر
وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ	(کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہین
أَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ	کیا، اور اللہ کے رستے مین اپنی جان
هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات - ۲)	ومال سے جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہین

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جب ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کر دی،

اس صدق عملی کے کئی مرتبے ہین، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اُس مین کسی قسم کا ضعف وتردد نہ پیدا ہو، مثلاً ایک شخص احکام الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمایش کا وقت آتا ہے تو اُس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے،

اس لئے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومنِ کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدمِ یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ، طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ،

(محمد - ۳)

اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو، پھر جب کوئی سورۃ اترتی ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو، تو ان پر تف ہو (رسول کی) فرمانبرداری چاہئے اور صاف وصحیح جواب دینا چاہئے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے،

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدقِ عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول وقرار کیا جائے اور جس قول و

قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کرلے اور اس مین کسی قسم کا ضعف نہ ہو، لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس مین ضعف ظاہر ہو، اس لئے صحابۂ کرام مین جن لوگون نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے، خدا نے اُن کو سچا کہا ہے،

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر مین شرکت کا موقع نہین ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انھون نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ مین شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤن گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ اُحد مین شریک ہوئے اور نیزے تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اُن کی شان مین یہ آیت نازل فرمائی۔[1]

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	مسلمانون مین کچھ لوگ ایسے ہین کہ
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ	خدا کے ساتھ انھون نے (جان نثاری
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ، وَ	کا) جو عہد کیا تھا اس مین سچے اترے
مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا	سو (بعض تو) ان مین سے ایسے تھے
بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا، لِيَجْزِيَ	جو اپنی پوری کر گئے، (یعنی شہید ہوچکے)
اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ	اور بعض ان مین سے ایسے ہین جو

[1] بخاری تفسیر سورۂ احزاب،

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ — (شہادت کے) منتظر ہین اور انھون نے

اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ — (اپنی بات مین) ذرا سا بھی توڑ دو بدل

كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ — نہین کیا، تاکہ اللہ سچون کو اُن کی سچائی

کا عوض دے، اور منافقون کو سزا دے

(احزاب - ۳) — اگر چاہے یا اُن کو معاف کرے[1]۔

صدق علی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگون کو صدیق کہا ہے، اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہین، عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار، اور یقین کی آنکھون سے اس کا مشاہدہ کرتے ہین، بعض بعض صحابیون کے حالات مین اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "مین خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہون" آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمھارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے "میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لئے رات کو جاگا کرتا ہون (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہون (روزہ) گویا مین علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہون، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہین، گویا مین دوزخیون کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہون" ارشاد ہوا کہ "تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو"[2]

[1] یعنی ان منافقون کو توبہ کی توفیق ہو، اور وہ آگے چل کر سچے مومن بنجائین تو خدا اُن کو معاف فرمائے [2] اسد الغابۃ تذکرہ حارث بن مالک،

صحابۂ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبتوں
مین اُن کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابوبکرؓ کے
پاس سے روتے ہوئے گذرے، انھون نے پوچھا حنظلہ کیا بات ہے؟ بولے مین منافق
ہوگیا، ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین ہوتے ہین، اور آپ جنت و دوزخ
کا ذکر کرتے ہین تو گویا ہم اُن کو علانیہ دیکھ لیتے ہین، لیکن جب پلٹ کر بال بچون، اور
دنیوی کاروبار مین مشغول ہو جاتے ہین تو سب بھول جاتے ہین، حضرت ابوبکرؓ نے
کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونون بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت مین آئے، اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے
تم سے تمھاری مجلسون مین مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے[1]۔

قرآنِ پاک کی اس آیت مین گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا،

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ	ہرگز نہین اگر تم کو یقینی علم ہوتا تو تم
(تکاثر)	سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہین ہو سکتے،

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآنِ پاک کی ان آیتون مین ہے،

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ	نیکی یہی نہین کہ (نماز مین) اپنا منہ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ

[1] ترمذی ابواب الزہد،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	نیکی تو اُن کی ہے جو اللہ اور روز آخرت
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى	اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	اللہ کی حُب پر رشتہ داروں اور
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي	اور مانگنے والوں کو دیا، اور غلامی
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ	وغیرہ کی قید سے لوگوں کی گردنوں
اٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	کے چھڑانے میں (دیا) اور نماز
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا	پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور جب
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	(کسی بات کا) اقرار کر لیا تو اپنے
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ،	قدم رہے یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے
(بقرہ ۵ - ۲۲)	اور یہی ہیں پرہیزگار ۔

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے، اُن کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں۔ اوّل اُن کے ایمان کا کمال، دوسرے اُن کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں اُن کا ہر طرح پورا اترنا، اور جو لوگ علم اور عمل کے اِن تمام فضائل کے درجۂ کمال

کو پہنچ جاتے ہیں اُن کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدیق کہتے ہیں[1]، جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے، چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمراہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ	کرے تو وہ (جنت میں) اُن (مقبول
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ	بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	اللہ نے انعام کئے، یعنی نبی اور صدیق
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ	اور شہید اور (دوسرے) نیک
رَفِيْقًا، (نساء-۹)	بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں

سورۂ حدید میں ایمانِ کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ	اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ، (حدید-۲)	ایمان لائے وہی صدیق ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے، جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہو سکتا، یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ "انسان سچ

---

[1] الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل، (مجمع البحار فتنی) — صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو،

بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے،

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی، اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے۔ سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہین، اور اس کی بہت سی صورتین ہین، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کئے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لئے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ مین ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ مین ڈال دینا، دوسرون کو بچانے کے لئے یا حق کی حمایت مین اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمین ہین جن کے امتیاز کے لئے الگ الگ نام رکھے گئے ہین،

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنون کو گھیرے ہوئے، اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیمون کو محیط ہے، اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرون کو فائدہ پہنچایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کامون کی بنیاد ہے،

سورۂ بقرہ کے شروع مین اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندون کے کچھ اوصاف بتائے

ہین، ان مین سے ایک یہ ہے،

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ، (بقرہ - ۱)

اور ہم نے اُن کو جو روزی دی اس مین سے کچھ (خدا کی راہ مین) خرچ کرتے ہین

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہین[1]، بلکہ یہان جس طرح روزی کی تخصیص نہین کی گئی، کہ کیا دیگئی، پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس مین سے کچھ خدا کی راہ مین دینے کی صورت کی بھی تعیین نہین کی گئی، خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس مین سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہین ملا، یا ضرورت سے کم ملا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس مین سے کچھ اُن کو دینا جو اس سے محروم رہے ہین، یا جو اس کے محتاج ہین، متقیون کی نشانی ہے، اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح مین سخاوت اور فیاضی ہے،

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہین، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر مین اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندون کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی مین یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس مین اپنے ہم جنسون کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور،

جذبہ نہ ہوگا، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے،
سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورہ
بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے، اور کہیں
کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں
مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن	سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے
يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا	اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں
خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ	نہ خرید نا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش
هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (بقرہ-۳۴)	ہے، اور کافر ہی ہیں ظالم،

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے
سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روز جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے خدا کی راہ میں اپنی
کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے، جو
خدا کی روزی کی نعمت پاکر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا،
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُر تاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی
میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے، کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں
خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی
و محبت سے، اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ

بیری ہی دی ہوئی ہے. خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو، کہ اُس دن یہی کام آنے والا ہے،

خدا کی راہ مین جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اُس مین خلوصِ نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اولاہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر-۱) اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ (زیادہ بدلہ چاہے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا، اور قیامت کے غم وملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	جو اپنی دولت خدا کی راہ مین خرچ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ	کرتے ہین، پھر اس کے خرچ کے پیچھے
مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى	نہ تو احسان دھرتے ہین اور نہ اُلاہنا
لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	دیتے ہین، اُن کی مزدوری اُن کے
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا	پروردگار کے پاس دھری ہے اُور
هُمْ يَحْزَنُوْنَ، (بقرہ-۳۶)	نہ اُن کو ڈر ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہونگے.

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنارت ظاہر ہوتی ہے. فرمایا گیا.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے، اس میں
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ	سے جو تم نے کمایا اور اس مین سے

اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ	جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا
لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ	اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے
تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ	بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ط	تم دیتے ہو، حالانکہ تم آپ اس کو لینے
(بقرہ - ۳۷)	والے نہیں، مگر یہ کہ آنکھ اسکے لینے میں بچاؤ

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو، جب تک ایسا نہ کروگے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا، صاف فرمایا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا	ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک
تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ	تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو
فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ	پسند ہے، اور جو بھی تم خرچ کرو خدا
(آل عمران - ۱۰)	جانتا ہے،

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے، مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے، اور اسی لئے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے، اور اس طرح نیکی کے کام میں جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی، اور جہاد اور

محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو، اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملیگا جو کریگا، فرمایا

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ	اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ	تمہارے ہی لئے ہے، اور تم نہیں
وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا	خرچ کرتے مگر اللہ کے لئے، اور جو
مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ	بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دیدیا
وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ،	جائے گا، اور تمہارے ساتھ ذرا
(بقرۃ - ۳۷)	بے انصافی نہ کی جائے گی،

اور اسی لئے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اسکو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے، اور دل بڑھانے والے انداز سے پکار رہا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے
قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ	اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ
اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ (بقرۃ - ۳۲)	اس کو بہت گنا کرے،
مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے
قَرْضًا حَسَنًا، فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ	اچھا قرض، تو وہ اس کو اس کے واسطے
وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ، (حدید ۲۰)	دونا کرے، اور ہو اسکے لئے عزت

آگے چل کر پھر فرمایا،

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ	بے شک خیرات کرنے والے اور
وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے
يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ	ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا
كَرِيْمٌ، (حدید-۲)	دیا جائیگا اور ان کے لئے عزت والی

مزدوری ہے

کہیں حکم کی صورت میں ہے،

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (مزمل-۲) — اور اللہ کو اچھا قرض دو،

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لئے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے، اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا، اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا	اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض
حَسَنًا، (مائدہ-۳)	دیتے رہے

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا،

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ	تو میں تم سے تمھاری برائیاں اتار دونگا
وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	اور تم کو ان باغوں میں داخل کر دونگا

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، (مائدہ - ۳) جن کے نیچے نہرین بہتی ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین جو بدوی ایمان لائے، اور خوش نیتی کے ساتھ کارِ خیر مین خرچ کرتے تھے، خدا نے اُن کی تعریف فرمائی،

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ — اور بعضے بدوی ایسے ہین جو اللہ

بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ — اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہین

مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ — اور ٹھہراتے ہین جس کو خرچ کرتے

وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ط — ہین، اللہ سے نزدیک ہونا اور

(توبہ - ۱۲) — رسول کی دعا لینا،

خدا نے ایسے سخی داتاؤن کو خوشخبری دی،

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ط سَیُدْخِلُهُمُ — ہان! وہ اُن کے حق مین نزدیکی کا

اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ — سبب ہے، اُن کو اللہ اپنی رحمت مین داخل

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، (توبہ - ۱۲) — فرمائیگا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

متقی سخیون کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اسکی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے،

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ — اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس

رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ — جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ

وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ — ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ	پرہیزگارون کے واسطے جو خوشی
وَالضَّرَّآءِ ، الآیۃ ،	اور تکلیف (دونون حالتون) مین
(آل عمران - ۱۴)	خرچ کرتے ہین . . . . . .

سورۂ بقرہ مین اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ مین کیا جائے، ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گونا کیونکر ہوگا، دُور ہو جاتا ہے، فرمایا،

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ	اُن کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ	مین خرچ کرتے ہین، ایک دانہ کی
اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ	سی ہے، جس سے سات بالین اُگتی
کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ	ہین، ہر بال مین سَو دانے ہوتے ہین
وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ	اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے بڑھا
وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ - ۳۶)	دیتا ہے، اور اللہ کشایش والا اور سب جانتا ہے

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑون دانے بنجاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑون دانے پیدا کرلیتا ہے، خدا گنجایش اور کشایش والا ہے، اُس کے ہان ایک کا سو بنجانا کچھ مشکل نہین ہے، اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے، اسی رکوع کے آخر مین اللہ تعالیٰ نے اُن کی جو خدا کی خوشنودی کے لئے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہین، ایک اور مثال دی ہے،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنا مال خدا کی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	خوشنودی چاہنے کے لئے اور اپنے
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ	کو پکا کرنے کو دیتے ہین، ایک باغ
بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ	کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر
اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ، فَاِنْ لَّمْ	مینھ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا
يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ	دیا، اور اگر مینھ نہین پڑا تو اوس
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ،	ہی پڑی، اور اللہ تمھارے کام
(بقرہ-۳۶)	دیکھتا ہے،

اس مثال مین ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا، اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین مین پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذراسی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ مین جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ مین سو ہو جاتا ہے، اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لئے ہماری نیتون کے بھید سے بھی آگاہ ہے،

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللیل مین بیان کیا گیا ہے، فرمایا،

۱- فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى	تو جس نے (راہِ خدا مین) دیا، اور
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ	پرہیز کیا، اور اچھی بات کو مانا،

بِلْیُسْرٰی ،	تو ہم اس کے لئے نیکی کی، سیج بات
(لیل - ۱)	کا راستہ آسان کرین گے،
۲- وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی، الَّذِیْ	۲- اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ
یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی، وَمَا	پرہیزگار بچایا جائے گا، جو اپنا مال
لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ	پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے، اور اس پر
تُجْزٰۤی، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ	کسی کا احسان نہین جس کا بدلہ دیا
رَبِّهِ الْاَعْلٰی، وَلَسَوْفَ	جائے، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی
یَرْضٰی، (لیل - ۱)	خوشی کے لئے، اور وہ خوش ہو جائیگا،

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا مین دینے کی عادت، اطاعت وعبادت، یا نیک کامون کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متّقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیاوی سوری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو، بلکہ مقصود صرف خدا ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اُس کا دامنِ دل پاک ہو جائے، تو خدا فرماتا ہے تو خدا بھی اس کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت مین یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل مین پاکیزگی آتی ہے،

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لئے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلون کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف، اور جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیرو ؤن کے دلون سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لئے جاتی رہے،

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝	پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝	کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝	کی، اور اس کو گن گن کر رکھا سمجھتا ہے
(ھمزہ - ۱)	کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھیگی،

ایک اور آیت مین مال کی محبت پر کافرون کو طعنہ دیا ہے،

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝	اور تم مال و دولت سے بہت ہی
(الفجر - ۱)	محبت رکھتے ہو،

یہی محبت، سچائی، اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر مین نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی، اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ مین دینا) کے سلسلہ

مین ان لفظون مین ادا کیا ہے،

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ	شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہو
یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ	اور تمھین بے حیائی کی بات (بخل،
یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ	کو کہتا ہے، اور خدا تم سے اپنی طرف
فَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ	سے گناہون کی بخشایش اور فضل و
عَلِیْمٌ،	کرم کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ کشایش
(بقرہ - ۳۷)	والا ہے، جانتا ہے،

قرآن کی اصطلاح مین دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہین ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا،

یُّؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ	وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے
یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ	اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی
خَیْرًا کَثِیْرًا، (بقرہ - ۳۷)	اس کو بڑی دولت ملی،

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائین گے، اس کا سراسر دھوکا ہے، اور خدا کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہی۔

ایک اور آیت مین ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمایش ہے، اس آزمایش مین پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لئے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤن اس بازی مین ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا، اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا،

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ	تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ
فِتْنَةٌ ، وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ	ہے، اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری
عَظِيْمٌ ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ	ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہو سکے،
وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا	اور (اس کی باتون کو) سنو اور مانو،
خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ، وَمَنْ يُّوْقَ	اور (راہِ خدا مین) خرچ کرو، اپنے
شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	لئے بھلائی کرو، اور جو اپنی جان و
الْمُفْلِحُوْنَ ، اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ	لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہین،
قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ	اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض، تو وہ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ، وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ	اس کو تمہارے لئے دونا کرے گا، اور
حَلِيْمٌ ،	تمہارے گناہ معاف فرمائیگا، اور اللہ
(تغابن - ۲)	(نیکی کی) قدر پہچانتا ہے، اور (برائی کا بدلہ دینے مین)

ان آیتون مین انفاق اور کار خیر مین دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، قومون کی ترقی کا مدار بہت

کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کامون مین لگاتی اور افراد مین بانٹتی رہین، یعنی جماعت کے کامون اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد مین اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہین، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی، اور تمول کی برائیون سے لوگ بچے رہین گے، اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کامون کے کرنے سے ہچکچایا نہ کرین گے، اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے،

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہین،

۱- میری چیز ہے، مین دوسرون کو کیون دون،

۲- دوسرون کو دون گا، تو میرے کمی ہوجائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی،

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونون وسوسون کا خاتمہ کردیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے پیروون کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت مین میرا تیرا کسی کا نہین، وہ صرف خدا کا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے، اور اسی کی راہ مین دیجانی چاہیے،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ مین
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ	خرچ نہین کرتے، اور آسمانون اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (حدید-۱)	زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے،

بخل کی برائی مین کہا،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ	اور نہ سمجھین وہ لوگ جو اس مین بخل کرتے

بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ	ہین، جس کو اللہ نے اپنے فضل سے
ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ	انھین دیا ہے کہ یہ اُن کے حق مین
سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ	بہتر ہے، بلکہ یہ اُن کے حق مین برا ہی،
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ط وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ	قیامت کے دن اُن کے گلے مین اسکا
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط	طوق ڈالا جائیگا، جسکا بخل کیا تھا اور
(اٰل عمران - ۱۸۰)	آسمانون کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہو

ذرا ذرا سے فرق سے قرآنِ پاک مین بیسیون جگہ یہ آیت ہے،

وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانون مین
	اور زمین مین ہے،

اسی طرح بیسیون مقام پر تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہی،

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانون اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی)
	اُسی کی ہی،

منافقون نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کرین، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہین، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائین، اللہ تعالیٰ نے منافقون کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی، اور ساتھ ہی منافقون کے اس زعمِ باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ اُن کے دینے سے ہوگا تردید کی، فرمایا،

ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا	وہی لوگ ہین جو کہتے ہین، کہ خدا کے

عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ	رسول کے پاس جو لوگ ہین اُن پر
حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۝ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ	خرچ نہ کرو، تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہوجائین
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ	اور اللہ ہی کے ہین خزانے آسمانون
الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۔	کے اور زمین کے اور لیکن منافقین
(منافقون - ۱)	سمجھتے نہین ہین،

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی کی کل چل رہی ہی اُن کے بل بوتے سے ہے، خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ مین جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جان سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا،

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اسی کے پاس ہین آسمانون کی اور
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ	زمین کی کنجیان پھیلا دیتا ہے روزی
وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ	جس کے لئے چاہے اور ناپ دیتا
عَلِيْمٌ (شوریٰ - ۲)	ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہی

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونون انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہین، اگر ایک مین انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے مین انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبۂ صبر

لہ (یا) یہان تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہوجائیں،

کی آزمایش ہے، فرمایا،

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ	سو آدمی جو ہے جب اُس کا مالک
رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ	اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ؕ وَاَمَّآ	اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے
اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ	مالک نے مجھے عزت دی، اور جب
رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ؕ	اس کو جانچے تو اس کی روزی اس
كَلَّا	پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے
(فجر)	مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونون خدا کے کام ہین اور مصلحت سے ہین، دولتمند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی مین کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چارون طرف سمٹی آرہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کیلئے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہین، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظون مین کھینچکر اس کی غلطی بتائی ہے،

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا	سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے
ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا	تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی
قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ	طرف سے اس کو کوئی نعمت دین

بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	تو کہے کہ یہ تو مجھے علم[1] پر ملا ہے (خدا
لَا يَعْلَمُوْنَ، قَدْ قَالَهَا	فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ	اس کو نہیں سمجھتے، یہی بات ان کے
اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ	پہلوں نے کہی تھی[2]، تو ان کو انکی
فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا	یہ کمائی کام نہ آئی، اور جو کمایا تھا
وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ	اس کی برائیاں اُن پر پڑیں، اور
سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا	جو ان میں سے گنہگار ہیں، ان پر
وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ اَوَلَمْ	بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے
يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ	والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے، کیا
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ	ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	جس کے لئے چاہتا ہے، پھیلاتا کر
يُّؤْمِنُوْنَ،	اور (جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا

[1] اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہی کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا دوسرا یہ ہی کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے، (دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ صفحہ ۱۱ مصر ۱۲)

[2] چنانچہ قارون کو جب راہ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا،

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (قصص ۸) قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے،

(زمر - ۵) ہے اس میں ایمان والوں کیلئے البتہ نشانیاں ہیں"

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اُس کے لئے آسان ہو جائے، اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ	اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں، مگر
إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ	یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے، وہ
مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا	جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی
كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ،	دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو
	سونپا جاتا ہے (یعنی قبر) سب (علم
(ھود - ۱)	الہی کی) کھلی کتاب میں موجود ہے"

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے، وہ تقدیر میں اُسی کا حصہ تھا، اس لئے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیرووں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لئے اُن یقینیات کو سلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے وہی سب کو روزی دیتا ہے، خدا تعالیٰ پوچھتا ہے

وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَ	اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان
الْأَرْضِ ءَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ	سے اور زمین سے اللہ کے ساتھ
(نمل - ۵)	کوئی اور خدا بھی ہے۔

روزی دینا اُسی کا کام ہے،

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ، (ذاریت ۳) — بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور، مضبوط،

احادیث مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح کے پر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے، فرمایا "تم باندھو نہین، ورنہ تم پر باندھا جائے گا[1]" یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منھ بند کر دوگے اور دوسرون کو نہ دوگے، تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منھ تم سے بند کر لیگا اور تم کو نہین دے گا، ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "تم مین سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثون کا مال زیادہ پیارا ہے؟" لوگون نے کہا ہم مین کوئی ایسا نہین جس کو اپنے مال سے اپنے وارثون کا مال زیادہ پیارا ہے، فرمایا "تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اُس نے آگے بھیجا، اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے[2]" ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت مین ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا، یا کھا لیا تو اُس کو فنا کر چکا، اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا[3]۔

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہین کہ میرے پاس اُحد پہاڑ برابر سونا ہو، اور میرے

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ باب الحث علی الانفاق [2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ما قدم من ماله فهو له [3] جامع ترمذی باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔ حدیث حسن صحیح،

دن تک اُس مین سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑون، مین کہون گا کہ اس کو خدا کے بندون مین ایسے ایسے داہنے بائین پیچھے بانٹ دو" پھر فرمایا"ہان جن کے پاس یہان زیادہ ہے، ان ہی کے پاس وہان قیامت مین کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائین پیچھے بانٹ دو[1]"

فرمایا"رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اُس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ ہاتھون سے اُس کو صحیح مصرف (حق) مین لٹا رہا ہے، دوسرے اُس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے[2]"

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اُس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) مین ہے اور اُس مین دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو، اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآنِ پاک مین آئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان مین آئے گی،

یہ بھی سخاوت نہین کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے، اور جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے، اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کامون مین لٹا جاؤن، قرآنِ پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پر اثر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلعم ما احب ان لی مثل احد ذہبا [2] صحیح بخاری کتاب العلم،

انداز میں کھینچا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ	سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم
الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ	میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے
اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ	تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے
فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ	مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں
(منافقون-۲)	خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا'

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا.

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دیگا جب
اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ' (منافقون)	اُسکا وقت آجائے اور اللہ کو خبر ہو جو کرتے ہو

اس لئے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے، فرمایا یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی اُمید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو، اور فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا ہے[1]،

فرمایا "اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لئے بہتر، اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لئے برا ہے"[2]

---

[1] صحیح مسلم ص ۱ مصر باب بیان افضل الصدقہ [2] ایضاً باب الید العلیا.

عِفّت و پاکبازی

عفّت و پاکبازی اُن ساری اخلاقی خوبیون کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزّت اور آبرو سے ہے، اسی لئے اسلام نے اس کو اُن اخلاقی محاسن مین گنایا ہے، جو مسلمانون کے چہرہ کا نور ہین، چنانچہ سورۂ مومنون مین مسلمانون کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہین، اُن مین اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہون
حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	کی پاسبانی کرتے ہین، مگر اپنی بیبیون
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ	یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیون) سے
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى	تو اُن پر کچھ الزام نہین، لیکن جو اس کے
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	علاوہ کے طلبگار ہون، تو وہی لوگ
الْعٰدُوْنَ ، (مومنون - ۱)	حد سے باہر نکلے ہوئے ہین،

سورۂ معارج مین مسلمانون کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان مین

ویک عفت اور پاک بازی بھی ہے، فرمایا،

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ، (معارج-۱)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہین،

جن مسلمانون کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، ان مین وہ بھی ہین، جو عفیف اور پاکدامن ہین،

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب-۵)

اور اپنی شرمگاہون کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتین،

ان دونون آیتون سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظ فروج" ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہین، اور فروج اپنے معنی مین ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہین، جو شرم کے قابل لفظون سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پہ بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم مین بالکل ہی بے پردہ ہوگئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزون کے درمیان خلا کے ہین، اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہین جدھر سے دشمنون کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانون کے اعضا مین سے اُس خلا کا نام ہے جو ان کے دونون پاؤن کے بیچ مین ہے، اور جدھر سے دشمنون کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو، اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاک بازی کا جو تخیل ان لفظون کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے،

عفت و پاکبازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ اِحْصَان ہے، جو حِصْن سے بنا ہے، جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہین، اس سے حِصَانٌ، اِحْصَانٌ، مُحْصِنٌ اور مُحْصَنٌ، الفاظ بنائے گئے ہین، پہلا لفظ قرآن مین نہین آیا، مگر عربون کے اشعار مین آیا ہے، اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہین، دوسرے کے معنی حفاظت مین لینے یا حفاظت مین رکھنے کے ہین، یہ قرآن مین تین موقعون پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے بیان مین، ماضی معروف کے صیغہ مین،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا، (تحریم-۲)	شرمگاہ کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ
فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا،	کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس مین اپنی
(انبیاء-۶)	روح پھونکی،

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہین کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح مین لاکر اپنی حفاظت مین لے لیا، لونڈیون کے بیان مین ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح مین آکر بدکاری کرین تو ان کی سزا کیا ہے، فرمایا،

فَاِذَآ اُحْصِنَّ، (نساء-۴)	توجب وہ نکاح کی قید مین آچکین،

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت مین لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَۃٌ (حفاظت مین لائی گئی) نکاح کے سلسلہ مین قرآن مین آیا ہے،

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ ط — حفاظت مین لانے والے نہ مستی

(نسآء - ۴) — نکالنے والے۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ہ — حفاظت مین آنے والیان نہ مستی

(نساء - ۴) — نکالنے والیان۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید مین لایا جائے، صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہین، اسی لئے قرآن پاک مین اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت مین رکھی ہوئی بی بیان) دو معنون مین آیا ہے، ایک بیاہی عورتون کے معنی مین، جیسے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ — اور بیاہی عورتین (یعنی جو عورتین

(نساء - ۴) — کسی کے نکاح مین ہین وہ دوسرے مرد پر حرام ہین)

دوسرے شریف آزاد بیوین کے معنی مین جیسے،

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا — اور جس کو تم مین سے مسلمان شریف و

اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ — آزاد بیویون کے نکاح کا مقدور نہ ہو

(نساء - ۴) — (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتون کی عصمت کے بیان مین قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے،

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ، (نساء - ۴) — پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیان،

یعنی اپنے شوہرون کی غیر حاضری مین اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہین

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جزر ہے، نبی، نبی کے سلسلۂ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی، اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی
أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا، (تحریم ۲)	شرم گاہ کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ
فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا،	کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی
(انبیاء - ۶)	روح پھونکی،

حضرت یوسفؑ نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی،

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ	اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو
فَاسْتَعْصَمَ ط (یوسف - ۴)	وہ بچا رہا !

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لئے کیا،

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَ	تاکہ ہم اس سے برائی اور بیحیائی
الْفَحْشَاءَ ط اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا	کو دور کریں، وہ بے شبہ ہمارے

الْمُخْلِصِيْنَ، (یوسف-۳) چنے بندون مین تھا،

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتون سے پاک رکھے جاتے ہین،

حضرت یحییٰؑ کی تعریف مین فرمایا گیا،

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا اور سردار ہوگا، اور اپنی قوتِ شہوانی
مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ، (آل عمران-۴) پر ضبط رکھتا ہوگا، اور نبی ہوگا صالحین مین سے

اسلام مین اہلِ بیتِ نبوی کی زندگی، جس عفت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظون مین دی،

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یہ لوگ تہمت سے پاک ہین، اُن کے
يَقُوْلُوْنَ ۖ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ لیے بخشایش ہے، اور عزت والی
رِزْقٌ كَرِيْمٌ، (نور-۳) روزی،

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان مین فَاحِشَةٌ[1] آیا ہے، جسکے معنی بہت بڑی برائی کے ہین، جیسے

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (نساء-۳) مگر یہ کہ وہ عورتین کھلی برائی کرین،
وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ اور تمھاری عورتون مین سے جو

---

[1] اس کا یہ منشا نہین ہے کہ قرآن مین ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی مین آیا ہے، بلکہ وہ لغت کے رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے،

نِسَآءِ کُمْ، (نساء-۳) کھلی برائی کرین،

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت مین مسلمانون کو اس برائی سے روکا گیا ہے،

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بیشک یہ

فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا، (بنی اسرائیل-۴) بڑی برائی اور برا چلن ہے،

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہین فرمایا کہ "تم زنا نہ کرنا" بلکہ یہ کہا کہ "تم زنا کے قریب نہ جانا" اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گذرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کامون سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظرون سے یا بیحیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی مین ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے،

اسی لئے اسلام نے اُن ساری باتون کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہین حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے مسلمان مردون اور مسلمان عورتون دونون کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہون تو اپنی نظرین نیچی رکھین،

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ،

(نور - ۴)

اے پیغمبر ایمان والوں سے کہدے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لئے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں،

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لئے اُن پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لئے زمین پر ہولے چلیں، یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح میں فرمایا،

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیوں سے کہدے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى — مگر جو طبعی کھلا رہتا ہے، اور اپنی اوڑھنی

جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ — اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام)

اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ — پر ڈال لیں، اور اپنا سنگار نہ کھولیں، مگر

اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ — اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے

اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ — شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹون، یا اپنے

اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ — شوہر کے بیٹون، یا اپنے بھائیون یا

اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ — اپنے بھتیجون، یا اپنے بھانجون، یا اپنی

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ — عورتون یا اپنے غلامون یا اپنے اُن مرد

مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ — نوکرون کے آگے جنکو غرض نہین، یا اُن

لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ — لڑکون کے آگے جو عورتون کے ستر کے

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ — رمز سے ابھی آگاہ نہین، اور نہ مسلمان

مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ — عورتین اپنے پاؤن سے دھمک دین

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ — کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہین اس کا

الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (نور ع ۴)

علم ہو، اور مسلمانو! تم سب مل کر خدا کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اور حسب ذیل ادب، گو پیغمبر کی بیویون کو خطاب کرکے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتون کیلیے اس مین پیروی کا نمونہ ہے،

۱؎ جیسے آنکھون کا سرمہ، ہاتھون کی مہندی، یا انگلیون کی انگوٹھی، اسی لئے چہرہ ہتھیلیان اور قدم ستر مین داخل نہین ۲؎ یعنی سہیلیان اور خادمائین اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے۔ (روح المعانی) ۱۲

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ — اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر

مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا — کوئی عورت، اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو،

تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ — سو تم دب کر (مردے) بات نہ کرو

الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ — کہ جس کے دل میں روگ ہے، وہ

قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا، وَقَرْنَ — خواہش کرے[1]، اور نیک بات کہو،

فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ — اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو

تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى، — اور جیسے نادانی کے پہلے زمانہ میں [illegible]

(احزاب - ۴) — تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے[2]

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا — اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں

بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّا اَنْ يُّؤْذَنَ — اس کے بدون کہ تم کو اجازت دیجائے

لَكُمْ، الآية، (احزاب - ۷) — (کھانے کی دعوت کیلئے) داخل نہ ہو،

گو یہ حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاکدامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا — اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے

---

[1] یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو [2] التبرج اظہار الزینة للناس الاجانب، (لسان العرب)

بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا — سوا دوسرے گھرون مین نہ جایا کرو،
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ — جب تک خبر نہ کرلو، اور اُن گھروالون
خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ — کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمھارے
(نور-۴) — حق مین، شاید تم یاد رکھو،

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہین کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانۂ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا — اور جب تم مانگنے جاؤ اُن بیویون
فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ — سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ
ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ — کے اوٹ سے، اس مین تمھارے
وَقُلُوْبِھِنَّ ؕ (احزاب-۷) — اور اُن کے دلون کی بڑی ستھرائی ہے،

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ سے ہے، مگر اس مین عام مسلمان گھرون کے لئے بھی حسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے،

مسلمان عورتین جب گھر سے باہر نکلین تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لین، تاکہ اُن کی زیبایش و آرایش کا ہر نقش راہ چلتون کی آنکھون سے اوجھل رہے، اور یہ بھی پتہ چلے ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیان ہین، اُن کو چھیڑنا تو کجا اُن کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ — اے نبی! اپنی بیویون، اور اپنی بیٹیون

وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور مسلمانون کی عورتون سے کہدے
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ	کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادرین
جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى	نیچی لٹکالین، اس سے یہ ہوگا کہ وہ
اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَ	پہچان پڑین گی (کہ یہ شریف ہین)
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝	تو اُن کو ستایا نہ جائے۔ اللہ بخشنے والا
لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ	مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق اور
وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	جن کے دلون مین (بے حیائی کا)
وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ	روگ ہے، اور مدینہ مین جھوٹ اڑانے
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ	والے نہ رُکے، تو ہم تجھے ان پر بھڑکا دینگے
فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ،	پھر وہ نہ رہنے پائین گے اس شہر مین
(احزاب - ۸)	تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتون مین اشارہ مدینہ کے بعض شریرون اور منافقون کی طرف ہے جو مسلمان بی بیون کو جو خاص خاص ضرورتون کے لئے اپنے گھرون سے نکلتی تھین چھیڑتے تھے، اور جب انھین اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دونون کو دو حکم دیئے، شریرون کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئین تو انھین کافی سزا دی جائے، بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے، اور مسلمان بی بیون کے لئے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت

ے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں، اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں، جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور، اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں، اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بیاں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1]، اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ ابن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا، کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے[2]، اور نشان کے لئے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، اسلام نے اگر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری،

---

[1] تفسیر سورۂ نور صفحہ ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر [2] تفسیر سورۂ طبری۔ سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھو،

رحیب قطاب الجیب منہا رفیقۃ ۔ بجس الندامٰی بضۃ المتجرد

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى	اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی
الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا	ہو کر رہنا چاہیں تو اُن سے دنیا کی زندگی
لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	کے عارضی فائدہ کے لئے زبردستی بدکاری
وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ	کرایا کرو، اور جو اُن کو اس پر مجبور
مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ	کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ
رَّحِيْمٌ (نور-۴)	بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے،

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے[1] اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب وہوا زہرآلود ہو جاتی، سنن ابی داود (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی، وحیِ الٰہی نے اُن کی اس درخواست کا یہ جواب دیا،

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ	بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ
مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ	عورت سے نکاح کرے گا، اور بدکار
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ	عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (نور-۱)	کریگا، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے

[1] صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ ۱۲

اس آیت مین انسانی فطرت کی تصویر ہے، کہ بدکار عورتون کو اپنے قبضہ مین لانے کے لئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردون کے دل مین آسکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا،

اَلْخَبِيثٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ	گندی عورتین، گندے مردون کیلئے
لِلْخَبِيثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِينَ	ہوتی ہین، اور گندے مرد گندی
وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبٰتِ ،	عورتون کیلئے، اور پاک عورتین پاک
(نور - ۳)	مردون کیلئے، اور پاک مرد پاک عورتون کیلئے

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاک باز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت مین پسندیدہ نہین، بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے[1] جائز نہین، اور اُنکی

---

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے، یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہی لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے، اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسون سے نکاح کرین، یا انکحوا الایامی منکم اور فانکحوا ما طاب لکم من النساء سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے، لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے، اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے، بلکہ اگر زن و شوہر مین سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کردے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ مین یہی فیصلہ کیا، ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شو مین کفو ہونا شرط ہے، اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہین ہو سکتا، اس لئے یہ نکاح فریقین مین سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہین رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، تو یہ کرنے کے بعد جائز ہے (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی و تفسیرات احمدیہ ملاجیون و تفسیر کبیر رازی و روح المعانی، تفسیر آیت مذکورہ)

دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اُس حدیث سے ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے[1]۔

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے، اُن کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہئے، چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں؛ جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے، اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ	اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور
اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	خدا کو نہیں پکارتے، اور کسی ایسی
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ	جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے
لَا يَزْنُوْنَ، (فرقان - ۶)	خون نہیں بہاتے، اور بدکاری نہیں کرتے

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے، جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں اُن میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اوپر آیا ہے، اور جو حقیقت

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح۔

مین (۲ تقربوا الزنیٰ (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحین ہین، اُن کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ مین بھی فرمائی ہے،

چنانچہ آپ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہین[1]، حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑون مین سامنے آئین تو فرمایا کہ اے اسما جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیون کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہین[2]، حکم دیا کہ مخنث زنان خانون مین نہ جانے پائین[3]، فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو، کہ اس کے اہلِ خانہ کی بے ستری ہو[4]، فرمایا کہ "عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے"[5]، سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گذرنے والون مین تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ "عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ چلے"[6] تاکہ مردون کی بھیڑ بھاڑ اور دھکون سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اُس کے شوہر کی غیر موجودگی مین اکیلا نہ جائے[7]، کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہون یا اُن پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا تو

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرۃ الفجاءۃ [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المرأۃ زینتہا [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت [5] ابوداؤد کتاب الترجل باب فی المرأۃ تطیب للخروج [6] ابوداؤد کتاب الادب باب[6] فی مشی النساء فی الطریق، [7] مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ و الدخول علیہا،

اُس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے[1]،

یہ ساری ہدایتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو،

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ اُن کے لئے جو سوسائٹی کی عزت وحرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے،

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا	بدکاری کرنے والی عورت، اور
كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ	بدکاری کرنے والے مردان میں سے
جَلْدَةٍ، (نور-۲)	ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ،

احادیث میں یہ آیا ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بدکاری میں پکڑے جائیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لئے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے اُن میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا،

وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ	اور وہ بدکاری نہ کریں گی، اور نہ اپنی
وَلَا يَاْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ	اولاد کو مار ڈالا کریں گی، اور نہ اپنے
بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ،	ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت، [2] یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی،

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو، یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو،[1] اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں، یہ ساری باتیں عفت اور پاکدامنی کے خلاف تھیں، اس لئے ان سے باز رکھا گیا، اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں سے[2] اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا،[3] بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا، اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پر بیعت کی،[4]

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف

---

[1] مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گذرا ہے [2] صحیح بخاری فتح مکہ [3] تفسیر طبری، سورۂ ممتحنہ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان،

خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم مین اسی کوڑے مارے جائین گے، اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی، اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہون تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے، اور اگر دونون اپنے دعوون پر قائم رہین تو اسلام مین دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعوی کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے[۱]،

اسلام کی نظر مین حقوق اللہ مین تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے، اور حقوقِ عباد مین تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے، اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاکبازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ حالانکہ اُس نے تم کو پیدا کیا، بولے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گا، بولے اس کے بعد فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی[۲]،

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ	اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے

[۱] اس کی تفصیل سورۂ نور مین ہے، اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہین اگر شرع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے، بخاری باب اللعان [۲] بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل معہ

اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	معبود کو نہ پکارین، اور ناحق (ناروا)
الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ	کسی شخص کو جان سے نہ مارین کہ
وَلَا يَزْنُوْنَ ،	اس کو خدانے حرام کر رکھا ہے اور
(فرقان - ۶)	نہ زنا کے مرتکب ہون،

حدیث مین اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ دونون جرم اپنی نوعیت مین بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک ہین کہ جن سے یہ امید نہین ہوسکتی اُن سے یہ فعل ظہور مین آیا، اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا،

ایک حدیث مین ہے کہ" زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے، اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھون کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہین رہتا[1]" کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے، اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہین کرتا، اس حالت مین ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی مین گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے، تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے،

اسلام مین زانیون کی سزا بعض حالتون مین سو کوڑے مارنا، اور بعض حالتون مین سنگسار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت مین جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے

[1] بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شرب الخمر،

بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگون کے اُخروی عذاب کی دردناک صورتین دکھائی گئین اُن مین بدکارون کے عذاب کی صورت اُن کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس مین بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتین تھین، جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اُس کے اندر سے نکل آئین گے لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے،[1] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہیگا،

اس کے بخلاف پاکباز اور پاک دامن لوگون کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز مین بیان کئے گئے ہین، ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا خداوند تعالیٰ سات آدمیون کو اپنے سایہ مین لے گا جن مین ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مین خدا سے ڈرتا ہون،[2]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازون کو آخرت مین حاصل ہوگا، لیکن پاکبازی کی دنیوی برکتین بھی کچھ کم نہین، ایک حدیث مین آپ نے زمانۂ قدیم کے تین آدمیون کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، کہ دفعۃً پانی برسنے لگا، تینون نے پانی

---

[1] بخاری کتاب الجنائز [2] بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش ۔

سے بچنے کے لئے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سو، اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منھ بند ہو گیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے خدا سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی،

خداوندا میرے ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں بڑی محبت رکھتا تھا، میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دیدوں وہ راضی نہ ہوئی، میں نے سو دینار کما کر جمع کئے، اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ خدا سے ڈرو، میں فوراً رک گیا، خداوندا اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا دے، چنانچہ وہ سرک گیا۔[1]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو اُن اعمال میں شمار کرتی ہے، جن سے خدا کا قرب ملتا، اور دعا، کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے،

[1] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعاء من برّ والدیہ،

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملون مین جو اخلاقی جوہر، مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار مین ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اُس کو پوری دیانت سے رتی رتی دیدے، اسی کو عربی مین امانت کہتے ہین، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوعِ انسانی کے سپرد کیا ہے، **امانت** کے لفظ سے ادا کیا ہے،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی	ہم نے (اپنی) امانت آسمانون پر اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ	زمین پر اور پہاڑون پر پیش کی، تو
الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا	انھون نے اُس کے اٹھانے سے انکار
وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	کیا، اور اس سے ڈرے اور انسان
الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا	نے اس کو اٹھا لیا، بے شبہہ وہ ظالم
جَهُوْلًا، (احزاب - ۹)	اور نادان ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانون کے سپرد ہوئی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کرین، اگر ہم ایسا نہ کرین تو خائن ٹھہرین گے،

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اُس کے خاص بندون پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندون کے لئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لئے قرآن مین اس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے،

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ، (شعراء-۱۱) س پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری، (شعراء-۱۱)

مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ، (تکویر-۱) اُسکا کہا مانا جاتا ہی، وہان امانت والا ہے

اکثر پیغمبرون کی صفت مین بھی یہ لفظ قرآن مین آیا ہے کہ انھون نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا،

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ، (شعراء-۱۰) مین تمھارے لئے امانتدار قاصد ہون

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہون، اس مین اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہین ہے،

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والون کی طرف سے "امین" کا خطاب ملا تھا، کیونکہ آپ اپنے کاروبار مین دیانتدار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپکے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں اُن کو واپس کرتے تھے،

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ، (مومنون-۱)

اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں،

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبد الدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ اُن کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری[1]

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا، (نساء-۸)

بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے مالکوں کے حوالہ کردیا کرو،

اس حکم کے مطابق یہ امانت اُن کو واپس کی گئی، انھوں نے سبب پوچھا تو حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے، وہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا اُن پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہوگئے[2]، بہرحال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے، اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اُس کا اطلاق یکساں ہوگا، اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے، جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی[3] ہے، اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے[3]، اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں، جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے،

---

[1] تفسیر کشاف زمخشری [2] ایضاً [3] تفسیر ابن جریر طبری،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپیے پیسے، جائداد اور مالی اشیار تک محدود نہین، جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہین، بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپکے پاس رکھی ہے، تو اس کے مانگنے پر یا یون بھی اس کو جون کا تون دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اُس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس مین آپ ہون، اور کچھ باتین آپ دوسرون کے متعلق وہان سُن لین تو اُن کو اُسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسرون تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنے کسی نج کے کام مین مشورہ مانگا تو اس کو سُن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے، اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرالیتا ہے، یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے،

قرآنِ پاک اور حدیثون مین ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے، ان مسلمانون مین جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوشخبری سنائی ہے، وہ بھی ہین،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول و
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ، (مومنون - ۱)	قرار کی پاسبانی کرتے ہین،

پھر جن مسلمانون کو جنت مین عزت کی جگہ دی جانے والی ہے اُن مین بھی وہ داخل ہین،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول و
عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ، (معارج-١)	قرار کی پاسبانی کرتے ہین،

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر مین گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی،

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ	تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہئے کہ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ،	اپنی امانت ادا کر دے اور چاہئے
(بقرہ-۳۹)	کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے،

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے مین حیلے حوالے نہ کرے، یا اس مین بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھین، کہ انھی چیزون کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے،

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ	اور اپنی امانتون مین جان بوجھ کر
تَعْلَمُوْنَ ، (انفال-۳)	خیانت نہ کرو،

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر مین دو لڑکیون کی بکریون کے پینے کے لئے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری اُن سے نہین مانگی، اور اُن لڑکیون مین سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے اُن کی تعریف کی، اور سفارش کی کہ اُن کو نوکر رکھ لیجئے،

تو اس موقع پر قرآنِ پاک کی یہ آیت ہے:

يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ، إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ، (قصص - ۳)	اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہی جو طاقتور اور امانتدار ہو،

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو، اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اسکی اہلیت کا ثبوت دے، اور اس کو پوری دیانتداری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دوربیں نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے،

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کرکے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کے رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں،

جس طرح قرآنِ پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے

اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ مین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتین سنی تھین، ایک کو تو آنکھون سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپنے فرمایا کہ امانتداری لوگون کے دلون کی جڑین اتری ہے (یعنی اُن کی فطرت ہوتی ہے) پھرانھون نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا، (یعنی فطری امانت کے جوہر مین کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہین کہ پھر آپنے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا "پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا، اور امانت اُس کے دل سے نکال لی جائے گی، اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا، اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی، اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اُٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہین ہوتا، لوگ ایسے ہوجائین گے کہ لین دین کرین گے، لیکن کوئی امانتداری نہین کرے گا، اس وقت ایمانداری کی مثال ایسی کمیاب ہوجائے گی، کہ لوگ مثال کے طور پر کہین گے کہ فلان قوم مین ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل مین رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی[1]"!

حدیث کے پہلے ٹکڑے مین انسانون مین ایمانداری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے، اور بتایا گیا ہے

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ (کتاب الفتن والرقاق) وصحیح مسلم ومسند احمد وترمذی وابن ماجہ،

آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے،

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا، جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں، جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں، اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو، اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا.......

اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی، اور اگر اُس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہیگا وہ اُس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا، بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے[1]،

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں"[2] اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے،

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اُس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا "جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے[3]" اسی لئے آپ نے فرمایا کہ مجلس

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ حیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل، و بیہقی فی شعب الایمان [3] ادب المفرد بخاری باب المستشار مؤتمن،

مین جو باتین ہون وہ امانت ہین، یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہیئے، اِلّا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا المجالس بالامانۃ یعنی نشستین امانت کے ساتھ ہون، مگر تین موقعون پر، کہین کسی کے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبرو ریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لینے کی سازش ہو تو متعلقہ لوگون کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیئے،

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہی، بلکہ میان بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتین ہوتی ہین، وہ بھی ایسے راز ہین جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے، راز کے یہی معنی نہین ہین کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہین چاہتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً اودھر اودھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے، امانت مین خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہی،

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطون کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لے کر اس کے حقوق ادا کرنے مین کمی کرتا ہے، یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ

---

[1] ابو داؤد باب فی نقل الحدیث [2] ابو داؤد کتاب الادب [3] ایضاً [4] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق،

کی دی ہوئی امانت مین خیانت کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ "عورتون کے باب مین خدا سے ڈرو" فرمایا "کیونکہ تم نے اُن کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت مین لیا ہے"[1]

قیامت کی نشانیون مین آیا ہے کہ "سب سے پہلے اس اُمت سے امانت کا جوہر جاتا رہیگا، اور سب سے آخر مین جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی، اور کتنے نمازی ہین جن کی نمازون کا کوئی حصہ خدا کے ہان نہین"[2] فرمایا "میری اُمت اُس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہین سمجھے گی[3] یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی، اور کار خیر مین دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہین سمجھین گے اُن کی فطری صلاحیت باقی رہے گی،

[1] صحیح مسلم، حجۃ الوداع [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۱ از طبرانی وابن مبارک وحکیم ترمذی وابن عباس
[3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۱ از سنن سعید بن منصور،

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اُس کی بہت سی اخلاقی خوبیون کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والون کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس مین ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے، اور بہت سے گناہون سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے،

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہان وہی ہون گے جو اس کی ذاتِ اقدس کے لائق ہین، مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندون کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن اُن کو پکڑتا نہین، اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہی اُس کو نامراد نہین لوٹاتا، حدیث مین آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونون ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے"، ایک دفعہ تین صاحب مجلسِ نبوی مین آئے، آپ کے اردگرد

لہ بیہقی کتاب الاسماء والصفات الہ آباد ص ۴۹

صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اُس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آکر بیٹھا، وہ خدا کی پناہ میں آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا خدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا اس نے خدا سے منہ پھیرا،[1] تو خدا نے بھی اس سے منہ پھیرا،

سورۂ بقرہ میں ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا، (بقرہ-۳)	خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں،

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے، وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ، (احزاب-۷) "خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا" حدیث میں بھی ہے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ،[2] "اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں" قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لئے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے"[3]

---

[1] بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام [2] بخاری کتاب الادب باب ما لا یستحیی من الحق [3] صحیح مسلم کتاب التوبہ، عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے، مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب ہو جاتے ہیں، غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں، جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی،

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر مین دو لڑکیون سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھین تاہم یہ وصف اُن مین ایسا نمایان تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا، اُن کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیون کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیون کو پانی نہین پلاتی تھین، تاکہ مردون کی کشمکش سے الگ رہین، اور جب ان کے باپ نے ان مین سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیئے بھیجا،

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي	تو ان دو لڑکیون مین سے ایک شرماتی
عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ۔ (قصص ۔ ۳)	ان کے پاس آئی،

اس آیت مین واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح و ستایش بھی مقصود ہے،

یہ وصف انسان مین بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے، اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے، اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگون کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اسی لئے اسلام نے اسکی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، ستر عورت کا خیال، نگاہین نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتون کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہان تک کہ غسل خانہ اور خلوت مین بھی اسکی اجازت نہ دینا، اسی لئے ہے کہ آنکھین شرم کے منظر سے جھینپتی رہین، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی، تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بچے تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپ اینٹین

اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے، آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی، ہوش آیا تو زبانِ مبارک پر تھا، میرا تہبند، حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا[1]، نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں،

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا[2]،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ نشین کواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے،

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ (احزاب-۷)

تمھاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا،

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لئے اُس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لئے حیا، کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعتِ مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے، اور وہ یہ ہے

---

[1] بخاری کتاب الحج باب فضل مکۃ و بنیانہا [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء،

کہ امرِ حق کے اظہار مین شرم وحیا دامنگیر نہ ہو، لیکن دوسرون کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی مین تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اُٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کررہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔[1]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جزء ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزون سے روکتی ہے، اس لئے وہ دونون ایک ہی ہین، لیکن جن لوگون مین فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے، اُن کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے مین مدد ملتی ہے، اس لئے بذاتِ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہین بلکہ اصلاح کے قابل ہے، اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہانتک اظہارِ حق، وعظ وپند، تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کردیا جائے، اور شریعت نے ان موقعون پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً خدا نے قرآنِ مجید مین جابجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتون کو ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندون کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہین شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہین

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء،

چھوڑ دیا، فرمایا،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے مین
مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا،	(ذرا بھی) نہین جھینپتا (چاہے وہ
(بقرہ-۳)	مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ مین صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتین کرتے رہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہین کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگون کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوت کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا،

إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ
فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي	تمہارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ تو حق
مِنَ الْحَقِّ، (احزاب-۷)	(بات کے کہنے) مین (کسی کا کچھ) لحاظ

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگون کو اپنے پاس سے اٹھا دینا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لئے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے لوگون کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے مین شرم وحیا، کا موقع نہین،

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہین اور یہ سمجھتی ہین

کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم وحیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزان نہیں آتی، اکابر صحابہ اس درخت کے نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چونکہ کمسن تھے اس لئے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم وحیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لئے جب حضرت عمرؓ سے انھون نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی[1]

انصاریہ عورتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتون کے مسئلے پوچھتی تھین، اور یہ اُن کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہین،

نعم النساء نساء الانصار	انصار کی عورتین کس قدر اچھی تھین
لم یکن یمنعھن الحیاء ان	کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو
یتفقھن فی الدین[2]	حیا نہین روکتی تھی،

ان موقعون یعنی تبلیغ ودعوت، پند ونصیحت، ارشاد وہدایت، تعلیم وتعلم اور

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما لا یستحی من الحق للتفقہ فی الدین [2] مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسک فی موضع الدم،

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیار انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الحیاء لایاتی الا بخیر[1]	حیار سے صرف بھلائی پہنچتی ہے،

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے مین باک نہین ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہین ہے، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبۂ حیا ہے جو انسان کو برائیون سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہین سکتا، اس لئے فرمایا کہ

ان مما ادرک الناس من	لوگون نے پرانے پیغمبرون کی جو
کلام النبوۃ الاولی اذا	باتین پائی ہین، ان مین ایک یہ ہے
لم تستحی فاصنع ما شئت[2]	کہ اگر تم مین شرم و حیا نہین تو جو چاہے

امام نووی[3] نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے، کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہین کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو،

قرآن و حدیث مین جہان جہان فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہین ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہین، اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کیساتھ ان تمام کامون سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیار، [2] بخاری کتاب الادب باب اذ لم تستح فاصنع ماشئت،
[3] فتح الباری ج ۱۰ صفحہ ۴۳۴،

اسی بنا پر حدیث شریف مین آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خاص خلق حیا ہے[1]، یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخین ہین، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے[2]، فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہان تک کہ تنہائی کی حالت مین بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہین چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو، کیونکہ تمھارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہین جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہوجاتے ہین تو اُن سے شرماؤ اور اُن کا خیال رکھو[3]،

مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھون سے گرنے نہ پائے،

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع،

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اُس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے اسی لئے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی "بڑا رحم والا" ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام "رحیم" آتا ہے، یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآنِ پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے، اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہی دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کی رحمت کے جلوؤں کے سوا کچھ اور نہیں ہے، خدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً   اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت

وَّعِلْماً، (مومن - ۱) | اور علم مین ہر چیز کو سما لیا ہے،

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، (حشر - ۳) | وہی رحم والا مہربان ہے۔

مسلمانون کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤن مین کہین،

وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ، (مومنون - ۶) | اور تو سب رحم کرنے والون مین سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے،

دنیا مین رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہین، وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہین، چنانچہ حدیث مین ہے کہ "خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کئے، جن مین سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لئے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اُتارا، اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہین، یہان تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پانون نہین رکھتا کہ کہین اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے"[1]

بنی نوعِ انسان مین محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبرون کی ذات ہے، اور پیغمبرون مین سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور خداوند تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے،

لَقَدْ جَاۤءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ | لوگو! تمھارے پاس تم ہی مین کے ایک رسول آئے ہین، تمھاری تکلیف

---

[1] بخاری کتاب الادب،

عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ — ان پر شاق گذرتی ہے، (اور) اُن کو تمہاری

رَّحِيْمٌ — بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت

(توبہ - ۱۶) — شفیق (اور) رحیم ہیں،

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں، اور ان امتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے،

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ — اور جو لوگ اُن کے پیرو ہوئے ان کے

اتَّبَعُوْهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً، (حدید - ۴) — دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈالدیا،

اور اس وصف میں امتِ محمدیہ بھی اُن کی شریک وسہیم ہے،

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى — اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہیں وہ

الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ، — کافروں پر زور آور ہیں، آپس میں

(فتح - ۴) — رحم دل ہیں،

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحمِ مادری سے پیدا ہوتے ہیں، اور رحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے، اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

الرحم شجنة من الرحمٰن[1]، — رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله،

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے، اور ساری رحمدیون کے جذبے اس کی شاخین ہین، بچون کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے،

حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہین کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونون زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونون پر رحم کر کیونکہ مین ان دونون پر رحم کرتا ہون[1]"

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ "تم اس پر رحم کرتے ہو"؟ اس نے کہا "ہان" ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو، اور وہ سب رحم کرنے والون سے زیادہ رحم کرنے والا ہے[2]

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن علیہ السلام کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہین، مین نے اُن مین سے کسی کا بوسہ نہین لیا، آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ جو شخص رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا،

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچون کو چومتے ہین، لیکن ہم لوگ نہین چومتے، ارشاد ہوا کہ "خدا نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے[3]"

---

[1] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ [2] ادب المفرد باب رحمۃ العیال [3] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ،

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹون پر ترس کھانا اُمتِ محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لئے فرمایا کہ جو شخص ہمارے چھوٹون پر رحم نہین کرتا وہ ہم مین سے نہین ہے[1]" اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹون اور زیر دستون پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹون تک نہین، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹون تک وسیع ہی، خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے قرآنِ مجید نے صحابۂ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہی" رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ" یعنی وہ لوگ آپس مین رحمدل ہین، اور حدیث مین اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال مین بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانون کی باہمی رحمدلی، باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دُکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے[2]، جس کے معنی یہ ہین کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانون کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہین، اور انفرادی طور پر مسلمانون کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہین، اس لئے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ مین تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ مین تمام مسلمانون کو شریک ہونا چاہئے،

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانون ہی کے ساتھ مخصوص نہین ہے بلکہ اُس کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اور اس مین تمام بنی نوعِ انسان شامل ہین، چنانچہ

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان [2] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں مین عام رحم کی تعلیم دی ہے، اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانون پر رحم نہین کرتا خدا بھی اُس پر رحم نہین کرے گا، یہ بھی فرمایا کہ رحم کرنے والون پر، رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا، زمین والون پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا[1]،

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہین ہے، بلکہ اس مین بے زبان جانور بھی شامل ہین، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا، تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا[2]، ایک شخص نے آپ کی خدمت مین عرض کی کہ مین بکری کو ذبح کرتا ہون تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، آپ نے دو بار فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا[3]،

جانورون کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لئے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی[4]،

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظون مین دی ہے، جو بلاغت کی جان ہین، فرمایا،

---

[1] بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس [2] ادب المفرد باب رحمۃ البھائم [3] ادب المفرد باب ارحم من فی الارض [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البھائم،

من لا یرحم لا یُرحم۔ جو رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا۔

ان دو لفظون کی تشریح دفترون مین نہین سماسکتی، رحم دلی کا ہر منظر، اور شفقت وکرم کا ہر جذبہ انہی دو لفظون سے اُبھارا جاسکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہی کہ جو دوسرون پر رحم نہین کرتا اس پر خدا بھی رحم نہین فرمائے گا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو دوسرون پر رحم نہین کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہین کھائین گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح مین لکھا ہے کہ "اس مین تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لئے اس مین مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہین، اور اُن کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، اُن پر ہلکا بوجھ لادنا اور اُن کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزین اسی رحم مین شامل ہین۔" غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیمون کی غمخواری، بیکسون کی تسکین، بیمارون کی تسلی، غریبون کی امداد، مظلومون کی حمایت اور زیردستون کی اعانت کرتے ہین، اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لئے مبارک ہین وہ جو رحم کرتے ہین، کہ اُن پر رحم کیا جائے گا،

لہ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم ؎۲ فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۰ مصر،

عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصّوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو، تو اس کو عربی میں "عدل" کہتے ہیں[1]، اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے، اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں،

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علما نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو حق ہے[2]، قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے، فرمایا:

[1] مفردات راغب اصفہانی [2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۷، الٰہ آباد،

وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ ، (مومن-۲) اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہو،

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت مین ہو،

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ ، (احزاب-۱) اور اللہ حق بات کہتا ہے ،

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ دونون باتین قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت مین یکجا ہین،

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا اور تیرے رب کی بات سچائی اور

وَّعَدْلًا ، (انعام-۱۴) انصاف کیساتھ پوری ہوگئی،

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات مین اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے، اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہو، ارشاد ہوتا ہے،

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا

ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ کوئی اور خدا نہین، اور فرشتون نے

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ، (آل عمران-۲) اور علم والون نے، وہی خدا انصاف کو لیکر کھڑا ہے

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل وانصاف صرف نظم وسلطنت ہی کے لئے مخصوص نہین ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ مین عدل کی ضرورت ہے، اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت مین جن

اچھی باتون کا حکم دیا ہے، ان مین سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ، (نحل-۱۳) — بے شبہہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے،

عدل قانون کا اقتضا ہے، اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے، جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہین کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبون کو لے کر اُن مین عدل و انصاف کا حکم دیا ہے، مثلاً معاشرتی زندگی مین عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگون کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتون سے نکاح کرتے ہین، اس لئے ان لوگون کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے،

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، (نساء-۱) — پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کر (کئی بیبیون مین) انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا)، یا جو (لونڈی) تمہارے قبضہ مین ہو،

عورتون کی طرح یتیمون کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لئے فرمایا،

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ	اور (خاصکر) یہ کہ یتیمون کے حق مین
(نساء - ۱۹)	انصاف کو ملحوظ رکھو،

عام معاملات مین عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید وفروخت مین وزن و پیمانہ مین ہے، اس لئے فرمایا:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ	اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری)
بِالْقِسْطِ. (انعام - ۱۹)	ناپ کرو اور (پوری پوری) تول،

قرآن مجید کی متعدد آیتون مین بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول مین بے انصافی نہ کی جائے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لئے وزن و پیمانہ مین کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام و وسیع ہے۔ اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار مین کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح مین سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے،

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات مین ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو مین عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے۔ تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ	اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی
بِالْعَدْلِ. (بقرہ - ۳۹)	لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے،
فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ	پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر

سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا	وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے
یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ	مطلب نہ کر سکتا ہو تو (جو) اس کا
فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ	مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ
(بقرہ ۴۔۳۹)	(دستاویز کا) مطلب بولتا جائے

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتون مین اکثر لوگون کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اُس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت مین بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہین رکھتی

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ	اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے)
ذَا قُرْبٰی	جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا
(انعام ۔ ۱۹)	قرابت مندہی (کیون نہ) ہو انصاف
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	مسلمانو! خدا واسطے انصاف کیساتھ
قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ	گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگون
بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ	کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب)
شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا	کی باعث نہ ہو کہ (معاملات مین)
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى	انصاف نہ کرو (نہین ہر حال مین)
	انصاف کرو کہ (شیوۂ) انصاف
(مائدہ ۔ ۲)	پرہیزگاری سے قریب تر ہے،

پہلی آیت مین یہ بتایا گیا ہے کہ تمھاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت مین یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے، اور یہ کہ ہر حال مین عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے،

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسولِ اسلام علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے،

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ	اور کہدے کہ مین ہر اس کتاب کو مانتا
مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ	ہون جو اللہ نے اتاری، اور مجھے
بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ	(خدا سے، یہ حکم ملا ہے کہ مین تمھارے
لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ	بیچ مین انصاف کرون، اللہ رب ہے
لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	ہمارا اور تمھارا، ہم کو ہمارے کامون
اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ	کا بدلہ ملنا ہے، اور تم کو تمھارے
الْمَصِيْرُ،	کامون کا، ہم مین تم مین کچھ جھگڑا
(شوریٰ - ۲)	نہین، اسی کی طرف سب کو پھر جانا ہے

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک مین ہے اس کے کئی پہلو ہین، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو مین برابر برابر تم سب کو پہنچادون، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمھارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے، بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ اب تک تم مین مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے

کہ دولتمندون اور عزت والون کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگون کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے، میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے، اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص، اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکسان اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہین، اس لئے اس کے سب غلامون کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہیئے، ہم کو ہمارے اعمال، اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اس مین جھگڑنے کی کوئی بات نہین، سب کو قیامت مین اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا، اس کو ویسا انعام ملے گا، اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی،

عدل و انصاف کی راہ مین ان دونون سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ مین بھی عدل و انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم کی روشنی مین اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہوا،

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو! انصاف کی حمایت
قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ	مین کھڑے ہو، اللہ کے لئے گواہ بنو.
لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ	اگرچہ تمہارا اپنا اس مین نقصان ہی ہو
وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا	یا ماں باپ کا، یا رشتہ دارون کا، اگر
اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا	وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے، تو اللہ

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوْا	تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے، تو تم
وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ	انصاف کرنے مین اپنے نفس کی خواہش
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۔	کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم زبان ملو گے یا
(نساء - ۲۰)	کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تمھارے کام سے واقف ہے

ان آیتون مین عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات مین عدل و انصاف کی حمایت تمھارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو، اور خدا واسطے کہو، عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی مین نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ مین آئے، نہ عزیزون اور قرابت دارون کا، نہ دولتمند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی مین کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی مین دولتمند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ، اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو یا کہو، پھر سچ کہنے مین کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہہ مین پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو، تو یہ سب باتین عدل اور انصاف کے خلاف ہین، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ مین ردوبدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ مین ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ مین کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لئے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے،

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی مین مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہین ہو سکتا، اس لئے نہ گواہون کو اس لئے طرفداری کرنی چاہئے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل مین لانا چاہئے، بلکہ دونون کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہی اُن کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھکر ولی ہے لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی مین اسی لئے غلط بیانی کرتے ہین کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونون بندون کے حق مین تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمھاری کم بین نظر تو اس پاس تک جاکر رہ جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر مین سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندون کے ساتھ وہ کرتا ہے جس مین اُن کی بھلائی ہے، غور کیجئے کہ ان لفظون مین عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی مین کسی خاص انسان کی بھلائی کے لئے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لئے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہین ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت مین سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی، اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے، غلط گو انسان

کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے،

اسی لئے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں گناہ ہے، اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا	اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں
فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ	کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ
بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ-۲۳)	اور تم جان رہے ہو،

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ[1] ہے،

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لئے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے، اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں، اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا:

---

[1] تفسیر روح المعانی،

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا
فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ
حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ
فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا
بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔
(الحجرات - ۱)

اور اگر (تم) مسلمانون کے دو فرقے آپس
مین لڑ پڑیں تو ان مین صلح کرا دو، پھر
اگر ان مین کا ایک (فرقہ) دوسرے
پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے
اس سے تم (بھی) لڑو یہان تک کہ
وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے، پھر جب
رجوع لائے تو دونون مین برابری
کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو
ملحوظ رکھو، بیشک اللہ انصاف کرنے

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لئے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لئے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہین، اسی لئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے، کہ عادل ہو، ارشاد ہوا

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا
حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (نساء - ۸)

بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں
امانت والون کو پہنچا دو، اور یہ کہ جب
لوگون کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے
لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو،

اہلِ تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیتِ پاک مین "امانت" سے مراد منصفانہ فیصلہ

اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہیئے، خدا نے اس آیت مین اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے، اور یہ فیصلہ دوست و دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکسان عدل و انصاف کیساتھ ہونا چاہیئے، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیون کے معاملات مین حکم ہوا،

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ	اور اگر فیصلہ کرو تو اُن مین انصاف
بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	کے ساتھ فیصلہ کرنا، کیونکہ اللہ انصاف
(مائدہ - ۶)	کرنے والون کو دوست رکھتا ہے

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والون کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید مین اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہین کی گئی ہے، تاہم اشاراتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوت نطق سے محروم نہ ہو، صاحبِ علم ہو، چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ	اور خدا ایک دوسری مثال دیتا ہے
اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ	کہ) دو آدمی (ہین) ان مین کا ایک
عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ	گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ) پرایا

أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

(النحل - ۱۰)

غلام کہ خود) کچھ نہیں کرسکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اُس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا، کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں، جو (لوگوں کو) عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود سیدھی راہ پر بھی ہے

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہیئے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا، اور قادر ہونا چاہیئے کیونکہ حکم سے علوے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے، اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا، اور عالم ہونا چاہیئے تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل وانصاف کی صفت، قدرت، اور علم دونوں کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیئے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیئے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لئے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیئے تاکہ وہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے،

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل وانصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی

شعبہ ایسا نہین ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو،

ان آیات کے رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے تاہم امام و حاکمِ وقت کے لئے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے حدیث مین امامِ عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصون کو خدا اپنے سایہ مین لے گا، جن مین ایک شخص امام عادل ہوگا[1]۔

---

[1] بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش،

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول و قرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ، (آل عمران و رعد) بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيعَادَ، (زمر-۲) اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ، (آل عمران-۲۰) (اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهُ، (روم-۱) اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

وَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهُ، (حج-۶) اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ،

فَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهُ، (بقرہ-۹) تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا۔

وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ، (توبہ-۱۴) اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندون کی خوبیون مین سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کرین وہ پورا کرین، اور جو قول وقرار کرین اس کے پابند رہین، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے، اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے، اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہین، لیکن اسلام کی نگاہ مین اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی اُن تمام صورتون پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً، اور اخلاقاً فرض ہے، اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لئے قرآنِ مجید مین بار بار اس کا ذکر آیا ہے، اور مختلف حیثیتون سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ مین ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	اور اپنے قرار کو جب قول دین پورا
عٰهَدُوْا، (بقرہ ۲۲)	کرنے والے،

بعض آیتون مین اس کو کامل الایمان مسلمانون کے مخصوص اوصاف مین شمار کیا گیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ	اور وہ جو اپنی امانتون اور اپنے عہد
عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، (مومنون ۱)	کا پاس ملحوظ رکھتے ہین،

ایک دوسرے سورہ مین جنتی مسلمانون کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اُس تصویر

کا ایک رخ یہ ہے،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ	اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد
عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۔ (معارج ۔ ۱)	کا پاس کرتے ہیں،

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے، اس لئے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا، اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ	اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ (قیامت
كَانَ مَسْئُوْلًا ۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ	میں) عہد کی بازپرس ہو گی، اور جب
اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ	ناپ کرو، تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو،
الْمُسْتَقِيْمِ ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ	اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی
اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔	رکھ کر تولا کرو۔ (معاملہ کا) یہ بہتر طریق
(بنی اسرائیل ۔ ۴)	ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے،

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لئے تاکیداً پابندیٔ عہد

کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کیلئے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہین، بلکہ عرفِ عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول وقرار ہین،

تمام عہدون مین سے سب سے پہلے انسان پر اُس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو خدا اور اس کے بندون کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست کو بندون نے اپنے خدا سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے، اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت مین کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل مین بندون مین آپس مین ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے، اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے،

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ	جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا
وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ	کرتے ہین، اور اپنے اقرار کو نہین
وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ	توڑتے، اور جو خدا نے جن تعلقات
بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ ،	کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُن کو جوڑے
(رعد-۳)	رکھتے ہین،

اس آیت مین پہلے اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے، جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول وقرار کا جو باہم انسانون مین ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری

عہد کا ہے، جو خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان قائم ہے،

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو خدا کو حاضر و ناظر بتا کر یا خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا،

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۔ (نحل-۱۳)	اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو، اور قسموں کو پکی کرکے توڑا نہ کرو، اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے،

اس معاہدہ کے عموم میں صحابۂ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے، اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں، جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کئے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں، جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں،

سورۂ انعام میں ایک اور عہدِ الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا،

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔ (انعام-۱۹)	اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے، تاکہ تم دھیان رکھو،

اس عہدِ الٰہی مین خدا کے وہ فطری احکام بھی داخل ہین، جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے، یا خدا نے تم سے لیا ہے، اسی طرح اُس نذر اور منت کو شتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے، اور انسانون کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمین کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہین،

صلحِ حدیبیہ مین مسلمانون نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریقِ مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی، اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت مین اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت تھا جس مین مسلمانون کے مذہبی اخلاق کی آزمایش کی جا سکتی تھی، کہ اپنی قوت اور دشمنون کی کمزوری کے باوجود وہ کہان تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہین، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال مین اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی، اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ اُن کو چار مہینون کی مہلت دو۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ	اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے
اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	اُن مشرکون کو پورا جواب ہے جن
الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ	سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا	(تم اے مشرکو!) ملک مین چار مہینے

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۔ (توبہ-۱) اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکون اور مسلمانون کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہین رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکون کے ساتھ ایفاے عہد کی تاکید کی گئی جنھون نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا،

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	مگر جن مشرکون سے تم نے عہد کیا تھا،
الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ	پھر انھون نے تم سے کچھ کمی نہین کی،
شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ	اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ	تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ	مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ
الْمُتَّقِيْنَ ۔ (توبہ-۱)	کو خوش آتے ہین تقوی والے،

اور ان مشرکون کے ساتھ اس ایفاے عہد کو اللہ تعالی تقوی بتاتا ہے، اور جو اس عہد کو پورا کرین اُن کو متقی فرمایا، اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر اُن مشرکون سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، اللہ تعالی مسلمانون کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش مین ان عہد شکن مشرکون کے ساتھ اُن مشرکون کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جاے جنھون نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے،

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ	مشرکون کو کیسے اللہ کے پاس اور اُسکے
عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ	رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْ تُّمْ عِنْدَ	جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا	معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے
لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ	رہین تم اُن سے سیدھے رہو، بیشک
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔ (توبہ -۲)	اللہ کو تقوی والے خوش آتے ہین'

سیدھے رہنے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہین تم بھی اپ عہد کو پورا کرتے رہو، اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کرین، اُن کا شمار تقوی والون مین ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ مین تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے، اور تقوی والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہین، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفار اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے، اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے،

قرآنِ مجید مین قریب قریب اسی عہد کے معنی مین ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے،

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا	مسلمانو! (اپنے) قرارون کو
بِالْعُقُوْدِ ۔ (مائدہ -۱)	پورا کرو،

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہین، اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیون کی گرہ ہے، اور اصطلاحِ شرعی مین یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر مین لکھتے ہین :-

"اوفوا بالعهد" خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے، "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" اور اس قول مین تمام عقد مثلاً عقدِ بیع عقدِ شرکت، عقدِ یمین عقدِ نذر عقدِ صلح اور عقدِ نکاح داخل ہین، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضا یہ ہے کہ دو انسانون کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونون پر اس کا پورا کرنا واجب ہے[1]"

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہان تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسنِ عہد مین داخل ہے، صحیح بخاری مین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہین آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر اُن کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کا ذکر کیا کرتے تھے، اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت اُن کی سہیلیون کے پاس ہدیۃً بھیجا کرتے تھے[2]، یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی اُن کی سہیلیون کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو اُن کی زندگی مین جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب مین ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "حسن العھد من الایمان" اور اس باب کے تحت مین اسی حدیث کا ذکر کیا ہے،

حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۵۰۰ [2] بخاری کتاب الادب باب حسن العھد من الایمان

ایک بڑھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئی، آپ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہین، تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟ اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہ رضی نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا عائشہ، یہ خدیجہ کے زمانہ مین ہمارے یہان آیا کرتی تھی اور حسنِ عہد ایمان سے ہے" یعنی اپنے ملنے جلنے والون سے حسب توقع یکسان سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث مین فرمایا ہے، اور حضرت انس رض کہتے ہین کہ آپ ہر خطبہ مین اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے،

لا دین لمن لا عہد لہ، (احمد طبرانی وابن حبان) جس مین عہد نہین، اس مین دین نہین،

یعنی اُس قول وقرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعہ کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہین کرتا، وہ دین کی روح سے محروم ہے،

احسان

یعنی

بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، اور اس لئے اس کی صورتین اتنی بے شمار ہین کہ اُن کا احاطہ نہین کیا جاسکتا، البتہ ان تمام صورتون کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اُس کو آرام پہنچے،

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا جس کے احسانات کی حد و پایان نہین عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اسی کے احسانون کی جلوہ نمائی ہے،

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، (ابراھیم-۵)

اور اگر اللہ کے احسان گنو، تو ان کو پورا نہ گن سکو گے، بیشک انسان بے انصاف ناشکرا ہے،

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس احسان کا شکر کرتے کسی

وسفارش کے بغیر اُن کو قید خانہ سے نجات دی، اور وہ اُن کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا، ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں،

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ	اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے
مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ	قید خانہ سے باہر لایا، اور آپ لوگوں
الْبَدْوِ، (یوسف - ۱۱)	کو گاؤں سے یہاں لے آیا،

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفت محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے، فرمایا

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ، (قصص)	تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا،

(حاشیہ صفحہ ۴۸۶) لہ اس موقع پر ایک بات خیال میں رہے، عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں، اُردو میں جن معنوں میں ہم اِحسان کا لفظ بولتے ہیں، عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں اِلیٰ یا ب کے صلہ کے ساتھ ہوگا قرآنِ پاک میں جہاں جہاں مُحْسِنٌ یا مُحْسِنِیْنَ یا مُحْسِنُوْنَ کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں، ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لئے جائیں گے، اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے، لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے، جیسے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، (توبہ-۱۵)	بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا،
لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (زمر-۶)	کاش اگر میرے لئے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ، (آل عمران-۱۴)	اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے،

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر اَدَلا بدلا اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے احسان، حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے، اور قرآن مجید میں جا بجا اسکی اہمیت کی تاکید آئی ہے، چنانچہ سورۂ نحل میں حکم کی صورت میں ہے،

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ	اللہ انصاف اور لوگوں کے ساتھ
الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى	احسان کرنے کا اور قرابت والوں
(نحل - ۱۳)	کو دینے کا حکم دیتا ہے،

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں، اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابتدار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لئے خداوند تعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت میں (رکوع - ۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے، اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے (بقرہ ۹ - زخرف - ۷، انعام - ۱۹، اسرائیل - ۳)

بہرحال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے، اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے، اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ	اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ
(قصص - ۸)	احسان کیا ہے تو بھی (اوروں کیساتھ) احسان کر

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں،

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ	اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور
مِنَ السِّجْنِ،	بھی بڑے بڑے) احسان کئے ہیں کہ
(یوسف - ۱۱)	(بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، اُن کے علاوہ اور بھی سیکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں، جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا، اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کیساتھ اس کو الگ کردو، فرمایا،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ

(بقرہ ع-۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہوسکتا وہ تو دو ہی طلاقین ہین جو) دو دفعہ (کر کے دی جائین) پھر (دو طلاقون کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت مین) رکھنا ہے یا حسن سلوک کیساتھ (رخصت کر دینا)

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو، اور اُنکی ادائی مین لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا،

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۤءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ،

(بقرہ ع-۲۲)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف کردیا جائے، تو (جان کے بدلے خونبہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطابہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خونبہا کا) (ادا کرنا)

قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا اور اُن کے مقابلہ مین غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے، کہ جو اس صفت سے متصف ہون وہ بھی خدا کے محبوب بندون مین ہون گے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ، اور اللہ ان محسنون (یا نیکی کرنے والون)

(آل عمران - ۱۴) کو پیار کرتا ہے ،

احسان کے لئے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے. اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کئے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف مہر[1] واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کردے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ خلق ہے، اور یا شوہر پورا ادا کردے، اور آدھا کاٹے نہین تو یہ مرد کا حسنِ خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے،

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ، اور آپس[2] مین فضل کو مت بھولو،

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ، بے شک اللہ تمھارے کامون کو

(بقرہ - ۳۱) دیکھ رہا ہے ،

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والون کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کرین اور احسان سے باز نہ آئین[3]، فرمایا،

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ اور تم مین جو احسان اور کشایش والے

---

[1] یعنی جس حالت مین کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہین،
[2] سعید سے روایت ہے "آپس مین فضل کو مت بھولو" یعنی احسان کو مت بھولو"، ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر [3] کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور، بعضوں نے یہان "فضل" سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا ہے۔

مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا | مین، وہ قرابت دارون، غریبون
اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ | اور خدا کی راہ مین ہجرت کرنے والون
وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ | کو نہ دینے کی قسم نہ کھالین، ان کو چاہئے
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا، (نور-۳) | کہ معاف کرین اور درگذرین،

احسان کے اسی وسیع معنی مین اسلام نے ایک اور جامع لفظ "معروف" کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف مین داخل ہے، قرآن کا حکم ہے وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (اعراف-۲۴) اور نیکی کرنے کو کہہ، اور اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

كُلُّ معروفٍ صدقةٌ، | ہر نیکی ثواب کا کام ہے،

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لئے غریب و امیر کی تخصیص نہین، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے" فرمایا "کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے" فرمایا "غریب حاجتمند کی اعانت کرے" صحابہ نے کہا کہ "اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟" فرمایا "نیکی کے کرنے کا حکم دے" صحابہؓ نے کہا کہ "اگر وہ ایسا نہ کر سکے" ارشاد ہوا کہ "برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لئے صدقہ ہے" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث مین آیا ہے کہ "آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے، وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا

بھی اسی مین داخل ہے[1]۔

اسی معنی مین قرآن مجید نے ایک اور لفظ "بر" کا استعمال کیا ہے، اور اس وسیع دائرے مین کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	جو لوگ تم سے دین کے بارے مین
لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ	نہین لڑے اور انھون نے تم کو تمھا رے
لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	گھرون سے نہین نکالا ان کے سا تھ
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا	احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے
اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ،	سے تو خدا تم کو منع کرتا نہین (کیونکہ)
(ممتحنہ - ۲)	اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والون کو

صحابہ مین کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلمون پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہین سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمھارا نہین میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی، اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملیگا[2]، ارشاد ہوا،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ	تیرا ذمہ نہین ان کو راہ پر لے آنا،
اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ،	لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ،	چاہے، اور تم جو دوگے خیرات سو

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقہ مع فتح الباری [2] ابن جریر و ابن کثیر بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ	اپنے واسطے اور تم نہین دیا کرتے لیکن
اللّٰہِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ	اللہ کی خوشی چاہ کر، اور جو دوگے
یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ	خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی
(بقرہ ۔ ۳۷)	اور تمہارا حق مارا نہ جائیگا،

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت مین ساری دنیا سمائی ہے،

نیکی کا بدلہ نیکی سے دنیا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب وعذاب کا دارمدار ہے، جو نیک کام کرین گے ان کو خدا کے ہان سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا،

ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا	بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر
الْاِحْسَانُ ، (رحمان ۔ ۳)	بھلائی ،

گویہ آیت پاک اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت مین نیک کامون کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظون کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دُنیا اور آخرت دونون کو شامل ہے،

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرضدارون پر احسان کرنا، ضرورتمندون کو قرض دینا اور تنگدست مقروضون کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور رہون، اُن کا قرض معاف کردینا ثواب کا کام بتایا ہے،

عرب میں سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض نہیں ادا کر سکتے تھے، وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے اُن کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لئے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے،

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ	اور اگر (کوئی) تنگدست (تمہارا مقروض)
اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا	ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور
خَيْرٌ لَّكُمْ،	اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر
(بقرہ - ۳۸)	ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ "قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا، جن میں ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی"[1] اس کو اور بھی موکد کر دیا اور قرض کے معاملہ میں تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا، اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری

کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہین کرتا تھا لوگون کو قرض دیتا تھا، اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازمون سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو، شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ مین اس سے درگذر کیا، دوسری حدیث مین ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا، جس سے موت کے بعد فرشتون نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہین، فرشتون نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہین لوگون کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے مین مین آسانی کرتا تھا، اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا، یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا، اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا[۱]،

اس قسم کی بہت سی روایتین ہین، ایک حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے[۲]، یہی روایت مسند ابن حنبل مین ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے، کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ مین ہوگا[۳]،

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسرون کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص مین محدود نہین کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ مین وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی

[۱] کتاب البیوع باب من انظر معسرا و باب من انظر موسرا و صحیح مسلم باب فضل انظار المعسر [۲] مسلم کتاب البیوع باب فضل [۳] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۰۔

موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو، اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔"

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، تو کیا جب اس کا گذر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ ہی دوں؟ فرمایا "نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔"

ایک موقع پر ارشاد ہوا "ایسے نہ ہو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کرو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے، اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔"

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لئے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت

لہ صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح ۔ لہ جامع ترمذی باب ما جاء فی الاحسان والعفو ۔ لہ جامع ترمذی ایضاً ۔

ہے، اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے، حضرت براء بن عازب صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا تمہاری تقریر گو مختصر ہے، لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانوں کو آزاد کرو، اور گردنوں کو چھڑاؤ۔" اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے، اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے، اور لگاتار دیتے رہو، اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ، اور پیاسے کو پلاؤ، اور نیکی کے کام کرنے کو کہو، اور برائی کے کام سے باز رکھو، اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔[1]

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا "جو روزی خدا نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔" عرض کی "اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو" فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے" عرض کی "اگر اس کی زبان معذور ہو" فرمایا "مغلوب کی مدد کرے" عرض کی "اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو" فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے" عرض کی "اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو" فرمایا "اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے"[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب [2] مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۳،

عفو و درگذر

عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ رہے، اور دم کے دم مین یہ گناہون سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص نامون مین سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ، غَفُورٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے،

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ	اور وہی ہے جو اپنے بندون کی
عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ	توبہ قبول کرتا ہے، اور برائیون کو
السَّيِّئَاتِ، (شوریٰ-۳)	معاف کرتا ہے،

وہ چاہے تو انسانون کے گناہون کے سبب سے اُن کو ایک دم ہلاک کر دے، یا اُن کو معاف کر دے، فرمایا:-

اَوْ يُوبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوا	(اگر خدا چاہے تو) گنہگارون کو اُن
وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ،	کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے
(شوریٰ-۴)	اور بہتون کو معاف کر دے،

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کرکے یوں دلاتا ہے

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (طٰہٰ - ۴)

اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشایش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر (راہ پر رہے)

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غافِرٌ (بخشنے والا)، پانچ دفعہ غفّارٌ (بڑی بخشایش کرنے والا)، اور اتنے ہی دفعہ عَفُوٌّ (معاف کرنے والا) اور سترسے زیادہ آیتوں میں غفورٌ (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے، خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے، فرماتا ہے

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء - ۲۱)

یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بیشک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے، تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں۔[1]

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصور وارون کو معاف کرینگے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصورون کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت مین اس اشارہ کی پوری تصریح ہے فرمایا!

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا اَلَا	اور چاہیے کہ وہ معاف کردین اور
تُحِبُّونَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ	درگذر کرین، کیا تم نہین چاہتے کہ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ،	خدا تم کو معاف کرے ، اور اللہ معاف
(نور - ۳)	کرنے والا مہروالا ہے ،

اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے لوگون کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسرون کو معاف کرو تو خدا تمہین معاف کرے گا، اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹین پڑنی چاہئین، چنانچہ جن مومنون کے لئے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، اُن کی ایک صفت یہ بتائی ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ	اور جب غصہ آئے تو وہ معاف
(شوریٰ - ۴)	کرتے ہین ،

سکون کی حالت مین معاف کرنا اتنا مشکل نہین، جتنا غصہ کی حالت مین، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہین رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن مین یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت مین بھی اپنے آپ کو قابو مین رکھتے ہین، اور قصور والون کو معاف کردیتے ہین۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان مین ہے، کہ ان احمقون کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہین مانتے، ان کے دعوی کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہین، اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہکر دیتے ہین، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى	اور اگر تم اُن کو راہ راست کی طرف بلاؤ
لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ	تو (تمھاری ایک) نہ سنین اور (بظاہر)
اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ	وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہین کہ (گویا)
خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ	وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہین حالانکہ
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ،	وہ دیکھتے نہین، (اے پیغمبر) درگذر
	(کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگون سے)
(الاعراف - ۲۴)	نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلون سے کنارہ

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتین ہوسکتی ہین، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ مین ان ناگواریون کو برداشت کیا جائے، خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریون کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہین بلکہ اس سلسلہ مین برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو،

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ	(اگر کوئی تمھارے ساتھ بدی کرے
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۔	تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو

(مومنون - ۹۰) جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے

مذہبی جماعت کے لئے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ اُن لوگوں کو بھی اُن سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں، لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	(مسلمانو:) اکثر اہلِ کتاب باوجودیکہ
لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ	اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی)
كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ	اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں
أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ	کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم
لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا	کو کافر بنادیں، تو معاف کرو، اور
حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ،	درگذر کرو، یہاں تک کہ خدا اپنا
(بقرہ - ۱۳)	حکم صادر فرمائے،

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے، اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزا و سزا کے قائل ہو، اس لئے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ اُن کو مل جائے گا، فرمایا:

قُل لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا	ایمان والوں سے کہدے کہ اُن کو

لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ	جو اللہ کے جزاو سزا کے واقعات پر
لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا	یقین نہیں رکھتے معاف کردیا کریں،
یَکْسِبُوْنَ، مَنْ عَمِلَ صَالِحًا	تاکہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے
فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْہَا	جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے
ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ تُرْجَعُوْنَ،	کے لئے کیا، اور جس نے برا کیا اس نے اپنا
(جاثیہ - ۲)	برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس پھیرے جاؤ گے

اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی، اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگذر کی نصیحت فرمائی۔ (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیتِ بالا)

لہ اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے، عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے، لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے۔ اور اس لئے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے، لکھتے ہیں :-

"اس آیت (وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰہِلِیْنَ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں۔ اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے، اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں، کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں، مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔" (جلد ۴، صفحہ ۴۹۶)

غم و غصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۴) ایک اور آیت (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں، کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو" (ج ۶ صفحہ ۳۰)

آیت وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

"کلبی اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا، لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا، اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے، اور عزت و آبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے" (ج ۶ صفحہ ۴۹۶ طبع دار الطباعۃ العامرہ مصر)

آیت یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، (جاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ اُن سے قتال نہ کیا جائے، لیکن جب خدا نے اُن سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا، لیکن قریب بصحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں، کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے، اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کیا جائے" (جلد ۷ صفحہ ۴۰۰ طبع مصر)

میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں، اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے اُن ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے، اور وہ حقوق عباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں، تو مسلمان معاف کر دیں، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں، اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے، اس لئے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں،

درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابو مسلم خولانی صحابی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا، اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے، (ج ۶ صفحہ ۳۵ مصر)

حضرت مسطحؓ حضرت ابو بکرؓ کے رشتہ دار تھے، اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انھون نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تہمت مین حصہ لیا تو حضرت ابو بکرؓ نے انکی مالی امداد بند کر دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ	اور تم مین سے جو لوگ صاحب احسان
وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ	اور کشایش والے ہین قرابت والون
وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ	اور محتاجون اور اللہ کی راہ مین ہجرت
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَ	کرنے والون کو (مدد و خرچ) نہ دینے
لْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ	کی قسم نہ کھا بیٹھین، بلکہ (چاہیے کہ ان
يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ	کے قصور) بخش دین، اور درگذر کرین
رَحِيمٌ،	(مسلمانو!) کیا تم نہین چاہتے کہ اللہ
(نور - ۳)	تمھارے قصور معاف کرے، اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسرون کے قصور کو معاف کریگا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا،

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہین اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے،

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ	اور اپنے پروردگار کی بخشایش اور

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

(آل عمران - ۱۴)

اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان (کا پھیلاؤ، بھی سمائی) اُن پرہیزگاروں کے لئے بنایا ہے جو خوشحالی اور تنگدستی (دونون حالتون) مین (خدا کے نام پر؟) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگون (کے قصورون) سے درگذر کرتے ہین، اور (لوگون کے ساتھ) نیکی کرنے والون کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت مین متقیون کے دو وصف ایک ہرحال مین راہِ خدا مین دینا، اور دوسرا لوگون کو معاف کرنا، اور درگذر کرنا اور اُن کے لئے دو جزا ہین، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت، بیان کی گئی ہین، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہرحال مین خدا کی راہ مین دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حد و پایان آسمان و زمین ہے، اور غصہ کو روکنا اور لوگون کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہوگی، اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا،

عفو و درگذر کی اس اخلاقی تعلیم مین اگر قوت اور قدرت کا جزء شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہو جائے، اسی لئے اسلام نے اس

اخلاقی تعلیم کے درس مین اس نکتہ کو فراموش نہین کیا ہے، اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طپانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے،

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَهُمُ	اور جو ایسے (غیرت مند) ہین کہ جب
الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَ	اُن پر (کسی طرح کی) بے جا زیادتی
جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ	ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ
مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ	لیتے ہین، اور برائی کا بدلہ ہے ویسی
فَأَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا	ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف
يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○	کر دے اور صلح کرے تو اُسکا ثواب
(شوریٰ-۴)	اللہ کے ذمہ ہے، بیشک وہ ظلم کرنے

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے، اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس مین عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے، اور بتا دیا ہے، کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہون جو بے سبب ظلم کر بیٹھین، یا وہ جو انتقام کے جوش مین آگے بڑھ جائین، خدا کی محبت سے محروم ہین،

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگذر خودداری کے منافی نہین ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو مین رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے، اسی لئے فرمایا،

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ	اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ،	کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ
(شوریٰ-۴)	بڑی ہمت کے کام ہین،

ایک اور آیت مین اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسکی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکر دشمنی دوستی کی صورت مین بدل جاتی ہے،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا	اور بھلائی اور برائی برابر نہین (اگر
السَّیِّئَةُ ۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب
فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ	اچھائی سے دو، پھر تو تیرے اور جس کے
عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝	درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا
وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ	گویا دوست ہی ناتے والا، اور یہ بات
صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا	ملتی ہے انہی کو جنہین صبر ہو اور یہ بات ملتی ہے
ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ	اسکو جسکی بڑی قسمت ہو، اور اگر (اس میں)
مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ	شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ
بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (حٰمٓ سجدہ-۵)	جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ، بیشک وہی ہے سننے جاننے والا

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے، اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، حضرت ابن عباس رضؓ سے اس آیت کی تفسیر مین منقول ہے کہ انھون نے کہا

"خدا نے اس آیت مین ایمان والون کو غیظ و غضب مین صبر کا، اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا، اور برائی کے مقابلہ مین عفو و درگذر کا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کرین گے تو خدا اُن کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا"[1]

ابو مسعود صحابیؓ کہتے ہین کہ مین ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے، ابو مسعودؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ مین نے پھر کسی غلام کو نہین مارا،

ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ مین اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کرون، آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا، تب آپ نے فرمایا، "ہر روز ستر دفعہ"[2] اس سے مقصودِ نبوی تعداد کی تحدید نہین بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے،

---

[1] ابن کثیر تفسیر آیت مذکور [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی ادب الخادم مین یہ دونون حدیثین ہین،

بعض لوگون کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے اُن کے رعب و داب اور وقار مین فرق آجائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہین، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے، اور کمزورون پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہین پیدا ہوتا، یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[1]،

وما زاد اللہ رجلاً بعفوٍ الّا عزًّا، اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہے، نہین بڑھاتا ہے مگر عزت مین

[1] ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی التواضع،

حلم و بُردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہین کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیا جائے، اور قصوروار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندون کی برائیون سے چشم پوشی کرتا ہے، اور انتقام نہین لیتا، اور اسی لئے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہان جہان اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کردیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا۔

وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۔ (بقرہ۔ ۳۰ مائدہ ۱۴۔) اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۔ (آل عمران ۔ ۱۶) بیشک اللہ ہی بخشنے والا بردبار،

اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۔ (اسرائیل ۵ ملائکہ ۵) بیشک وہ (اللہ) ہی بخشنے والا بردبار،

ان سب آیتون مین اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت

کا ذکر کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت
کا نتیجہ نہین، بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے، دوسری جگہ علم کے ساتھ اپنی صفتِ
علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ۔ (نساء-۲) اور اللہ ہے جاننے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ۔ (حج-۸) بیشک ہے اللہ جاننے والا بردبار،

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا۔ (احزاب-۶) اور ہے اللہ جاننے والا بردبار،

ان آیتون سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانون کی طرح بے جانے بوجھے
یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہین کرتا، بلکہ پورے علم، اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر
ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفتِ استغنا کا
بھی ذکر فرماتا ہے،

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔ (بقرہ-۳۶) اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے،

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لئے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ مستغنی ہے، اور بردبار ہے،
انسانون مین بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام
کے مقابلہ مین حلم، اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لئے کسی کو زیادہ قرینِ
مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے، کہ اس کو انتقام سے زیادہ
حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل
استغنا کے ساتھ ہے،

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت مین تعریف کے قابل ہے لیکن اسکی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اُس سے بعض کم فہمون کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے، اور اسی لئے اس کے مقابلہ مین اُن مین سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندون کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لئے اُس نے اپنے حلم اور دارو گیر دونون کو پہلو بہ پہلو جگہ دیا ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندون مین مایوسی، اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ، (بقرہ ۱۰-۳۰)	اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلون مین ہے، تو اس سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے تحمل والا۔

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ مین ہے، یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہون کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے، اور نکاح نہ کرے دل مین رہے تو کوئی حرج نہین، اس کے بعد ارشاد ہے، کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہین رہ سکتی، اس لئے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لئے اس سے پُر اُمید بھی رہنا چاہئے،

نیکی کے کامون مین مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے، اور ایسے لوگون

کے گناہ معاف کرتا ہے، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے،

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا	اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض
یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ	دینا تو وہ اس کو دونا کردے گا،
وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ،	اور تمھین معاف کرے گا، اور اللہ
(تغابن۔ ۲)	ہے قدردان اور تحمل والا،

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا، اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت مین تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصور والے کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھون سے چھپ جاتے ہین، اور اس کی خوبیان نظرانداز ہو جاتی ہین، اس لئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے، یا اس مین ایک عیب ہے، مگر اس مین کچھ خوبیان بھی ہین، تو اس کی ان خوبیون کی قدر کرکے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرماکر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے،

صفتِ حلم سے انبیاے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہین، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ جن کی بنیادون پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھون اسلام کی

عمارت تعمیر ہوئی ہے، خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے، انھون نے اس کافر باپ کے ہاتھون طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علٰحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی اُن کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہین چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق مین دعاے خیر کرتے رہے، جب تک اُن کو پوری مایوسی نہین ہوگئی، اور اُن کو قطعی طور سے معلوم نہین ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ مین ہے،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ، (توبہ - ۱۴)

اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کیلئے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر دیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہوگیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہوگئے، بیشک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اسکی مغفرت مانگنے)

دوسری آیت مین اس موقع پر جہان قوم لوط کی بربادی کی خبر پاکر وہ اللہ تعالیٰ

سے عرض معروض کرتے ہین، اُن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ	بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل
(ھود - ۷)	اور رجوع کرنے والے تھے،

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف مین حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف مین اَوَّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لئے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہین، لیکن ایک اور آیت مین حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسبت فرمایا ہے،

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ	تو ہم نے اُن کو (ابراہیم کو) ایک بڑے
(والصّٰفّٰت - ۳)	بردبار لڑکے (اسمٰعیل کے پیدا ہونے)
	کی خوشخبری دی،

اس کے بعد جب اُن کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو اُنھون نے کہا ہے،

يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ	اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے،
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ	(بے تأمل) اسکی تعمیل کیجئے، انشاءاللہ
(والصّٰفّٰت - ۳)	آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائین گے،

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزء ہے، حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہی، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو خدا پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا،[1] یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو"[2] اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا"[3]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں اُن کے ساتھ ملتا ہوں[4] وہ کاٹتے ہیں، میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ "اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو، تو تم اُن کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو، اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی"[5]

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التانی والعجلہ [2] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب [3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب [4] یعنی صلہ رحم کرتا ہوں۔ [5] صحیح مسلم باب صلۃ الرحم و ادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے، اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے، اور پتھر کو بھی موم کر دے۔

اللہ تعالی نے کئی آیتوں میں اپنے کو "لطیف" فرمایا ہے[1]، اور حدیثوں میں اس کا

---

[1] راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں:

"وہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے" (لفظ لطف)

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں:-

"خدا کا نام لطیف اس لئے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کیلئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے۔ ... لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا۔ اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا ... ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔" (ص ۴۹ الہ آباد)

امام غزالی کہتے ہیں:

"اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، ان تک پہنچاتا ہے، جن کے حق میں وہ مفید ہیں، جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں، اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہے۔"

(روح المعانی، تفسیر سورہ شوریٰ)

نام رفیقؐ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہین کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندون کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے مین رفق ولطف فرماتا ہے، اور اپنے اس تلطف مین وہ اُن کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہین کرتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور اُن کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعون سے مصر لے آیا، اور دشمن بھائیون کو جس طرح اُن کے سامنے نادم وشرمندہ کرکے اُن کے آگے سرنگون کردیا، اس کو یاد کرکے وہ فرماتے ہین۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ	بے شک میرا رب لطف کرنے والا
هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ،	ہے جس بات کا چاہے۔ بیشک وہی
(یوسف-۱۰)	علم والا، حکمت والا ہے،

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلین پیش آئین اور پھر وہی مشکلین جس طرح اُن کی کامیابی کا ذریعہ بنین، اُن کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا، اور اسی کو اس کی خبر تھی، ایک دوسری آیت مین اللہ تعالیٰ اپنے بندون کے ساتھ اپنے رفق وتلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے،

صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الرفق ۱۲

اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ	اللہ اپنے بندون پر لطف فرماتا ہے،
مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ	جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے، اور
(شوریٰ-۲)	وہی قوت والا غالب ہے،

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنون اور کافرون کا ذکر ہے، اور

نیچے بھی ان دونون قسمون کا تذکرہ ہے، بیچ مین یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر و مومن دونون کے ساتھ ہے کہ دونون کو یکسان وہ رزق پہنچاتا ہے[۱]، اور اسی لئے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطافِ بے کران کا ایک نتیجہ ہو

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ[۲] کے حق مین جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہِ الٰہی مین گو یہ دعا مستجاب نہ ہوئی، مگر ابراہیمؑ خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا،

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ) بیشک ابراہیم نرم دل بردبار تھے

اسی طرح جب وہ قومِ لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ، (ھود-۷) بیشک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے،

اَوَّاہ کے معنی مین مفسرون کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائین مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینون باتین پوری اترتی ہون، وہ ہر شخص کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے

[۱] تفسیر روح المعانی مین مقاتل کا یہی قول ہے، صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو اوضح جانتے ہین [۲] حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پاکر اس کے بعد ان سے اپنی علٰحدگی ظاہر کر دی،

اس لئے جلد بھیج جاتے تھے، اور یہ اس لئے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا، چنانچہ اسی لئے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السّلام فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کو بھیجے جاتے ہیں تو اُن کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں،

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ	سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا،
يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۔ (طٰہٰ-۲)	شاید وہ نصیحت پائے یا (عذاب سے) ڈرے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے، اور اسی لئے دینِ حنیف کے مبلغِ اعظم اور توحید کے داعیِ اکبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصّہ وافر عنایت فرمایا تھا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ	تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم اُن کے
لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ	لئے نرم دل ہوئے، اور اگر تم مزاج
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ،	کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے، تو
(آل عمران-۱۷)	یہ لوگ تمھارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے

اس لئے ایک پیغمبر کیلئے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو، اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں، اور اسی لئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور

پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا،

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگذر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض اُن تمام اخلاق کے عطر کا نام جن مین شانِ جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے، جس طرح حسن فطرت، زینت و آرایش سے دوبالا ہو جاتا ہی، اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظون مین سمجھائی، فرمایا۔

اِنَّ الرِّفق لا یکون فی شیئ	نرمی جس چیز مین ہو اس کو زینت
الا زانہ ولا ینزع من شیئ	دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر
الا شانہؐ	لی جاتی ہی اس کو بدنما بنا دیتی ہی

"جس چیز" کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز مین نرمی کام کو بناتی، اور سختی بگاڑتی ہے، الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو،

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نرم خو (رفیق) ہے، اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر یا اسکے علاوہ کسی اور چیز پر نہین دیتاؐ جریر بن عبد اللہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو نرمی سے محروم رہا، وہ بھلائی سے محروم رہاؐ" اور فرمایا کہ "تین

لہ۔ لہ۔ لہ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق،

خصلتین جس شخص مین ہون گی خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا، اور اس کو جنت مین داخل کرے گا، یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ مان پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔[1]

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپنے دوسرے الفاظ مین یون دی۔

الا اخبرکم بمن یحرم علی	کیا مین تم لوگون کو بتاؤن کہ کون
النار و تحرم علیہ النار	شخص آگ پر حرام ہو اور کس پر آگ
علی کل قریب ھین سھل[1]	حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگون سے
	قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو،

ایک بار یہودیون کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ سمجھ گئین، اور انھون نے جواب مین کہا "وعلیکم السام واللعنۃ" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ عائشہ ٹھہر جاؤ، خدا تمام کامون مین نرمی کو پسند کرتا ہے، بولین یا رسول اللہ انھون نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہین سنا، فرمایا مین نے بھی تو کہدیا کہ علیکم یعنی تم پر۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب مین یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس مین سختی کا نشان نہین، اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو،

---

[1] ترمذی ابواب الزہد [1] ایضاً [2] بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے، اُس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدودِ الٰہی مین سے کسی حد کو توڑ ڈالے، اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفّار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں، اور اپنی ضد پر اڑے رہین، بلکہ مسلمانون کو آزار پہنچانے کے درپے ہون تو اُن کے شر کو روکنے اور اُن کی سازشون کے قلع و قمع کرنے کے لئے اُن پر پوری سختی کی جاسکتی ہے، فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے پیغمبر! کافرون اور دغابازون
وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (تحریم-۲)	سے جہاد کرو اور ان پر سختی رکھو،

دوسری جگہ فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا	اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے
الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ	کافرون سے لڑتے جاؤ اور چاہیے
وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً، (توبہ)	وہ تم مین کڑاپن پائین،

اسی طرح شریعت کے گنہگارون کو جب سزا دی جائے تو مسلمانون کو چاہیے کہ اس کے اجراء مین نرمی نہ برتین، اسلام نے بدکار مردون اور بدکار عورتون کی سزا کے متعلق فرمایا:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ	اور اللہ کے حکم چلانے مین تم کو ان
فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ	دونون پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، (نور-۱)	اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے، اس مین بھی نرمی اور سختی کے مواقع مین یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے، ام المومنینؓ فرماتی ہین کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ مین کبھی کسی سے بدلہ نہین لیا، البتہ جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے[1]" امام بخاری نے ایک خاص باب مین اس قسم کی متعدد حدیثین نقل کی ہین، جن مین آپ نے مسلمانون بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی بات مین سختی برتی ہے[2]، حافظ ابن حجر اس باب کی شرح مین لکھتے ہین :-

"گویا امام بخاری اس باب مین یہ اشارہ کرتے ہین کہ جس حدیث مین یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفون پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن خدا کے حق مین آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا" (فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۹ مصر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو، سختی نہ کرو[3]" شارحینِ حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات مین سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس مین تنگی نہ کی جائے، ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ مین ایک شرعی غلطی ہوگئی، انھون نے اپنی قوم کے لوگون سے کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [2] باب ما یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالی [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا۔

ڈرسے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انھون نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی مین حاضر ہوکر حقیقتِ حال عرض کی، ارشاد ہوا کہ "ایک غلام کی گردن آزاد کرو" وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہین" فرمایا لگاتار دو مہینے روزے رکھو" گذارش کی کہ "یا رسول اللہ روزہ ہی مین تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھون، فرمایا "ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلاؤ" عرض پرداز ہوئے کہ "قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک مین رات گذاری ہے" فرمایا کہ "صدقہ کے فلان محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لو اس سے ساٹھ مسکینون کو کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ" وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم مین آئے اور اپنی روداد بیان کرکے بولے کہ "مین نے تمھارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی"[1]

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی الظہار،

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے، جس مین کوئی اُس کا شریک نہین،

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (جاثیہ-۴) — اور اُسی کو بڑائی ہے آسمانون مین اور زمین مین اور، وہی زبردست ہے حکمت والا،

اس لئے بندون کی شان نہین کہ وہ کبریائی کرین، اُن کی بندگی کی شان اس مین ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کرین، اور، عاجزی وفروتنی برتین،

تواضع وخاکساری کے بہت سے مظہر ہین، قرآنِ مجید نے اُن مین سے نمایان مظاہر کو لے کر بعض موقعون پر اُن کا حکم دیا ہے، اور دوسرے موقعون پر اُن کو اپنے خاص بندون کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کفار سے درگذر کا، پھر مومنون کے ساتھ پُر محبت تواضع کا حکم دیا ہے،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (حجر-۶) — اور اپنا بازو مومنون کیلئے جھکادے

دوسری جگہ فرمایا،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ ــــ اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے

اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ، (شعراء-۱۱) ــــ جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پُرمحبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے،

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ ــــ اور ماں باپ کے لئے عاجزی کا

مِنَ الرَّحْمَةِ ، (بنی اسرائیل-۳) ــــ بازو مہر و محبت سے جھکا دے،

"خفض جناح" یعنی بازو جھکا دینا، تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازؤں کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ[۱] کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبّر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ ــــ اور رحمت والے (خدا) کے (خاص)

عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ ــــ بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ، ــــ کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل ان

ــــ سے جہالت کی باتیں کرنے لگیں تو

(الفرقان-۶) ــــ (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے

[۱] لسان العرب، اساس البلاغہ، و تفسیر کبیر رازی تفسیر زیر جَنَاحَ الذُّلِّ ج ۵ ص ۴۰۹، دار الطباعۃ العامرہ

خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی، کہ خدا جب رحمت اور صبر و کرم والا ہے، تو اس کے بندون مین خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو،

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی،

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ	اور لوگون سے بے رخی نہ کر، اور
وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا،	زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ	کسی اترانے والے شیخی خورے کو
فَخُوْرٍ، وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ	پسند نہین کرتا، اور اپنی رفتار مین
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ	میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے
اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ	بات کرے) تو ہولے سے بول
الْحَمِيْرِ. (لقمان - ۲)	(کیونکہ) بری سے بری آواز گدھون کی ہے

اس آیت مین خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہین، بات کرنے مین لوگون سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال مین غرور کا شائبہ نہ ہو، اور نہ آواز مین غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو،

لیکن یہ خیال مین رہے کہ تواضع و خاکساری اور دنائت و پستی مین بڑا فرق ہے تواضع و خاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان مین کبر و غرور پیدا نہ ہو، اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے، اور دنائت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لئے انسان اپنی خودداری کو کھو دے، چنانچہ ایسے موقع پر جہان خاکسارانہ روش سے انسان

کا ضعف ظاہر ہو، وہان اسلام نے عارضی اور نمایشی طور پر خود دارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے، صحابہ جب عمرہ کے لئے آئے، تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے اُن کو کمزور کر رکھا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمدؐ اور اُن کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانۂ کعبہ کا طواف نہین کر سکتے، اس پر آپ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کا تین چکر اکڑ کر کرین، تاکہ مشرکون پر اُن کی طاقت کا اظہار ہو[1]،

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد مین پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے، اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند[2]،

بہرحال اسلام مین خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے، اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سر و سامانی سے مختلف ہے، ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے، لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص خدا کے لئے خاکساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے[3]" ایک اور حدیث مین فرمایا کہ "جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری سے اُس کو نہین پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور

---

[1] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف وصحیح بخاری عمرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] ابو داود کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [3] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التواضع۔

اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے۔"

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لئے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔" اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے، اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہوتی چاہئے۔

لہ ترمذی ابواب الزہد ۲ہ ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ،

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتین کرنے
مین ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھے، تاکہ آپس
مین خوشگوار تعلقات پیدا ہون، اور باہم مروت اور محبت بڑھے، سلام کرنا، شکریہ ادا
کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائین دینا، اچھی باتین کرنا، اچھی باتین سمجھانا
اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہین، خدا تعالیٰ نے توراۃ مین بنی اسرائیل کو
لوگون کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآنِ پاک مین بھی دہرادیا ہے،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۔ (بقرہ - ۱۰) اور کہیو لوگون سے اچھی بات،

اس اچھی بات کہنے مین لوگون کے فائدہ اور کام کی باتون کا کہنا نصیحت کرنا،
اچھی باتون کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے، ایک اور آیت مین یہی حکم دوسرے
لفظون مین اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندون کی پہچان
بن جاتا ہے، ارشاد ہے،

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ	اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے
ھِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ	کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے
یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ	اچھی ہو، بیشک شیطان جھگڑا ڈلواتا ہے
کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝ (بنی اسرائیل ۶)	آپس میں، بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے

آیت کے پچھلے حصہ مین دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی، اور خوش کلامی آپس مین میل ملاپ پیدا کرتی ہے، اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے، جو شیطان کا کام ہے، وہ اس کے ذریعہ سے لوگون مین غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے، اس لئے اللہ کے بندون کو چاہئے کہ نیک بات بولین، نیک بات کہین، اچھے لہجہ مین کہین، اور نرمی سے کہین، کہ آپس مین میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو، اسی لئے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظون اور نفرت اور تحقیر کے خطابون سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے، کسی کو یا کافر یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس مین اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہین، پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے، فرمایا

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا	اور نہ تم آپس مین ایک دوسرے
تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ	کو طعن دو، اور نہ چڑھ کا نام لے کر
الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ	پکارو، ایمان کے بعد گنہگاری کا
الْاِیْمَانِ ج (حجرات - ۲)	نام ہے،

اسی لئے برائیون کے تذکرون، اور بدگوئیون کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ،	نہین آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (اس کو
(نساء - ۲۱)	حق ہے کہ ظالم کے ظلمون کو بیان کرے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے[۱]، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتون سے بہت اونچی ہونی چاہئے، اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی و خیرخواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو اللہ اور روزِ جزا، پر یقین رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے[۲]" اس حدیث پاک مین اسی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اور روزِ جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا، اگر تمھین بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہین تو کل اس کو مل رہیگی۔

ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا، اور روے انور پر اس کی تکلیفون کے تصور سے اثر ظاہر ہوا، پھر ارشاد فرمایا، دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے[۳]۔

ایک دفعہ آپ نے جنت کا ذکر فرمایا، اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی مجلس مین حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟

[۱] صحیح بخاری باب طیب الکلام [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان [۳] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی اللعنۃ

فرمایا جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے، اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اچھی بات صدقہ ہے۔"[2] یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے، اور سچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ نجات کیونکر ملے۔" فرمایا "اپنی زبان پر قابو رکھو، اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو، اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔"[3] ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک کو پکڑ کر فرمایا "اس کا ڈر ہے۔"[4]

[1] ترمذی ما جاء فی قول المعروف [2] صحیح بخاری کتاب الصلح [3] ترمذی باب حفظ اللسان [4] ترمذی ایضاً

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہین کہ دوسرون کی ضرورتون کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسرون کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے، اور دوسرون کو آرام پہنچائے،

صحابہ کرام مین انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہی تھا، کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانمان ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ مین چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے اُن کو ہاتھون ہاتھ لیا، اُن کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی محنتون مین اُن کو شریک کیا، اور خود ہر طرح کی تکلیفین اٹھا کر اُن کو آرام پہنچایا،[1] پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانون کے ہاتھ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انصاریون کے سوا باقی ساری زمین مہاجرون کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، اور اُن کی مدح وستایش[2] کی،

وَالَّذِینَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ اور ان کے واسطے جنھون نے

---

[1] صحیح بخاری اوّل مناقب انصار [2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری،

وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ	(مہاجرون کی آمد) سے پہلے اس مقام
يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ	(مدینہ) مین اور ایمان مین جگہ پکڑ لی ا
وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ	محبت رکھتے ہین اس سے جو اپنا گھر
حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ	چھوڑکر ان کے پاس چلا آیا، اور ان
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ	(مہاجرون) کو دیئے جانے سے دل
خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ	مین کوئی مطلب نہین رکھتے، اور اپنے
نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ	اوپر تنگی ہی کیون نہ ہو (ان مہاجر
الْمُفْلِحُونَ۔	بھائیون کو) اپنے سے مقدم رکھتے
	ہین اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے
(حشر-۱)	محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ مین اس کو انصار کی جاگیرون مین تقسیم کر دینا چاہتا ہون، ان ایثار کے پیکرون نے عرض کی جب تک ہمارے مہاجر بھائیون کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہین، فرمایا اگر یہ منظور نہین تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لینگے، اور تم کو نہین پوچھین گے۔[1]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین پیش کی، آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول

١ صحیح بخاری اول باب مناقب انصار،

کر لیا، اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ نے اسی وقت اُتار کر اُن کے حوالہ کر دی، صحابہؓ نے اُن کو ملامت کی کو تم جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حاجت تھی، اور آپ کسی کا سوال رد نہین فرماتے، تم نے کیون مانگ لی، بولے ہان مین نے تو برکت کے لئے لی ہے، کہ یہی چادر میرا کفن بنے[1]

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آیا، کاشانۂ نبوی مین اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے آپ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اسکو اپنا مہمان بنائے گا خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا، یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی، اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے، اور بیوی سے پوچھا کہ گھر مین کچھ ہے؟ بولین صرف بچّون کا کھانا، بولے بچّون کو سلا دو، اور چراغ کو بجھا دو، ہم دونون رات بھر بھوکے رہینگے البتہ مہمان پر ظاہر کرین گے کہ کھا رہے ہین، چنانچہ انھون نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، تو آپ نے فرمایا "خدا تعالیٰ تمھارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا[2]"

بعض روایتون مین ہے کہ اوپر کی آیت مین انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے[3]، لیکن قرآنِ پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے، جس مین یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہون گے،

[1] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء و باب من استعد الکفن، [2] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف و فضل ایثارہ، و صحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر [3] ایضاً،

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس مین وہ منفرد ہے، اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلون مین افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے، قرآن پاک نے مسلمانون کو اُمّۃً وَسَطًا (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے اُن مین ایک یہ بھی ہے کہ اُن کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان[1] ہے، اس لئے اُس نے اکثر معاملون مین اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، انتہا یہ ہے کہ عبادات مین بھی اس اصول کو وہ نہین بھولا ہے۔

دعا یا نماز مین ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے،

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ	اور تو نہ پکار اپنی دعا (یا نماز) مین
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا	اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈھ لے
(بنی اسرائیل - ۱۲)	اس کے بیچ مین راہ،

[1] تفسیر کبیر فخر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ) [2] دیکھو ابن جریر طبری و روح المعانی،

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمایش ہو جائے، یا مخالف اس کو سُن کر برا بھلا کہے، اور نہ بالکل چُپکے چُپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سُن سکین، بلکہ دونون کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے،

ہماری چال ڈھال کیسی ہو، اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح مین ہے،

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ، (لقمان-۱)	اور چل بیچ کی چال،

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال مین متانت اور وقار باقی رہے، اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدون کی نمائشی چال بنجائے،

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہین سارے مذہبون نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے، اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس راہ مین بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہین سمجھا ہے کہ دوسرون کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آجائے، اور محتاجون مین ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے۔ فرمایا،

دیکھو ابن جریر طبری در شرح المعانی

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً	اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن مین
إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا	باندھ لے، اور نہ اس کو بالکل کھول
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا	دے کر تو بیٹھ جائے ملامت کا
مَّحْسُورًا، (بنی اسرائیل-۳)	نشانہ بن کر تھکا ہارا،

مسلمانون کی اخلاقی خصوصیتون کے سلسلہ مین کہا،

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا — اور جو خرچ کرین تو نفضول خرچی نہ

وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ — کرین اور نہ بہت تنگی کرین، اور

ذٰلِکَ قَوَامًا، (فرقان-۶) — ہو اُس کے درمیان اعتدال سے،

یعنی نہ اسراف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو،

صحیح بخاری مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اکلفوا من الاعمال ما — اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا

تطیقون، — تم کرسکو،

"عمل" کا لفظ گو یہان عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد، نماز و روزہ وغیرہ عبادتین ہین[1]، مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اُٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھاسکو اور آخر دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہین بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے، مسند بزاز مین حضرت حذیفہ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2]،

ما احسن القصد فی الغنی، ما — دولتمندی مین درمیانگی کتنی اچھی ہے،

احسن القصد فی الفقر، ما احسن — محتاجی مین درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت

القصد فی العبادۃ، — مین درمیانگی کتنی اچھی ہے،

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۶ [2] بروایت کنز العمال جلد ثانی ص ۲ حیدرآباد دکن،

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہوجائے نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے، لوگ دولتمند ہو کر اس قدر شان وشکوہ، عزوجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہین کہ اعتدال سے خارج ہوجاتے ہین، اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور مبتذل ہوجاتے ہین کہ صبراور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہین، اور یہ بھی بے اعتدالی ہے، ان دونون حالتون مین اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت مین نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے، نہ محتاجی کی حالت مین اپنی حیثیت سے گرجانا چاہیے،

عبادت سے بڑھ کر اسلام مین کوئی نیکی کا کام نہین، اسلام نے اس مین بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندون کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہوجائے، حضرت عثمان بن مظعون کا واقعہ سیرت مین کئی دفعہ گذرچکا ہے کہ انھون نے جب راتین نمازون اور دن روزون مین بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمھارے ذمہ اور بھی حق ہین،

خودداری

یا

عزتِ نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے، زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی، نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا، اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے، اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا،

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اُس بلند و برتر ذاتِ الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآنِ پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عَزِیزٌ لیا گیا ہے، عزیز

کے معنی ہیں عزت والا اور غالب، کہیں کہیں عزیز کے ساتھ قوی (قوت والا، یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لئے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو، اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے، اور اُدھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے اُن کی دوستی کے بھی طلبگار رہتے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ	کیا یہ اُن کے پاس عزت چاہتے ہیں
فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًاo	تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری
(نساء - ۲۰)	خدا کے واسطے ہے،

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے،

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ	جو عزت چاہے تو عزت تو ساری
الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا (فاطر - ۲)	اللہ کی ہے،
تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ	(اے خدا!) تو جس کو چاہے عزت دے

لہ عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، قوت، عظمت اور نخوت (حمیت)، کی معنوں میں آیا ہے، اس لئے ہر جگہ اس کے وہ معنی لئے جائیں گے، جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے، (دیکھو لسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورہ بقرہ و نساء و ص و منافقون)

مَنْ تَشَآءُ (آل عمران ۳) اور جس کو چاہے ذلت دے،

ایک دفعہ ایک غزوہ مین منافقون کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معزز ان ذلیل لوگون یعنی مسلمانون کو یا (نعوذ باللہ) محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال دین گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب مین فرمایا،

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ — اور عزت تو اللہ کے لئے ہے، اور اسکے

لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ — رسول کے لئے اور ایمان والون کیلئے،

لَا يَعْلَمُوْنَ (منافقون ۱) — لیکن منافق نہین جانتے،

اس آیتِ پاک نے مسلمانون کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائیگی، اس لئے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے، اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے، اور اسی لئے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے، تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ اُن کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہین ہین، ارشاد ہوا "بیشک ایسا ہی ہے" عرض کی "تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیون برداشت کرین[1]" ارشاد ہوا "مین خدا کا رسول ہون، اور

---

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد،

اس کے حکم کے خلاف کچھ نہین کر سکتا"۔ حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہان تک کام کر رہی تھی، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس کے بہت آگے تھی، اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا،

غزوۂ خندق مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کیلیے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ اُن کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ ہر سال دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصارؓ کے سردارون کو بلا کر آپنے مشورہ کیا، تو انھون نے عرض کی،

یارسولؐ اللہ جب ہم بتون کی پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو اُن کو ہم سے لینے کی ہمت نہین ہوئی، اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے، اور اس کے اور حضورؐ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہین، ہم ان کو یون اپنا مال دینا منظور کرین گے؟ خدا کی قسم ہمین اس معاہدہ کی ضرورت نہین۔

صحابۂ کرام جب خلافت کے زمانہ مین قیصر و کسریٰ کے مقابلہ مین صف آرا تھے، اُن کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے دربارون مین بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیون اور اولوالعزمیون کا باعث تھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے

لہ سیرۃ ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعہ احزاب بسند۔

اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان

کے اس کا پایہ بہت بلند ہے، اور ہر وقت اس کے کان مین یہ آواز آتی رہتی ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔ (آل عمران - ۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگون (کی ہدایت) کے لئے ظہور مین لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہین

کہ آپ مین غرور ہے، فرمایا غرور نہین، خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت

ہے جس کے ساتھ ذلت نہین، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہین، پھر آپ

نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون - ۱)

ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولین کیا مین مسلمان نہین، یہ

وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہین، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہین[1]

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہین کہ "خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے

کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے

کہ وہ فانی باتون کی پستی مین نہ پڑ جائے، اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش

کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہین[1]"

یہ خودداری بھی شرافت ہے، جس مین یہ خودداری نہین، لوگون کی آنکھون

مین اُس کا وقار نہین، اس وقار اور خودداری کے لئے اگر ہاتھ مین قدرت نہ ہو، یا

---

[1] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورہ منافقون کی آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ کی تفسیر مین لکھے ہین

مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتون سے اعراض اور درگذر کرنا پڑتا ہے۔ قرآن مین پے مسلمانون کے وصف کے سلسلہ مین ہے،

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان-٦)

اور جب وہ ہو نکلین بیہودہ باتون کی طرف سے تو گذر جائین شریفانہ

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ، اور خودداری کی شان سے گذر جائین کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہون، اور نہ ان شریرون کو انھین اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمایش کی بو تک نہ آئے، یعنی اس مین اپنی بڑائی اور دوسرون کی تحقیر کا جزء شامل نہ ہو۔ یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمایش مین فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص کے دل مین ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا" اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے" مطلب یہ کہ یہ تو غرور مین داخل نہین، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگون کی تحقیر کی جائے[1]"

اسلام مین صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر

ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندہ آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے، تو فرمایا "کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟" ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا "کیا کپڑے دھونے کے لئے اس کو پانی میسر نہ تھا؟" ایک شخص آپ کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا "تمہارے پاس کچھ مال ہے"؟ اس نے کہا "اونٹ، بکری، گھوڑے، غلام، سب کچھ ہیں" ارشاد ہوا کہ "جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل و احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے"[1]

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لئے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہو سکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

اذا سمعتم الاقامۃ فامشوا	جب تم اقامت سنو تو نماز کیلئے
الی الصلاۃ وعلیکم بالسکینۃ	سکون اور وقار کے ساتھ چلو،
والوقار ولا تسرعوا[2]	جلدی نہ کرو،

لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے، اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان [2] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب لا یسعی الی الصلاۃ ولیأتہا بالسکینۃ والوقار،

کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار مین داخل ہی،

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس مین بہت سی چیزین شامل ہین، ابو داؤد نے کتاب الادب باب الوقار مین یہ حدیث نقل کی ہی،

الھدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسة وعشرين جزء	نیک طور طریق، نیک انداز، اور میانہ روی، نبوت کے پچیس اجزا مین سے ایک جزء ہے،

کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیون کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے، اور وہ خود بھی ان خوبیون کے بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کرکے خود دار بنتا ہے،

صحیح بخاری مین ایک اور لفظ دَلّ کا ہے، اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہین کہ انسان رفتار، گفتار، شکل وصورت، وضع ولباس اور اپنی عام روش مین باوقار رہے اور نیک مسلمانون کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل مین نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا "وقار" بولے "خداوندا میرے وقار کو اور زیادہ کر"[1]

فقر وفاقہ کی حالت، یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خود داری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح مین تعفف اور استعفاف ہے، اور شریعت

[1] ادب المفرد باب الختان للکبیر،

ہیں وہ ایک قابلِ ستائش، خلاقی وصف ہے، اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بناپر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے.

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا	(خیرات تو) اُن حاجتمندوں کا حق
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	ہے جو (خدا) کی راہ میں گھرے بیٹھے
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	سکتے، بے خبر اُن کی خودداری (کی
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ	وجہ) سے اُن کو غنی سمجھتا ہے، تو
النَّاسَ اِلْحَافًا،	(اُن کو دیکھے تو) اُن کی صورت سے
	اُن کو (صاف) پہچان جائے (کہ
(بقرہ ۔ ۳۷)	محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے.

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے. اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے. صاحب کشاف نے لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "وہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں"، لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اُن کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ اُن کے حال سے ناواقف ہیں اُن کو دولتمند سمجھتے ہیں. تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی؟، اصحابِ صفہ صاحبِ احتیاج ہونے کے باوجود اس لئے سوال نہیں کر

تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے
تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار
کرتا ہے، تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں
کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے، اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے
پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس لئے جب انسان کسی کی یہ حالت
دیکھتا ہے تو اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور
ہو جاتا ہے اس لئے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا
ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے
معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے
حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے، جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے،
بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ
سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے[1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے، اور اسلام نے گداگری کی نہایت
شدت سے ممانعت کی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ "جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا
ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک
ٹکڑا بھی نہ ہوگا" یہ اُس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶ و ۵۲۷،

کو قائم نہین رکھا، اور اپنی عزت وآبرو گنوادی تھی، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا، آپ نے دے دیا، پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ "میرے پاس جو کچھ ہوگا مین تم سے بچا کر اسکو جمع نہ کرون گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہین دیا۔"

فقر و فاقہ کی حالت مین عام آدمیون سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے، اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانون کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی احتیاج دور نہین ہوتی، لیکن جو شخص اُس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔"

روزمرہ کے معمولی کامون مین لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہین جانتے، لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتون مین بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اُٹھادو، میز پر کتاب رکھدو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہین معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا، اسی لئے کمالِ خودداری

یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی،

لاتسئلوا الناس شیئًا، تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا،

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر اُن کا کوڑا گرجاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے،

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ نے پہلے تو اس کی اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ "اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کروؔ" صالحین کی تخصیص غالبًا اسی لئے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کرین گے، ورنہ رفق وملاطفت کے ساتھ اس کو رد کردینگے،

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لئے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے، جس کے مقابلہ مین ساری نعمتین اور دولتین ہیچ ہین، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہین کرتا، وہ کسی کے سامنے نہین جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہین پھیلاتا، اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لئے ہے اور اسکی عطا سے رسول کے لئے ہے، اور اس کے واسطے سے مسلمانون کے لئے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے، اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے

لہ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف مین یہ کل حدیثین ہین۔

کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہین،
تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہین کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو"
گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لئے اس کو ہر قسم
کی برائی سے پاک، اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہئے،

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہین جس سے اسلامی خودداری
کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک و احتشام، تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمایش کا نام نہین،
بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع، اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر
اس کو اتنا اونچا کردے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے
سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ مین سربلند رہے اور اگر وہ صاحب امارت و حکومت
ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کے لئے ظاہری نمایشی چیزون کے بجائے حق کی طاقت کو کافی
سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیون سے بیت المقدس کی کنجی
لینے کو شام جارہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابوعبیدہؓ کچھ
مسلمانون کو لے کر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہان کچھ پانی
تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے، پاؤن سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال
لئے، اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی مین گھسے، اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیون
کے مقدس شہر مین داخل ہونے کے لئے بڑھا حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض
کی یا امیرالمومنین آپ یہ کیا کر رہے ہین کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لئے ہین،

اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے، اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو اُمنڈ آیا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا اے ابو عبیدہؓ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عبرت بناتا، ہم سب ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہینگے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا،

لہ مستدرک حاکم جلد اول ص۶۲ کتاب الایمان، علی شرط الصحیحین،

شجاعت اور بہادری

قَدِیرْ (قدرت والا) قادِر، مُقتدِر، قوی، جبّار (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قاھِر (جو ہر کوئی کو دبا دے) غالِب اور عزیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہین جب کسی بندہ مین ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس مین اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے،

تمام مذاہب مین اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیرودن مین شجاعت وبہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کرکے لوگون مین یہ خیال پیدا تھا، کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم، اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہین، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لئے تعلیم محمدی نے بہادری وشجاعت کو سراہا، اور اس کے موقعون کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لئے کام مین لانا چاہئے، کیونکہ اگر نیکون مین یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام، اور باطل قوتون کا بہادرانہ مقابلہ نہ کرسکین،

اور نہ اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد کامیاب ہوسکے،

اُن مسلمانون کی جو سختیون اور مصیبتون کا بہادرانہ مقابلہ کرین اور لڑائیون مین داد مردانگی دین، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ	اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	وقت ثابت قدم رہین، وہی لوگ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	ہین جو سچے ہوئے اور وہی متقی
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ، (بقرہ-۲۲)	ہین،

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس مین ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے مین مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت مین اپنی جان تک کی بازی لگا دے، اور جب وہ ایسا گزرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر مین راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے، اور جو جذبہ اسکو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے، ایک اور موقع پر مسلمانون کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ	اے ایمان والو جب تم کافرون
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ	سے میدانِ جنگ مین مقابل ہو
الْاَدْبَارَ، (انفال-۲)	تو اُن کو پیٹھ مت دو،

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والون کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ مین پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھاین، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان مین قدم جمائے ڈٹے رہین، اس موقع پر اللہ تعالی نے مسلمانون کو "ایمان والے" کہہ کر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی "ایمان" مسلمانون کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالی کے غضب کا مستحق ہوگا،

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ	اور جو اُن کو اُس دن پیٹھ دیگا،
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا	مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو یا
اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ	کسی (مسلمان) دستہ سے جا ملتا ہو،
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ	تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اُس
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (انفال-۲)	کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے

یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدانِ جنگ مین پیٹھ نہین دکھانی چاہیئے، اس کے بعد ہی اللہ تعالی ان کو اس کے لئے ایجابی حکم دیتا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ	اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ
فِئَةً فَاثْبُتُوْا (انفال-۶)	سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو،

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم مین سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو، اپنی جگہ سے نہ ہٹے،

مسلمانون کی تعریف مین فرمایا کہ وہ کافرون کی قوت کو کبھی خاطر مین نہین لائے

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح-۴)	وہ کافرون پر زور آور ہین،

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت مین زور آور، زورمند اور قوی دست کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفون کے مقابلہ مین طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے، ایک اور آیت مین ارشاد ہی،

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور اُن کے لئے تم سے جو ہو سکے
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ	یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ	تیار رکھو، کہ اس سے اللہ کے دشمنون
وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ	اور اپنے دشمنون کو اور دوسرون
دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ	کو جنھین تم نہین جانتے اللہ جانتا
اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ط (انفال-۸)	ہے، مرعوب کرو،

اس "قوت" کے لفظ کی تفسیر اُس زمانہ کے سامانِ جنگ و قتال سے کی گئی ہے، مثلاً قلعون کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ بعض مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے، اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس مین داخل کیا ہے[1]، غرض اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیار رکھنے اور اُن کے استعمال کے طریقون کو جاننے کی ہدایت

---

[1] تفسیر طبری آیت مذکور،

فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن اُن کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہین، اور اُن سے معاہدہ کرکے توڑنے کی ہمت نہ کرسکین،

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ مین سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی، متوحش ہورہے تھے، اس پر وحیِ الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا،

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ	گویا کہ موت کی طرف ہانکے جارہے
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ، (انفال - ۱)	ہین، اور وہ دیکھ رہے ہین،

سورۂ احزاب مین منافقون کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہی،

فَاِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ	جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ	دیکھے کہ تیری طرف تکنکر دیکھتے
اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى	ہین، اُن کی آنکھین گردش کھاتی
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ، (احزاب)	ہین، جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے

سورۂ محمد مین اُن کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے،

فَاِذَا اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ	جب اُتری کوئی ثابت سورت
وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ	اور، مذکور ہو اس مین لڑائی تو تو
الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	اُن کو جن کے دلون مین روگ
يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِىِّ	ہے دیکھے گا کہ تکتے ہین تیری طرف

عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ

(محمد - ۲)

جیسے ٹک ٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بیہوشی ہی سو خرابی ہو ان کی،

ایک اور آیت مین یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا،

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ
وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ
يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ

(منافقون - ۱)

اور جب تو انھین دیکھے، تو اُن کے بدن اچھے معلوم ہون، اور اگر بولین تو ان کی بات تو سنے، جیسے لکڑی کھڑی کی ہوئی لکڑیان ہین، جو کوئی چیخے سمجھین ہم ہی پر کوئی آفت آئی،

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہین بلکہ دل کی طاقت سے ہی، جس سے منافق محروم ہین، دیکھنے مین تو اُن کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہین، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھین، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھون کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے، دیکھنے مین تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہین، مگر چونکہ اُن کی جڑین مضبوط نہین اس لئے ذرہ ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہین،

سلطان م... اپنے پیرو دن مین شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہی گو ہمین مادی وجسمانی شجاعت سے کیر اعراض وتغافل نہین ہے، لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی

بنیاد اس پر کھڑی نہین کی ہے، اسی لئے اوپر کی آیت مین دیکھئے، کہ منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹائی کا مضحکہ اُڑایا ہے، کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان اور یقین کی روح سے خالی ہے، اس لئے اُن مین شجاعت اور بہادری نہین، اسی بنا پر وہ اپنے پیرودن مین شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہین،

۱- جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اُس کے حکم کے بغیر کچھ نہین ہو سکتا، اس لئے تعداد کی قلت وکثرت کوئی چیز نہین، صرف فضلِ الٰہی اور نصرت خداوندی چاہئے،

۲- ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہین سکتی، اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہین سکتا،

۳- خدا کی راہ مین مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے، اور جو اس غزا مین مارا نہین گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابون کا مستحق ہے،

تعداد کی قلت وکثرت | تعداد کی قلت وکثرت پر جدوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی وناکامی تعداد کی کمیت پر نہین، بلکہ جدوجہد کرنے والون کی ایمانی واخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس مین ایمان ویقین کی قوت موجود ہے تو بفضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پا سکتی ہے، اس فلسفہ کو

حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ مین قرآن نے ان مختصر لفظون مین سمجھا دیا ہے،

کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً	کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے
كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ، (بقرہ-۳۳)	بڑی فوج پر غالب آگیا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہین، تو دل کے کمزور کہتے ہین کہ ہم تو اُن سے نہین لڑین گے، اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ، (مائدہ-۴) اس مین تو ایک زبردست قوم بستی ہے، اس وقت اُن کی اُمت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہین،

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ	تو جب تم شہر کے پھاٹک مین گھس
وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ	جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو، اور اللہ
مُّؤْمِنِيْنَ، (مائدہ-۴)	پر بھروسہ کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو،

بدر اور اُحد کے سلسلہ مین اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا،

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئیگا،
شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ	اگرچہ تعداد مین بہت ہو، اور اللہ
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ، (انفال-۲)	ایمان والون کے ساتھ ہے،
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ○	بھروسہ کر، بیشک اللہ توکل کرنے
اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ	والون کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمھاری
لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ	مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب ہوگا
ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ	اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا، تو اس
وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	کے بعد کون تمھاری مدد کرے گا،
(آل عمران - ۱۷)	اور مومنون کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے، اور مدد اسی طرف سے آتی ہے،

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ	اور مدد نہین ہے مگر اللہ ہی کی طرف
اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (انفال - ۱)	سے، بیشک اللہ غالب، حکمت والا ہے

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہین بتایا، بلکہ اس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لئے خوشخبری سنا دی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہون گے،

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ	اے پیغمبر! مومنون کو لڑائی کا شوق
عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ	دلا، اگر تم مسلمانون مین سے بیس
عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا	صابر (ثابت قدم) ہون تو وہ
مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ	دو سو پر غالب ہون، اور اگر تم مین

مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ	سے سو ہون تو ہزار کافرون پر غالب
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (انفال ۹)	ہون، کیونکہ وہ سمجھ نہین رکھتے،

ثابت قدم مسلمانون کے غالب آنے اور کافرون کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانون کے دل مین خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے، اور کافرون کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہین،

اس کے بعد اس آزمایش کی سختی مین تھوڑی نرمی کردی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرے، اور اُس کے قدم نہ ڈگمگائین،

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ	تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہین
يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ	تو وہ سو پر غالب ہون، اور اگر
مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ	تم سے ہزار ہون تو دو ہزار پر بحکم
بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	خدا غالب ہون، اور اللہ صابرون
(انفال - ۹)	کے ساتھ ہے،

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانون مین پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی مین دو کافرون پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین و ایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہین کرتا، اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسا رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافرون کے دلون مین اُن کا وہ رعب بیٹھا ہے جسکا

وعدہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ہے کہ

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ	ہم کافرون کے دلون مین (تمہارا)
كَفَرُوا الرُّعْبَ ، (آل عمران -١٦)	رعب ڈال دینگے ،
سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ	مین کافرون کے دلون مین (تمہارا)
كَفَرُوا الرُّعْبَ ، (انفال -٢)	رعب ڈال دون گا ،

خدانے یہ وعدہ پورا بھی کیا ، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعون اور لڑائی کے سامانون پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانون سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈالدینے پر مجبور ہوئے ،

وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ	اور اُن کے دلون مین اللہ نے رعب
(احزاب -٣)	ڈال دیا ،
وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ	اور اُن کے دلون مین اللہ نے رعب
(حشر -١)	ڈال دیا ،

اور جب تک مسلمانون مین ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہیگا ،

موت کا وقت مقرر ہے انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے ، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے ، اور نہ بلائے آسکتا ہے ، اس لئے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہین ہے وحیِ محمدیؐ نے مسلمانون کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے ، یہان تک کہ

یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے، غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے پاؤں
اٹھ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی، اور اس عقیدہ کو یاد دلایا،

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ	اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا	اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے، لکھا
(آل عمران - ۱۵)	ہوا وقت مقرر ہے،

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو، اور اس سے
بزدلی کیوں چھائے، جنگِ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ	(اے پیغمبر ان سے) کہہ کہ اگر تم موت
فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ	سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی
(احزاب - ۲)	تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا،

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے،
جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود اگر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ	(اے پیغمبر ان سے) کہدے کہ اگر تم
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ	اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جنکا
الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ،	مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل
(آل عمران - ۱۶)	کے اپنے پڑاؤ پر آجاتے،

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس [illegible] ے گئے، یوں بھی غلط ہے،

کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ مین ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانون سے کہا گیا کہ تم کافرون جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہین،

لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا	اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے)
وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ	ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور
حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ	نہ مارے جاتے، (اور یہ خیال اس
يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ	لئے اُنکے دل مین آتا ہے) تاکہ اللہ
	اُن کے اس خیال کو اُن کی دلی حسرت
(آل عمران - ۱۵۶)	بنائے، اور (واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ [illegible]

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہین کہ اگر یہ مقتول لڑائی مین نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہون تو ٹال لین،

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ	اگر تم سچے ہو تو اپنی جانون سے موت
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران)	ہٹا تو لو،

جو مسلمان ذرہ دل کے کمزور تھے، ان کے خطرہ کا ذکر کر کے اُن کی تشفی کی گئی،

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ	پھر جب اُن کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہان
اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ	ان مین سے ایک گروہ لوگون سے
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ	ایسے ڈرنے لگے، جیسے خدا سے ڈرتے ہو،
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ	یا اس سے بھی بڑھ کر، اور کہنے لگے کہ

كُتِبَتْ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ج لَوْلَآ
اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ط
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ج
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى
وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ه اَيْنَ
مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ
وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ط
(نساء - ۱۱)

کہ اے ہمارے پروردگار تو نے
کیون فرض کی ہم پر لڑائی، کیون نہ
ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی
(اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا
فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیزگار
کے لئے بہتر ہے، اور تمھارا حق ذرا
بھی دبایا نہ جائے گا. جہان تم ہو گے
موت تم کو پالے گی، اگرچہ تم مضبوط برجون مین ہو

غرض کہین بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہین، پھر میدانِ جنگ سے تم کیون گھبراؤ، بلکہ اُن مجاہدون کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سُن کر اور تازہ ہو جاتا ہے،

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ
اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ق
وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيْلُ،
(آل عمران - ۱۸)

وہ جن سے لوگون نے کہا کہ تم سے
لڑنے کے لئے لوگون نے بڑا سامان
کیا ہے سو تم اُن سے خوف کرو،
تو اس نے اُن کے ایمان کو اور
بڑھا دیا، اور بول اٹھے کہ ہم کو
خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے

شہادت اور غزا کا رتبہ میدانِ جہاد مین شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی

وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدون کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ مین بکا ہوا ہے، اور وہان اُن کے لئے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہان کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اللہ نے مسلمانون سے اُن کی جانون
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ	کو اور مالون کو اس قیمت پر خرید
لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ	لیا ہے کہ اُن کے لئے جنت ہے،
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ	اللہ کی راہ مین لڑتے ہین، پھر مارتے
يُقْتَلُوْنَ ؕ (توبہ - ۱۴)	ہین اور مارے جاتے ہین۔

اس سے پہلے سورۂ نساء مین اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لئے دنیا کا سودا کر چکے ہین، اعلان ہے:

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ	تو جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ
يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ	بیچتے ہین وہ اللہ کی راہ مین لڑین،
وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور جو اللہ کی راہ مین لڑے، پھر
فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ	مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اسکو
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (نساء - ۱۰)	بڑی مزدوری دین گے۔

اُن کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائین گے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	تو جو لوگ اپنے دطن سے چھوٹے اور
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ	اپنے گھرون سے نکالے گئے، اور
سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ	میری راہ مین ستائے گئے، اور لڑے
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ	اور مارے گئے، اتاروں گا اُن سے
جَنّٰتٍ، الآیۃ (آل عمران - ٢٠)	ان کی برائیان. اور داخل کرون گا جنتون مین

شہیدون نے اس راہ مین اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ اُن کی زندگی تھی، وہ اُن کو از سرِ نو اسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیالِ باطل کا کہ شہید مر جاتے ہین ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور کہدیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہین.

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا	اور جو خدا کی راہ مین مارے گئے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا	اُن کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہین،
بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ	اپنے رب پاس روزی پاتے ہین،
يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ	خدا نے اُن کو اپنی مہربانی سے جو دیا
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران - ١٧)	اس سے خوش ہین،

اُن کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہین سکتے پھر بھی اُن کو زبان سے بھی مردہ نہین کہنا چاہیے،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ	اور جو خدا کی راہ مین مارے جائین

سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ — اُن کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہین،

اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ-۱۹) — لیکن تم کو اس کی خبر نہین،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لئے ہین، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ مین صرف خدا کی خوشنودی کے لئے لڑتے ہون، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض وغایت کو اتنا اونچا کردیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیون اور نفسانی غیظ و غضب، اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کردی گئی ہے، اگر کوئی مال کے لئے کسی کو قتل کرے تو یہ کافرون کی سی جاہلانہ بات ہوگی. فرمایا

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ — چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال، سو

الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ — اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے

كَثِيْرَةٌ ، كَذٰلِكَ كُنْتُمْ — تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے،

مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ — تو خدا نے تم پر فضل کیا، (یعنی اسلام

فَتَبَيَّنُوْا ، (نساء-۱۳) — بخشا) تو اب تحقیق کرلیا کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ مین اسکی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لئے لڑتا ہے،

ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمایش کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ وانتقام کے لئے لڑتا ہے، توآپنے اُن سب کا مشترک جواب یہ دیا۔

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ اعلیٰ فهو فی سبیل اللّٰہ۔ — جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کیلئے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔

ایک حدیث مین ہے کہ ایک شخص سے قیامت کے دن اُس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا مین نے تیری راہ مین جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہیگا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لئے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ سو تم اپنا اجر پا چکے، اور دنیا مین تم کو بہادر کہا جاچکا، غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و نمایش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے، لیکن اگر جہاد مین اعلاے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہین کہا ہے، کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے،

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان مین کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوون کو پسند کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث مین ہے کہ "بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی

---

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔ [2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار، و جامع ترمذی [3] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور

کے وقت اتر آئے"۔ کیونکہ اس سے دشمنون پر رعب و داب قائم ہوتا ہے، اور دوستون مین مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے، ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ مین کہا تو مین ابن الاکوع ہون۔" حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح مین لکھتے ہین

"یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے، جس کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی مین جائز ہے، اور دوسرے موقعون پر جائز نہین[2]"

غزوہ حنین مین جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تو آپ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ مین فرمایا،

انا النبی لا کذب انا ابن	مین پیغمبر ہون، جھوٹ نہین، مین
عبد المطلب،	عبد المطلب کا بیٹا ہون،

یعنی مین سچا پیغمبر ہون اس لئے میدان سے نہ بھاگون گا نہ ہٹون گا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیرون کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش نہین فرمائی[3]،

صحابہ کہتے ہین کہ ہم مین سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا[4]، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بہادر تھے ایک بار

---

[1] ابو داود کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [2] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۳ [3] صحیح بخاری غزوہ حنین و کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [4] صحیح مسلم باب غزوہ حنین،

اہلِ مدینہ کے دو دن میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو اُدھر بڑھا وہ خود سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ تھے، آپ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آکر فرمایا "خوف کی کوئی بات نہیں"[۱]۔ ایک موقع پر جب بدوؤں نے آپ کو عطیہ کے لئے گھیر لیا تو آپ نے فرمایا کہ "تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے"[۲]۔ بزدلی اسلام میں ایسا سخت اخلاقی عیب ہے، جس سے پناہ مانگنی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے اُن میں بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے، کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے[۳]۔ ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے[۴]۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو"[۵]۔ اسی خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے،

وَاعْلَمُوا اَنَّ الْجَنَّۃَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ[۶]	یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے،

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد کتاب الحمائل وتعلیق السیف بالعنق [۲] بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعۃ فی الحرب والجبن

[۳] صحیح بخاری کتاب الدعوات باب التعوذ من الجبن [۴] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجرأۃ والجبن [۵] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [۶] ایضاً باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف و باب کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا لم یقاتل اول النہار اخر القتال،

استقامت

"استقامت" کے لفظی معنی "سیدھا رہنے" یا "سیدھا چلے چلنے" کے ہیں، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا چلا جائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہی، کہ

اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو
فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ	اس کی طرف سیدھے رہو، اور اس
(حمٓ السجدۃ-۱)	سے گناہ بخشواؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لئے ہوں، اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو۔ اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو۔ ایک اور آیت میں بارگاہِ الٰہی سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور

آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بھٹکو، نہ حکم ماننے سے سرکشی ہو،

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ	تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا
تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ	تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے
اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ	ساتھ، اور حد سے نہ بڑھو، کہ وہ (اللہ)
(ھود-۱۰)	تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے،

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ہے، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے، اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسول اسلام علیہ السلام اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلانِ حق، اور حق پر استقامت کی تاکید پہ تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو، اور ثابت قدمی دکھاؤ، اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ	بس اسی کی طرف بلا، اور قائم رہ
كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ	جیسا کہ تجھے فرما دیا اور ان کی خواہشوں
(شوریٰ-۲)	کے پیچھے نہ چل،

ایسے ثابت قدموں کو جنھوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی

لئے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمھین کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا،

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ	بے شک جنھون نے کہا ہمارا پروردگار
ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ	اللہ ہے، پھر وہ (اس پر) جمے رہے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (احقاف)	تو نہ ڈر ہے اُن کو اور نہ وہ غم کھائین گے

اُس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہون گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہان حاصل تھا، وہان تسکین و تسلّی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدمون کے کانون مین ان کی استقامت کی مزدوری مین فرشتون کی بشارت سنائی دے گی،

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ	بے شک جنھون نے کہا کہ ہمارا پروردگار
ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ	اللہ ہے پھر جمے رہے، اُن پر فرشتے
الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا	اُترتے ہین کہ خوف اور غم نہ کھاؤ
تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ	اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا
الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (حم السجدہ)	تم سے وعدہ تھا،

ان ہی آیتون کی شرح مین اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہین کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ مین اُس سے چمٹ جاؤن، ارشاد ہوا، کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ[1]، صحابہؓ نے ان نصیحتون

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی حفظ اللسان،

پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا، اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کئے ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے، مگر اُن پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت و اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا:

إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ	جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے
أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ	اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں
الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ	اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ	گلے کو آنے لگے، اور تم اللہ سے
الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ	طرح طرح کے گمان کرتے تھے
الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا	وہاں ایمان والے جانچے گئے اور
شَدِيدًا. (احزاب-۲)	خوب جھڑ جھڑائے گئے۔

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی، اس کی تفصیل ہے، اسکے بعد ہے

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ	اور جب ایمان والوں نے کفار کی
قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَ	ان متحدہ فوجوں کو دیکھا، تو بولے
رَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَ	کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا
رَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا	تھا اللہ اور اس کے رسول نے
إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا. (احزاب ۳)	اور اللہ اور اُسکے رسول نے سچ کہا اور

[illegible]

اس کے بعد جن مسلمانون نے اس قسم کے خطرون مین اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، اُن کی تعریف فرمائی جاتی ہے،

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	ایمان والون مین بعض وہ مرد ہین
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ	جنھون نے خدا سے جس چیز کا عہد
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ	کیا، اس کو سچ کر دکھایا، تو اُن مین
مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا	کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی
تَبْدِيْلًا ۔ (احزاب - ۳)	ان مین وقت کی راہ دیکھ رہا ہو

اور انھون نے ذرا بھی نہین بدلا

یعنی بعض تو خدا کی راہ مین جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے، اور بعض ابھی زندہ ہین، اور اُس دن کی راہ تک رہے ہین، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دینگے، اور ان تمام خطرون کے باوجود نہ تو منافقون کی طرح انھون نے اپنے دین و ایمان کو بدلا، اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا،

حق کی راہ مین مشکلات کا پیش آنا، اور اس مین مردانِ خدا کی استقامت کی آزمایش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہو جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، اور جب تک اس مین کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہین اترتی کامیابی کا منہ نہین دیکھتی، فرمایا

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا	کیا تم کو خیال ہو کہ جنت مین چلے جاؤگے
الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ	اور ابھی تم پر تم سے پہلون کے احوال
خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ	نہین آے، ان کو سختی اور تکلیف

الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا	پہنچتی رہی، اور جھڑ جھڑائے گئے،
حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ	یہان تک کہ رسول اور جو اس کے
اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ	ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ
اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ،	کی مدد کب آئے گی، سُن رکھو اللہ
(بقرہ ۲۶)	کی مدد نزدیک ہے،

پہلون کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہین، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا، اور آخر کامیاب ہوا، اور اس عالم مین اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ	اے ہمارے پروردگار، ہم مین ڈالدے
ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤن
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ، (بقرہ ۳۳)	اور اس کافر قوم کے مقابلہ مین ہماری مدد

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاُخدود کا ہے، احادیث[۱] و سیر مین ہو کہ یمن مین حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اُمّت کے کچھ مخلص اور پکّے مسلمان تھے، یہودیون نے اُن کو طرح طرح کی تکلیفین دین، اور آخر اُن کو گڈھا کھود کر آگ مین جھونک دیا، مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوے،

---

[۱] صحیح مسلم و سیرت ابن ہشام قصۂ اصحاب الاخدود،

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ،
النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ، اِذۡ هُمۡ
عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ، وَّهُمۡ عَلٰى مَا
يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ،
وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ
يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ
(بروج - ۱)

مارے جائیو کھائیان کھودنے والے
آگ بھری ایندھن سے، جب وہ
اس (گڈھے) کے منہ پر بیٹھے تھے،
اور جو کچھ وہ ایمان والون کے ساتھ
کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے، اور وہ
ان سے بدلا نہین لیتے تھے مگر اسی کا
کہ یہ زبردست خوبیون والے خدا پر
ایمان لے آئے تھے

اگلون کی استقامت کے اُن احوال مین سے جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح مین نقل کیا ہے، خبابؓ بن ارت صحابی کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مصیبتون کا حال عرض کیا، اور درخواست کی کہ ہمارے لئے دعا کیجیے، چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگون مین ایسا مرد بھی ہوا ہے، جس کو زمین مین گاڑ دیا جاتا تھا، اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگردان نہین کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیون سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا"۔[۱]

---

[۱] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام،

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیون پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہین، ان ہی خبابؓ بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہین یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم مین اُن کو طرح طرح کی تکلیفین دی جاتی تھین، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا، اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر پانون رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائین یہان تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، حضرت خبابؓ نے مدتون کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی، تو تانبے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم و ستم کا یہ سکہ اُن کی پیٹھ پر چمک رہا تھا،

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان اُن کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے مین رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے، اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اُس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَد اَحَد (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا۔ حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہین، مگر خدا کی راہ مین جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہٴ شکر ادا کرتے ہین، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فقرہ جس کو آپ نے اپنے چچا ابوطالب کے جواب مین کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان مین سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا، چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ مین سورج اور بائین ہاتھ مین چاند بھی دے دین

لہ ابن سعد جلد ۳ تذکرہٴ خبابؓ۔

تب بھی مین اس دینِ حق سے باز نہ آؤنگا،

خود مسلمانون کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ مین مر جائے، یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو، الٹے پاؤن پھر جاؤ گے؟ نہین حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہین، اس کا ساتھ تم اس لئے دیتے ہو کہ وہ حق ہے،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ	اور محمد تو ایک رسول ہے، اس سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں
اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے
عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ	پاؤن پھر جاؤ گے، اور جو الٹے
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ	پاؤن پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہین
شَيْئًا ؕ (آل عمران - ۱۵)	بگاڑے گا،

پھر اگلی امتون کا حال سنا کر تسلی دی جاتی، اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے پیغمبر ہین کہ اُن کے ساتھ
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا	ہو کر بہت سے خدا والے لوگ
لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ مین
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا	کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہین ہارے

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ ۝ وَمَا	اور نہ کمزور ہوئے، اور نہ دب گئے اور
كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا	اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا	نہ تھا ان کا کہنا، مگر یہی کہا اے ہمارے
فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا	پروردگار ہمارے گناہ اور ہم سے
وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ	اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اسکو بخشدے
(آل عمران-۱۵)	اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمکو
	کافر قوم پر مدد دے،

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثباتِ قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیئے، اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف اُن مسلمانوں کی کی ہے، جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا،

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر
عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ،	مداومت رکھتے ہیں، (یعنی ہمیشہ
(معارج-۱)	پڑھا کرتے ہیں)

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا "وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے[1]" خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو[2]"

---

[1] و [2] صحیح بخاری باب القصد والمداومۃ العمل،

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح میدان جنگ مین دونون طرف کی مسلّح فوجین ایک دوسرے کے مقابل مین ہاتھ پانون سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہین، بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے، تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت مین جو آواز بلند کی جاتی ہے اُسی کا نام حق گوئی ہے،

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابل ستایش سمجھا جاتا ہے، جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو، اور اسلام نے اسی قابلِ ستایش حقگوئی کی تعلیم دی ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ۔ (الحجر-٦)

پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اُس کو کھول کر سنا دو، اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو، ہم تم کو تمھاری ہنسی اُڑانے والون کے مقابلہ مین جو خدا کے ساتھ دوسرے دوسرے معبود قرار دیتے ہین کافی ہین

یعنی اب مخفی طور پر دعوت توحید کا زمانہ گذر گیا، اور علانیہ اسکی دعوت دینے کا وقت آگیا، اس لئے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو، اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر اور استہزا کی مطلق پروانہ کرو، بلکہ اُن کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے، وہ خوف ہے، جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جسکو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے، اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے،

وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، (مائدہ ۷-۸) اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے،

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروا نہیں کرتے،

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اسکے کہنے سے چاہئے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو، ایک بار آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر

حقیر سمجھ سکتا ہے، ؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہیگا کہ تمکو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہیگا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا،

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت اک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اسلئے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا،

افضل الجہاد کلمۃ عدل	بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے
عند سلطان جائر،	انصاف کی بات کا کہنا ہے،

دوسری روایت میں کلمۂ حق کا لفظ ہے،

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ہیں اُن میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا، حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ "تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اُس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے

کمزور درجہ ہے[1]۔

صحابہ مین حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی مین بدرجۂ کمال تھا، یہ وہی تھے جنھون نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع مین حرم مین جاکر توحید کا نعرہ بلند کیا، اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوے جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہوگئے، لیکن اس پر بھی اُن کا نشہ نہین اترا، اور دوسرے دن پھر جاکر اعلانِ حق کیا، اور وہی سزا پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدح مین فرمایا کہ آسمان کے نیچے، اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہین[2]، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین وہ جب شام مین تھے، تو وہان کے مسلمانون مین سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہورہی تھی اس پر انھون نے بے محابا داروگیر کی، اور اس مین امیر معاویہ کی پروا انھون نے ذرا بھی نہین کی،

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس مین فرمایا ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے، جو تم کو معلوم ہو۔ یہ سُنکر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتین دیکھین اور ہیبت مین آگئے،[3]

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر مین یہ تمام حدیثین مذکور ہین،
[2] جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذر،
[3] ترغیب و ترہیب منذری ۲ باب الترہیب من الغضب بحوالہٗ ترمذی،

استغناء

استغنار کے معنی بے نیازی کے ہین، اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے،

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ،	اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے)
(آل عمران - ١٠)	تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہی،

اور اس بے نیازی مین خدا کا کوئی شریک نہین ہے، وہی ایک بے نیاز ہے، اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے،

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ، (محمد - ۴)	اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو،

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اُس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسرون سے بے نیاز ہو، اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے، اسلام کے آئینِ اخلاق مین اس استغنار اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولون پر قائم ہے، اوّل یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اُس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اُسکے

سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جسکو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں، اسکی ایک درمیانی آیت یہ ہے،

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (فاتحہ) — (اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں،

خدانے جا بجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے، فرمایا،

وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (آل عمران-۱۸) — اور کیسا اچھا کارساز،

وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (اسرائیل-۷) — اور تیرا رب کارساز بس ہے،

اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا (اسرائیل-۱) — میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ،

وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا (نساء-۱۱) — اور اللہ کارساز بس ہے،

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے، اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (زمر-۴) کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں، اسلئے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں،

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے، یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملتا ہے اس پر طمانیت حاصل کیجائے، اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط (نساء-۵) — اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو،

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا	اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف
مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ،	جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے
(طٰہٰ - ۸)	لوگوں کو سامان دیا ہے،

بعض لوگ باوجود دولتمند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے اُن کی نیت نہیں بھرتی، اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اسلئے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولتمند نہیں ہوتا تاہم خدا نے جو کچھ اُس کو دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے، اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اسلئے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے، اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے، اور اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے،

لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض	دولتمندی مال و اسباب کی کثرت
ولکن الغنیٰ غنی النفس	کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولتمندی
(بخاری، رقاق، باب الغنیٰ غنی النفس)	دل کی بے نیازی ہے،

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی رحمہ نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے "تونگری بدل است نہ بمال"،

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا حضرت ابوذر رضی فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا تو تمہارے خیال

مین مال کی قلت کا نام محتاجی ہے ؟ مین نے کہا "ہان" فرمایا "بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی" اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہین ہوتی، یعنی خدا انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اُس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس مین پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہی تعلیم دی، اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمھاری قسمت مین ہے اگر تم اُس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے[2] ایک بار چند انصاریون نے آپ سے مال کا سوال کیا، اور آپ نے اُن کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہین ہوئے، اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر اُن کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا مین تم سے بچا کر جمع نہ کرون گا، جو شخص خود داری چاہتا ہے خدا اس کو خود دار بناتا ہے، اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے[3] اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار اُن کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر مین فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے خدا اس مین برکت دیتا ہے، اور جو شخص اس کو حرص کیسا تھ

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس [2] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۴ [3] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستعفاف،

لیتا ہے، اس مین برکت نہین ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے، لیکن اسکا پیٹ نہین بھرتا، اُن پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھون نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہین قبول کیا۔[1]

فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی، اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے، اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے،[2] حضرت سہل بن سعد کہتے ہین کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانون سے بے نیاز ہوجانا ہے۔[3]

---

[1] ترمذی کتاب الزہد [2] زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ [3] مستدرک حاکم ۴ صفحہ ۳۲۵ کتاب الرقاق،

رذائل

رذائل کے معنی رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور انکی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود، اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے،

رذائل کے قرآنی نام اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو مُنکَر (ناشناسا)، اور فَحشَاء (بیحیائی) اور کبھی فَاحِشَۃ (فحش) سَیِّئَۃ (برا) سُوْءٌ (برائی) مَکرُوْہٌ (ناپسندیدہ) خطأ (ناصواب یا بھول) اِثْم (گناہ)، عُدْوَان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل

سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے، اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا،

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ	اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے
اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ	مت مار ڈالو، ہم ہیں انکو اور تمکو روزی
اِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً	پہنچاتے، بے شبہہ ان کا مار ڈالنا بڑی
كَبِيْرًا، وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى	چوک ہے، اور زنا کے پاس مت
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ	جاؤ، بے شبہہ یہ بے حیائی اور
سَبِيْلًا ۔۔۔۔۔۔۔۔	بری راہ ہے، ۔۔۔۔۔
وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا	اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ	کو پھاڑ ڈالے گا، اور نہ لمبائی
تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا كُلُّ ذٰلِكَ	میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا، ان میں سے
كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ	جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار
مَكْرُوْهًا (بنی اسرائیل۔۴)	کے نزدیک ناپسندیدہ ہے،

رذائل کے لئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ مُنْكَر ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ مُنكر سے ادا کیا گیا ہے،

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ	وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے

فَعَلُوْهُ، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا جو کرتے تھے رو کتے نہ تھے، کیا برا

يَفْعَلُوْنَ، (مائدہ ۱۱) کام ہے جو وہ کرتے تھے،

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جارہی ہیں، اس سلسلہ میں ہی،

وَتَأْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ، اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب

(عنکبوت ۳) ہوتے ہو،

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے،

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ ۱۴) اور منکر سے منع کرنے والے،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، (آل عمران ۱۲ و توبہ ۹) اور منکر سے منع کرتے ہیں،

اور کہیں فحشاء اور منکر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے،

فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، (نور ۳) وہ فحشا، اور منکر کرنے کو کہتا ہی،

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، (عنکبوت ۵) وہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہی،

فحشا، منکر اور بغی کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں، فحشا، منکر اور بغی،

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ (نحل ۱۳) اللہ انصاف اور احسان

الْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم

وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ دیتا ہی اور فحشا، اور منکر اور بغی سے منع

وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فرماتا ہی، تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہی تاکہ تم نصیحت پکڑو

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم وحیا سے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی،[1]

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر و شر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے،[2] قتادہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جن اخلاقِ حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کئے جاتے تھے، اُن میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو، اور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت نہ کی ہو،[3]

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فحشاء اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے،

فحشاء کے معنی | ان میں پہلا لفظ فحشاء ہے، جس کی دوسری صورت فاحشۃ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں،[4] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اُس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ [2] مستدرک حاکم ج ۲ صفحہ ۳۵۶ [3] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور

[4] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [5] الصحاح جوہری لفظ "فحش" و لسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش"

کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرمادیں، اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدیِ حدود اور فحشار اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (مومنون۔۱)	اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں،

اسی لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہی، اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہوگئے ہیں، قرآن نے کہا ہے،

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۖ وَسَآءَ سَبِيْلًا ط (اسرائیل۔۴)	اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ فاحشہ (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے،

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے،

منکر کے معنی دوسرا لفظ مُنْکَر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں، مطلب یہ

ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے، اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لیئے اس کو مَعْرُوْف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے، اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ مُنْکَر (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ، (حجر و ذاریات) یعنی لوگ، اَن جانے اور اَن پہچانے ہیں، حضرت یوسف علیہ السّلام کے سامنے جب اُن کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ اُن کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے، فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (یوسف-) یعنی "یوسف نے تو ان کو پہچان لیا، مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے"۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے، اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی مُنْکَر ہے، فرمایا،

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا	اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی
بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ	ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ	کے چہروں میں تو مُنکر (بگڑی ہوئی
يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ	شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہیں
يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (حج-۵)	کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بد نمائی پیدا ہوتی ہے، اس کو منکر کہا گیا ہے، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرةً اور بداہتہً ناپسند کرتا ہے۔ اور اُن کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اُس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب وملت اور ہر اچھے تمدن وتہذیب میں وہ یکسان برے سمجھے جاتے ہین،

بغی کے معنی | تیسرا لفظ بَغی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہین،

خَصْمَانِ بَغیٰ بَعْضُنَا عَلیٰ بَعْضٍ (ص - ۲) — ہم دو جھگڑنے والے ہین، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے،

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگون کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگین،

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ (شوریٰ) — اور اگر اللہ اپنے بندون کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین مین زیادتی کرنے لگین،

اسی سورہ میں ہے،

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (شوریٰ) — راہ ان ہی پر ہے جو لوگون پر ظلم، اور زمین میں زیادتی کرتے ہین،

ان آیتون سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسرون پر زیادتی اور تعدّی کے ہین،

اخلاقِ ذمیمہ برے کیون ہین | اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشاء، منکر

اور بغی میں منحصر ہیں۔ صفاتِ ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں، اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور اُن کے جائز کر دینے سے دوسرون کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے،

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ	اے پیغمبر! کہدے کہ میرے پروردگا
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ	نے برائی کے سارے کامون (فواحش)
الْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ،	کو جو کھلے ہون یا چھپے، اور گناہ کو
(اعراف - ۴)	اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے،

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظون میں منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہون یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام، اور تیسرے ناحق زیادتی، اُن اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکسان برا کہا ہے، اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہین، اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں، اور اگر اُن کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اُٹھ جائے، اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے[1]،

[1] منطقی اصطلاح میں فحشاء، منکر اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینون کا اجتماع تو ہوسکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینون میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینون کا یا تینون میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے،

رذائل کی ترتیب ان رذائل کی ترتیب دو نظریون کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک تو کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے، اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے، اوپر کی آیت مین ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانون مین گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشاء، پھر منکر، پھر بغی،

فحشاء مین جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساسًا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری مین مبتلا ہونا وغیرہ، منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگ دلی، اولاد کی نالائقی، اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھا لیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی، دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہین جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیان ہین، جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہین، اور پھر وہ ہین جو رضاے الٰہی سے خالی ہین،

جھُوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ مین سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہون، اور جھوٹ ٹھیک اس کے ضد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیون کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہین جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے، اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہین ظاہر کرتا، بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے، تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص مین دنیا کی جو برائیان بھی نہ ہون وہ کم ہے کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے، جس مین حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے،

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبرون کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِدْرِيْسَ — اور اس کتاب مین ادریس کا ذکر کر،

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا، (مریم-۴) — وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا،

اسی لئے جو کاذب ہے وہ نبی نہین ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا، اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا، تو اس کے ایک درباری نے جو دل مین مسلمان تھا، فرعونیون کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدقِ نبوت پر انکی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی، اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہین ہو سکتا،

اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ — اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی

وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ — پر پڑے گا، اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑیگا

بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ اِنَّ — کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بیشک

اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ — اللہ اس کو راہ نہین دکھاتا جو بیباک

كَذَّابٌ، (مومن-۴) — جھوٹا ہو،

اس مین یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعیِ نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گذرنے مین بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے، انبیاء علیہم السّلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہین، اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہین، روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار مین ابو سفیان سے جو باتین پوچھی تھین ان مین ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا، ابو سفیان نے جواب

دیا نہیں، قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟ نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے،

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ	شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار
يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ	پر، لا ڈالتے ہیں سُنی بات، اور
كٰذِبُوْنَ. (شعراء-۱۱)	بہت اُن میں جھوٹے ہیں،

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیاے کرام علیہم السّلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ	بے شک اللہ اس کو راہ نہیں
كٰذِبٌ كَفَّارٌ (زمر-۱)	دکھاتا جو جھوٹا ہو، احسان نہیں مانتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں، اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں لیجانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے، اور جو

ل صحیح بخاری بدء الوحی ۲ صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ، و جامع ترمذی باب ما جاء فی الصدق والکذب وابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب،

نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے، اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا، اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا، تو گناہ کے کام کرے گا، اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا، اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا؛

(مسند احمد اول ص۱۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے، جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں، اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے،

اسلام کے لعنت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہی لعنت کے معنی "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی" کے ہیں، قرآنِ پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے، اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا، جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے، مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے

گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو،

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ — پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی

عَلَى الْكٰذِبِيْنَ. (آل عمران-۶) — لعنت بھیجیں،

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا،

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ — اس پر اللہ کی لعنت ہو، گر وہ جھوٹوں

مِنَ الْكٰذِبِيْنَ، (نور-۱) — میں سے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بنجائے، حق کا علم رکھ کر بھی اُس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا — بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے

مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ — ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان

بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى — اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان

الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ — کو انسانوں کے لئے کھول کر کہدیا

اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ، (بقرہ-۱۹) — ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور

لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں، اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لئے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں، لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں، اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں،

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ	اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق
لَكٰذِبُوْنَ۔ (منافقین-۱)	جھوٹے ہیں،

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے[۱]، لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی، مگر وعدہ کرکے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بنکر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے، کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنیً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا، اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا،

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب، باب قولہ تعالیٰ وکونوا مع الصادقین، وما ینہی عن الکذب،

بری صفتین بھی ظاہر کی ہین، جیسے

اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ، (شعرا۶-۱۱)	جھوٹ بولنے والا گنہگار،
كٰذِبٌ كَفَّارٌ، (زمر-۱)	جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا
مُسْرِفٌ كَذَّابٌ، (مومن-۴)	بے باک جھوٹا،

ان آیتون نے بتایا کہ جھوٹا گناہون مین لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہین، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر مین اس کو چھپاؤن گا، اس لئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہین مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت مین جھوٹا ہی سمجھیگا، اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ مین مانتا ہون تو کسی کو اس کی بات پر یقین کاہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اسکو کسی برے سے برے کام کے کرنے مین باک نہین ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے،

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل مین نہین، یا جو اُس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے، کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے،

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ	اس لئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا
وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ،	اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ
(توبہ-۱۰)	جھوٹ بولتے تھے،

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی، قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے،

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا	اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور
لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ	ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں
أَنفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ	چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں
لَكَاذِبُونَ،	ڈالتے ہیں، اور اللہ کو معلوم ہے کہ
(توبہ - ۶)	وہ جھوٹے ہیں،

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے اُن صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا، اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے اُن کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ	تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کے سبب
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ	سے اجر دے اور منافقوں کو سزا
الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ	دے اگر چاہے یا اُن پر رجوع ہو،
عَلَيْهِمْ، (احزاب - ۳)	(یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے، فرمایا

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ، (علق - ۱)	جھوٹی خطاکار پیشانی،

ہر چند کہ اس کو استعارہ کیئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے، جو مٹ

نہین سکتا،

سی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہین ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے،

قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ	انھون نے کہا اگر ہم جانین کہ لڑائی
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ	ہو گی تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلین
مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ	وہ اس وقت ایمان سے زیادہ
بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ	کفر سے قریب ہین، وہ منھ سے
(آل عمران - ۱۷)	وہ کہتے ہین جو ان کے دل مین نہین،

دل کے ان بیمارون کے متعلق جو مسلمانون اور یہودیون دونون کو خوش رکھنا چاہتے تھے، اور مسلمانون کو آکر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالی نے فرمایا،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ	یہ وہ ہین جن کے دل کا حال اللہ
مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ، (نساء - ۹)	جانتا ہے،

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہین ہے، یا اپنے مین وہ باور کرانا چاہے جو اس مین نہین ہے جھوٹا ہے، ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر مین یہ ظاہر کرون کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا، اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے، فرمایا، جو جتنا نہین دیا گیا اتنے کا دکھاوا

کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے۔[1] حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا، اور جس نے جو نہیں دیا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا، اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولتمند نہیں وہ دولتمندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے، غالبا اسی لئے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی زور فرمایا ہے۔[2]

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لئے اُن سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے، اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے، اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ ایک کم سن صحابی عبداللہ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ "یہاں آؤ تجھے کچھ دونگی" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کچھ

---

[1] ابوداود کتاب الادب [2] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر،

ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہین چاہتی ہو، مان نے کہا اس کو کھجور دے دونگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہان اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتین تو یہ جھوٹ بھی تمھارا لکھا جاتا۔[1]

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال مین بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہین کرنا چاہئے، لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لئے بھی ہے کہ مان باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن مین جو کچھ دیکھے اور سنے گا، اسی سانچے مین ڈھلے گا، اس لئے لوگون کو چاہئے کہ بچون سے بھی جھوٹ نہ بولین۔

بعض لوگون کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب اُن کو کھانے کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہدیتے ہین کہ مجھے خواہش نہین، حالانکہ ان کے دل مین اسکی خواہش موجود ہوتی ہے، تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم مین سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے، اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہین تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا، ارشاد ہوا کہ ہر جھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔[2]

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہین پہنچتا بلکہ بعض موقعون پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہین دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص لوگون کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے، اس پر

[1] ابوداؤد، کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔ [2] مسند احمد و طبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی ج ۱ ص ۱۴۰ باب فی ذم الکذب)

افسوس، اس پر افسوس ہے"۔ کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے، اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے،

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لئے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے، لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے، اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے۔ کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درانحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو"۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے، اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زُور اور اِفک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جن کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے،

---

[1] سنن ابی داود کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [2] ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وہو لک مصدق۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ — بتون کی گندگی اور جھوٹی بات کے

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (حج-۴) — کہنے سے بچتے رہو،

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس مین کذب وبہتان وغیرہ سب شامل ہین، لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی مین ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا مین تم لوگون کو سب سے بڑا گناہ بتاؤن؟ صحابہؓ نے کہا "ہان یا رسول اللہ" فرمایا کہ "شرک اور باپ مان کی نافرمانی"۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ "جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے، یہان تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہوجاتے۔ اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث مین غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہو کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا،

اِفک اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہین کسی پر جھوٹ باندھنا، مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے اِفک کہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے، منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ "اِفک" سے تعبیر کیا ہے، (نور-۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ "یہ افک" بڑے خبث طینت کا کام ہے، فرمایا،

لہ ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حقوق الوالدین،

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ۔ اور شیطان (تو) اترا کرتے ہین ہر جھوٹ

(الشعراء-۱۱) باندھنے والے بدکردار پر۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسرون سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے، اور سوسائٹی مین اس کی بات کی قدر نہین ہوتی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

کَفٰی بالمرء کذبًا ان یحدث آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ

بکل ما سمع، (مقدمہ صحیح مسلم) کہتا پھرے،

ایسے لوگون کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہین اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والون) کا خطاب دیا ہے، یہودیون کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا،

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (مائدہ-٦) جھوٹ کے بڑے سننے والے ہین

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت مین شہادت یعنی گواہی ہے جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھاکر کہتا ہے وہ اصل مین اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے، ایسی حالت مین خیال کرنا چاہئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے، اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہین اور سچائی سے دور ہین وہ بات بات پر قسم کھاتے ہین، انھین معلوم ہے کہ لوگ اُن کے بیان کو سچا نہین سمجھتے اس لئے وہ لوگون کو فریب دینے کے لئے جھوٹی قسمین کھاتے ہین،

اوّل تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی برا ہے، پھر جھوٹی قسمین کھانا تو اور بھی برا ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین اس قسم کے قسم کھانے، اور قسم کھانے والون کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس مین جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے، اسی لئے کسی آیندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کرسکے، تو وہ گنہگار ہوتا ہے، اور اس پر کفارہ لازم

آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانے کھلائے یا کپڑے پہنائے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے، اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے،[1]

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ	اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں
اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ	پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو
بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ج	تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے
فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ	کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ
مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ	کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے
اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ	ہو، یا ان کو کپڑا دینا یا ایک غلام آزاد
رَقَبَةٍ ط فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ	کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دن
ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ط ذٰلِكَ كَفَّارَةُ	کا روزہ رکھنا یہ ہے تمہاری قسموں
اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ط وَاحْفَظُوْٓا	کا اتار، جب تم قسم کھا بیٹھو، اور اپنی
اَيْمَانَكُمْ ط (مائدہ - ۱۲)	قسموں کو نگاہ رکھو،

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کرکے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلافِ شرع، یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اسکو حتی المقدور پورا کیا جائے، اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے،[2]

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور،

کفارہ اسی لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے،

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے، یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انسب معلوم ہو، تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، خدا نے فرمایا،

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ	خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول
اَيْمَانِكُمْ، (تحریم-۱)	ڈالنا ٹھہرا دیا ہے،

اور احادیث مین اس کی جزئی تصریحات مذکور ہین،

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت مین گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت مین جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لئے ایسا شخص جو بات بات پر قسمین کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار، اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک مین ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ	اور بہت قسمین کھانے والے ذلیل
(قلم-۱)	کا کہنا نہ مان.

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانین، اور اس کا اعتبار کرین، لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمین کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت، اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے،

چونکہ اس طرح کی قسمین کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہین، اسی لئے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے، اور قرآنِ پاک مین اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقون کے تذکرہ مین ہے کہ جب اُن پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمین کھا کھاکر کہتے ہین کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمھارے دل کی بات خوب معلوم ہے،

فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ	پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت
بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ	سے کوئی تکلیف پہنچے، پھر تیرے
يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا	پاس اللہ کی قسمین کھاتے آئین کہ
إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا أُولَٰئِكَ	ہماری غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی،
الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي	یہ وہ ہین جن کے دلوں کا حال اللہ
قُلُوبِهِمْ (نساء-۹)	کو معلوم ہے،

یعنی اللہ جانتا ہے کہ اُن کے دلون مین کچھ ہے، اور زبانون پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہین کہ قسمین کھا کر سچ کو جھوٹ، اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دین، خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو، تو ان کو چاہیئے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کرین،

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ	تمھارے (مسلمانون کے) آگے
وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ	خدا کی قسمین کھاتے ہین، تاکہ وہ

اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (توبہ - ۸)

تم کو راضی کریں، اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے اگر وہ ایماندار ہیں

ایسے منافقون کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہین اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہین،

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ مَا قَالُوْا وَ لَقَدْ قَالُوْا کَلِمَۃَ الْکُفْرِ (توبہ - ۱۰)

خدا کی (جھوٹی) قسمین کھاتے ہین کہ انھون نے نہین کہا، حالانکہ انھون نے بیشک کفر کی بات کہی،

ایک موقع پر منافقون نے ایک نامعقول کام کیا، خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر اُن سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائین گے سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ (توبہ - ۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (توبہ - ۱۲)

تمھارے آگے قسمین کھاتے ہین، تاکہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگون سے راضی نہین.

اس لئے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہین اور زبان سے قسمین کھا کر کہتے ہین کہ مانتے ہین وہ فاسق اور نافرمان ہین،

اسی موقع پر کچھ منافقون نے مسلمانون مین تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد

الگ کھڑی کر لی تھی، خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھوگے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا،

وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ	اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ	ہی چاہی تھی، اور اللہ گواہی دیتا ہے
(توبہ - ۱۳)	کہ وہ جھوٹے ہیں،

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے،

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ	اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں
يَعْلَمُونَ، (مجادلہ - ۳)	کھاتے ہیں،
اِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً،	انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال
(مجادلہ - ۳) و منافقون - ۱)	بنایا ہے،

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، اور اس کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنایا کرتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی،

وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ	اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ
تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ	مت ڈالو، اور تم نے اپنے پر خدا کو
عَلَيْكُمْ كَفِيلًا، إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ	ضامن بنایا ہے۔ بیشک اللہ تمھارے
مَا تَفْعَلُونَ، وَلَا تَكُونُوا	کاموں کو جانتا ہے، اور اس عورت

كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ

(نحل - ۱۳)

کے جیسے نہ ہو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کئے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی تم اپنی قسموں کو آپس مین پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو،

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا، اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے، اسی لئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا، اس لئے قسم کھا کر توڑا نہ کرو، اور لوگون کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بے وقوف عورت کا تھا، جو سوت کات کات کر کھول دیتی، یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی،

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بد عہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے، تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے،

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے، اور یہ ایک کے بجائے دو گناہون کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ	بے شک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی
وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ	قسمون پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے
لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ	ہین، آخرت مین اُن کا کوئی حصہ نہین
وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ	نہ اللہ اُن سے بات کرے گا، اور
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ	نہ اُن کی طرف دیکھے گا قیامت مین
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔	اور نہ اُن کو پاک کرے گا، اور اُن
(آل عمران - ۸)	کے لئے دردناک عذاب ہے،

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیون کی بددیانتیون کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہرحال عام ہے، ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہیگا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا، تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا" اشعث بن قیسؓ صحابی نے کہا "خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ مین اتری ہے، میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، مین نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ مین نے کہا نہین، تو آپ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو مین نے عرض کی کہ یارسول اللہ وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لیگا، اس وقت یہ آیت اتری[1]"

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور وابن جریر،

ابن جریر کی بعض روایتوں مین ہے کہ یہ آیت اُن سوداگرون کی شان مین ہے جو جھوٹی قسمین کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہین، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپنے تین دفعہ فرمایا "تین آدمی ہین جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔" صحابی کہتے ہین، مین نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے مین پڑے، وہ کون ہین یا رسول اللہ! فرمایا جو اپنا پاس گھٹنون کے نیچے تک لٹکاتا ہے، (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے، اور جو جھوٹی قسمین کھا کر اپنا مال بیچتا ہے۔ (مسلم و ابوداؤد، و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ) بہرحال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے، اس لئے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکسان جاری ہوگا۔

صحیح مسلم مین ہے کہ آپ نے فرمایا "جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا" صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو، فرمایا درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیون نہ ہو۔[1] حضرت انسؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بڑے بڑے گناہ یہ ہین، خدا کا شریک ٹھہرانا، مان باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا، اور جھوٹی قسم کھانا۔"[2] ایک اور حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا "جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو د

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین،

[2] سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر،

اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔ چہرہ کی خصوصیت شاید اس لئے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھیٹھائی دکھائی، جس کا اثر چہرہ پر نمایان ہوتا ہے،

عموماً تاجر اور سوداگر چیزون کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے مین جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہین، اور جھوٹی قسمین کھاتے ہین، اس لئے خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا "جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے، لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے۔" روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر مین چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت مین ہے، حضرت قتادہؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجارت مین بہت قسمین کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے، کیسے بلیغ فقرے ہین، فانه ینفق ثم یمحق (مسلم ونسائی وابن ماجہ)

جھوٹی قسمون کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمین کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے، قرآنِ پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمین کھانا ذلت وخواری کا سبب ہے، وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم) حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسمین کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے۔"

ملہ سنن ابی داؤد کتاب الایمان، ملہ صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی ونسائی، منذری باب ترغیب التجار فی الصدق، ملہ صحیح ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری ج ۲ باب ترغیب التجار فی الصدق ۱۲

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اُس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے، اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے، اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں، جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے، تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا:۔

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل) بیشک وعدہ کی باز پرس ہوگی،

اور جس کی باز پرس خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی،

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ اُن کی بد عہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، فرمایا،

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔ (توبہ-۱۰)

پس اس کا اثر اُن کے دل میں خدا نے نفاق رکھا، اُس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، اس لئے کہ انھوں نے خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا، اور کہ وہ جھوٹ بولتے تھے،

صحیحین مین ہے کہ "منافق کی نشانی تین ہے، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔" (صحیح مسلم مین اسکے بعد ہے) "اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو، اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے" صحیحین کی ایک اور حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ چار باتین جس مین ہون وہ پکا منافق ہے، اور جس مین ان مین سے کوئی ایک ہو اس مین منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے[1]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے تین باتون کا ذمہ لو تو مین تمھارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہون، جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو، اور جب امین ہو تو خیانت نہ کرو[2]

---

[1] ترغیب و ترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق [2] احمد، حاکم، ابویعلی، بیہقی، منذری باب انجاز الوعد

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو، اس کے ادا کرنے مین ایمان داری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اُس مین بیجا تصرف کرتا، یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو، تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو، یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا، علیٰ ہذا عام مسلمانون، ائمۂ وقت، اور اپنے متفقہ قومی و ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میان کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل مین کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا، اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، اسلام کی اخلاقی شریعت مین یہ ساری خیانتین یکسان ممنوع ہین، فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا — اے ایمان والو! اللہ اور رسول

اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ	کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتون
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (انفال-۳)	مین جان کر بد دیانتی کرو،

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کرکے پورا نہ کیا جائے، ایمان داری سے اُن کے حکمون کی تعمیل نہ کی جائے، دین وملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ ورسول اور مسلمانون کے دشمنون کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانون کے چھپے راز اُن کو بتائے جائین، اسی طرح آپس کی امانتون مین خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس مین وہ ناجائز تصرف کرے، اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسرون پر ظاہر کر دے،

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ منافق کی تین علامتون مین سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس مین خیانت کرے[۱]، ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انھون نے کہا کہ خدا کی راہ مین مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ خدا کی راہ مین شہید ہی ہوا ہو، اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہیگا خداوندا! اب کیسے لاؤن، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقۂ ہاویہ مین لے جاؤ، وہان امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت مین سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا، اور اس کے پیچھے گرے گا، یہان تک کہ اُس کو پکڑ لے گا، اور اس کو اپنے کندھون پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اُس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر

[۱] صحیحین وغیرہ ۱۲

اس کے پیچھے ہمیشہ گرتا چلا جائے گا، پھر انھون نے فرمایا نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے، اور بہت سی چیزین گنا کر فرمایا، اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزون کا ہے، راوی کہتا ہے کہ مین نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب صحابی کو سنائی، انھون نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہین سنی، اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا، (نساء - ۸)

یعنی بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتین امانت والون کو ادا کر دیا کرو۔[1]

انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دین گے، خیانت کرین گے، امانت داری نہین کرین گے، اور نذر مانین گے تو پوری نہ کرین گے۔[2]

انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن بری باتون سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، اُن مین سے ایک خیانت بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت بُرا اندرونی ساتھی ہے۔[3]

خیانت کے ایک معنی یہ ہین کہ کسی جماعت مین شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر مین لگے رہنا، چنانچہ منافقین جو دل مین کچھ رکھتے تھے اور زبان

---

[1] مسند احمد، بیہقی، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور، [3] ابو داؤد و نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور،

سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشون مین لگے رہتے تھے، مگر اُن کی یہ چال کارگر نہین ہوتی تھی، اور ہمیشہ اُن کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا،

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ، (مائدہ-۳)	اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے اُن کی ایک خیانت کی،

یعنی اُن کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی،

جس پر کسی امر مین بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے، حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہین کہ مین نے یہ سب اس لئے کیا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ، (یوسف-۷)	تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ مین نے چوری چھپے اس سے خیانت نہین کی، اور بے شک اللہ خیانت کرنے والون کے فریب کو نہین چلاتا،

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویون نے اپنے مقدس شوہرون سے بیوفائی کی، اُن کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہرون پر ایمان نہین لائین اور کافرون کا ساتھ دیتی رہین، خدا نے فرمایا،

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ	خدا نے کافرون کے لئے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی مثال

لُوۡطٍ ؕ كَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَيۡنِ	بیان کی، یہ دونون عورتین ہمارے
مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَيۡنِ فَخَانَتٰهُمَا	دو نیک بندون کے گھر مین تھین،
فَلَمۡ يُغۡنِيَا عَنۡهُمَا مِنَ اللّٰهِ	تو ان دونون نے اپنے شوہرون
شَيۡـًٔا ،	سے خیانت کی، تو یہ دونون پیغمبر
(تحریم - ۲)	ہوکر بھی، اپنی بیویون کو خدا سے

یہ دل کی خیانت تھی،

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہین ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہوسکتی ہے، یہان تک کہ چشم و ابرو کے اشارون سے ہوسکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے، تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کرکے خیانتون کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا،

يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا	اللہ جانتا ہے آنکھون کی خیانت کاری
تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ ہ (مومن ۲۰)	کو اور جو چھپا ہے سینون مین،

پھر اس سے چھپ کر کیون کر کوئی کام کر سکتا ہے،

غدّاری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پاکر اس کے خلاف کیا جائے، قرآنِ پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے، عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے، کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کرکے بدل جاتے تھے، اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، اُن کے ذکر میں خدا فرماتا ہے،

اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ	جن سے تو نے معاہدہ کیا، پھر وہ اپنا
ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ	عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں، اور وہ تقو
فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ	(خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر
فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ	ان کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو
فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ	ان کو ایسی سزا دے کہ اُن کے پچھلے
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ؁ وَاِمَّا	دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں
تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً	اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو

فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ — ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (انفال) — کو دغاباز خوش نہین آتے،

اس آیت مین گو اُن کافرون کا ذکر ہے، جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے، مگر دو باتین اس مین عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہین، ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقوی کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالی کی محبت سے محروم کر دیتی ہے، اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے، بدر کے قیدیون کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہان دی گئی ہے وہین یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کرین تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو مین لے آئے گا، فرمایا،

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ — اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا)

فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ — کرنا چاہین تو وہ اس سے پہلے خدا سے

فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ — بھی خیانت (دغا) کر چکے ہین، تو خدا نے

حَكِيْمٌ ۔ (انفال — ۱۰) — نے اُن پر قابو دے دیا، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو خدا ان سب کا حال جانتا ہے، اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے، اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس نے اُن کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے،

حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا

ہوگا[1] یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "بدعہدی نہ کرنا"[2] یعنی دشمنوں سے معاہدہ کرکے پھر غداری نہ کی جائے، ظالم بادشاہوں، حاکموں افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان کا وعدہ کرکے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں، اور جب وہ اُن کے قابو میں آجاتا ہے تو اسکو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو[3]

خدا فرماتا ہے،

یَآیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ، (مائدہ-۱)	اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول و قرار) کو پورا کرو،

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں، جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے، یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے، ایک دفعہ امیر معاویہ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا، اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر اُن کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کردیں، یہ دیکھ کر عمرو بن عنبسہ نامی ایک صحابی سوار

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] ایضاً [3] سنن ابن ماجہ و صحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی ایفاء العہد

ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہین، امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا "مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اسکی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے، (یعنی نہ اس مین سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے" یہ سُن کر امیر معاویہ واپس چلے آئے[1] غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ نے معاہدہ کے لفظون کی خلاف ورزی نہین کرنی چاہی تھی، لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتون نے اسکو بھی بدعہدی سمجھا، اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا،

[1] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد،

بُہتان

بُہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اُس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے،

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا، لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے کہ اُس کی بدنامی ہو، قرآن نے اسکا نام اِفک رکھا ہے، یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں، اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طعمہ نام مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر میں چوری کی، مسلمانوں کو اس پر شبہہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا، وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا، یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا، اور اس کو بَری ٹھہرایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے موافق فیصلہ

کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعتہً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا[1]، دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی، اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا، اور زرہ دوسرے کے گھر مین پھینک دی، لوگون نے اس کو پکڑا، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، آپ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا، اس وقت یہ وحی آئی[2] بہر حال واقعہ جو کچھ ہو، امرِ مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتین ہین،

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ

ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگون کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر، اور خیانت کارون کی طرف سے نہ جھگڑ، اور اللہ سے قصور معاف کرا، بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے، اور انکی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی مین دغا رکھتے ہین، بیشک اللہ خیانت کار گنہگار کو دوست نہین رکھتا، وہ

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء، [2] تفسیر طبری سورۂ نساء، آیت إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ،

مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا	وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور
يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ	خدا سے نہیں چھپنا چاہتے، اور وہ
اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝	اُن کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ
(نساء - ۱۶)	سازش کرتے ہیں، جو خدا کو پسند نہیں

اور اللہ ان کے کام کو گھیرے ہوئے

آگے چل کر ہے،

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ	اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ
إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا	اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے
فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا	اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے
مُبِينًا ۝ (نساء - ۱۶)	سر) لادا،

ان آیتوں میں خیانت کارانہ تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کیگئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور اُن کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہگار ہیں، اور خدا کی محبت سے محروم ہیں، یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں، اور خدا سے نہیں شرماتے، جو ہر جگہ اُن کے ساتھ ہے، اور اُن کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے، اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اس کے بعد یہ سرزنش اُس کو سنائی گئی کہ

جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا،

پہلے عرب مین دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردون سے ملتی تھی، وہ ان مین سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی، خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے، اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آیندہ اس جرم سے باز رہے گی،

وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ	اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھین گی اپنے
بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ، (ممتحنہ-۲)	ہاتھون اور پاؤن کے بیچ مین،

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے، پھر بن کئے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے، خدا نے فرمایا،

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور جو مسلمان مردون اور مسلمان
وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا	عورتون کو بن کئے (تہمت لگا کر)
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا	تکلیف پہنچاتے ہین، انھون نے
مُّبِيْنًا، (احزاب-۷)	بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا-

شریف بیویون پر بہتان باندھنا چونکہ اُن کی عزت پر حرف رکھنا ہے، اس لئے دنیا ہی مین اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے، اس کو کوڑے مارے جائین،

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ		اور جو لوگ شریف بی بیون کو
ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ		عیب لگاتے ہین، پھر نہ لائے چار
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً	(نور - ۱)	گواہ، تو اُن کو اسّی کوڑے مارو،
وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا		اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو، اور وہ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝		فاسق ہین، مگر جنھون نے توبہ کی،

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور مین فاسق ٹھہرایا گیا، اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہو گئی،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ بے گناہ ہو یعنی اُس نے وہ جرم نہین کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا،[۱] یہ گویا قذف یعنی تہمت بیجا کی مثالی سزا ہو گی، ایک اور حدیث مین آپ نے فرمایا کہ "جس مین جو برائی نہین، اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے"[۲] یعنی اُس سے بچنا چاہیے،

---

[۱] و [۲] سنن ابی داؤد کتاب الادب،

چغلخوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیون کے درمیان جھوٹی سچی باتین بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے، اور اپنا رسوخ جتائے، اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہین جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اُس سے نفرت پیدا ہو، اسی لئے قرآن نے ان لوگون کے اوصاف مین جن کی بات نہین ماننی چاہئے یہ لفظ کہے ہین،

مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۔ (قلم) — جو چغلی کھاتا پھرتا ہے،

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہین تو اُس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی مین کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ — اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے

فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْآ اَنْ تُصِيْبُوْا — پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو،

قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا — کہین کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو، پھر

فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ، (حجرات - ۱) — اپنے کئے پر پچھتانے لگو،

اس آیت مین غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبرین پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے، اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دوشخصون، بالخصوص عزیز و اقارب اور دوست و احباب مین نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے، اسی بنا پر حدیث مین آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مین تمہین بتاؤن کہ سب سے برے لوگ کون ہین، پھر خود ہی فرمایا،

المشاؤن بالنميمة المفسدون — جو چغلیان کھاتے پھرتے ہین اور

بين الاحبة (مسند احمد ج — دوستون کے آپس کے تعلقات خراب

۶ ص۴۵۹ عن اسماء بنت يزيد) — کرتے ہین،

صحیحین مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبرستان کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ ان مین سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا[۱]

صحیح مسلم مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الا انبئكم ما العضه هى — کیا مین تم کو بتاؤن کہ عضہ کیا ہے؟ وہ چغلخوری

النميمة القالة بين الناس[۲] — ہے جو لوگون کے درمیان بیان کیجاتی ہے،

[۲] مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم نمیمہ،

[۱] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لا یستتر من بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل علی نجاسۃ البول

لغت مین عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہین، اس لئے اگر اس حدیث مین تفریق کے معنی لئے جائین تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصون مین علٰحدگی کرنا چغلخوری کی حقیقت مین داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائین تو اس صورت مین بھی سحر اور چغلخوری مین مشابہت و مناسبت ہے، کیونکہ سحر سے بھی دو شخصون بالخصوص میان بی بی مین علٰحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید مین ہے،

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ	اس پر بھی ان (ہاروت ماروت)
بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ،	سے ایسی باتین سیکھتے ہین جن کی وجہ سے
(بقرہ ۱۲-۱۲)	میان بیوی مین جدائی ڈال دین،

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہین جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے، لیکن بعض علما کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا، عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ فلان شخص تمھاری نسبت یہ کہتا تھا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو یہ ہدایت کی تھی،

لا يبلغني احد من اصحابي	میرے اصحاب مین سے کوئی مجھ تک
عن احد شيئاً فاني احب	کسی کی بات نہ پہنچائے، کیونکہ مین
ان اخرج اليكم وانا سليم	یہ چاہتا ہون کہ تمھارے پاس آؤن
الصدر	تو میرا دل صاف ہو،

ابو داؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث،

لیکن اس قسم کی باتین عام طور پر وہ ہوتی ہین جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہین بعض اوقات
تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے، بعض حالتون
مین جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گذرتی ہے، بعض موقعون پر دوسرے
لوگ اس کو برا سمجھتے ہین، غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے، اور جب
لوگ اس بداخلاقی مین مبتلا ہوتے ہین، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتون کی ٹوہ مین لگے رہتے
ہین، تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائین، اسی بنا پر اہل عرب چغلخورون کو ہیزم
بردار کہتے ہین، یعنی جس طرح لکڑیان بیچنے والے لکڑیان چن چن کر لاتے ہین، اور ایندھن
کے لئے گھوم گھوم کر بازارون مین فروخت کرتے ہین، اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتون
کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پھیلاتے ہین، اور آتش فتنہ و فساد کے لئے ایندھن بہم پہنچاتے ہین،
قرآن مجید مین ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرون کی رائے کے مطابق "حَمَّالَةَ الْحَطَب"
یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگون کی چغلیان کھائی پھرتی تھی،
ان مین بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہین، یعنی چھپ چھپ کر لوگون کی باتین سنتے
ہین اور پھر ان کو دوسرون تک پہنچاتے ہین، اس قسم کے لوگون کو لغت مین قتّات
کہتے ہین، اور ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا یدخل الجنۃ قتّاتٌ ۔۔۔ جنت مین چغلخور داخل نہ ہوگا،

اس قسم کی باتین خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات،

ہین، تاکہ اُن کا اثر بڑھ جائے، اسی لئے عربی زبان مین چغلخوری کو "وشایہ" کہتے ہین جس کے معنی نقش ونگار کے ہین، اور ادھر کی اودھر لگانے کے لئے چغلخورون کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہی، اسی مناسبت سے چغلخوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہین، جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہین،

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہین ہے، بلکہ تحریر وکتابت اور رمز واشارت سے بھی چغلخوری کی جاسکتی ہے، اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہین بلکہ اعمال بھی اس مین داخل ہین، یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہین کہا جاسکتا کہ "فلان شخص یہ کہتا تھا" بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "فلان شخص یہ کام کرتا تھا"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا" چغلی کی مکمل تعریف نہین ہے بلکہ اسکی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہوجائے،

اس بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگون کے جو حالات دیکھے یا سُنے اُن کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ترکِ مالایعنی" کی جو ہدایت مسلمانون کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے،

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتون مین نہایت خطرناک

صورت مین ظاہر ہوتے ہین، اور قتل و خون ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہون کا مجموعہ ہے، اور اس مین غیبت، بہتان، تجسس، کذب و فریب نفاق، غرض مختلف بداخلاقیون کے عناصر شامل ہوتے ہین، اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے، اگر امراء کے دربارون مین تملق و خوشامد کے لئے چغلخوری کی جاتی ہے تو عام صحبتون مین اس سے تفریح خاطر اور لطف صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے، اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہین سمجھتے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مین بیان فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردون کی آواز سنی جن پر اُن کی قبرون مین عذاب ہو رہا تھا، فرمایا "اُن پر عذاب ہو رہا ہے، لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہین ہوتا، حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہین، ان مین ایک تو پیشاب آڑ مین نہین کرتا تھا، اور دوسرا لوگون کی چغلیان کھاتا پھرتا تھا"[1]

اس حدیث شریف کی شرح مین محدثین نے بڑی بڑی موشگافیان کی ہین، یہان تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ نے یہ فرمادیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہین پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کردیا،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر،

اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیان کی ہین، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونون بداخلاقیان اس قدر عام ہو گئی ہین کہ اُن کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگے ہین، حالانکہ وہ معمولی چیز نہین بلکہ کبائر و موبقات مین داخل ہین،

قرآنِ مجید مین بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افک عائشہ رضؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے،

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ	جب تم لگے اپنی زبانون سے اسکی
تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ	نقل درنقل کرنے اور اپنے منہ سے
لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ	ایسی باتین کہنے جس کی تم کو مطلق
هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ	خبر نہین اور تم نے اس کو ایسی ہلکی
(نور - ۲)	سی بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی سخت بات ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتین کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہین، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہین، حالانکہ وہ معمولی نہین ہوتین،

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب مین جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل، اور ناقابل اعتبار اشخاص مین پائی جاتی ہے، بغض و انتقام لینے، یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہان رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی مین شریک ہونے کے لئے اور کوئی

ذریعہ نہیں پاتے تو چغلخوری سے کام لیتے ہیں، اس لئے اُن کے شرو فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اُن کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآنِ مجید نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ،

(قلم-۱)

اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے، اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے، حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے،

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانون کی عزت وآبرو محفوظ رہے، اور اُن کے باہمی تعلقات خوشگوار رہین، اس بنا پر جن بداخلاقیون سے مسلمانون کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچتا ہے، اور اُن کے تعلقات مین ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے اُن کی ممانعت کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مین مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ	مسلمانو! مرد مردون پر نہ ہنسین، عجب
قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا	نہین کہ (جن پر ہنستے ہین) وہ (خدا کے
خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن	نزدیک) ان سے بہتر ہون، اور
نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ	نہ عورتین عورتون پر ہنسین عجب نہین
وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا	کہ (جن پر ہنستی ہین) وہ اُن سے بہتر
بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ	ہون، آپس مین ایک دوسرے کو
بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ	طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا، اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝

(حجرات-٢)

نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بد تہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئین تو وہی (خدا کے نزدیک) ظالم ہین۔ مسلمانو! (لوگون کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیونکہ بعض شک داخلِ گناہ ہین اور ایک دوسرے کی ٹٹول مین نہ رہا کرو، اور تم مین سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم مین سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے (اور خدا سے ڈرو بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے)

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانون کو اپنے قول وعمل سے مسلمانون کے عیوب کی پردہ دری نہین کرنی چاہیے، لیکن ان طریقون مین سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانون کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے وہ غیبت ہے، امام غزالی نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز واشارت، تحریر وکتابت اور محاکات ونقالی، ہر طریقہ سے دوسرون کے عیوب بیان کئے جا سکتے ہین، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین ودنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز مین عیب نکالا جا سکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ

نے نہایت پُرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے، جس مین بلاغت کے بہت سے نکتے ہین،

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جو چیز اُس کی عزت وحرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے،

۲۔ لڑائی جھگڑے مین جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب مین اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہین، اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے تاہم اس مین ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہی، اسی طرح اگر کوئی شخص رُو در رُو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے، تاہم اس مین بزدلی نہین پائی جاتی، لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے، اور بعینہ ایسا ہے، جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے،

۳۔ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہین کرتے، اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت وسنگدلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ اُس لطف ومحبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانون مین پیدا کرنا چاہتا ہے،

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے، اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا، اس لئے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے، اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے، اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہئے، اسی قرآنی تنبیہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ شب معراج میں میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ اُن سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے، اور اُن کی عزت و آبرو لیتے تھے،[1]

اعمال اور اعمال کی جزا و سزا میں مناسبت ہوتی ہے، یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے، یعنی اُن کی غیبت کرتے تھے، اس لئے عالم برزخ میں اُن کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں،

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ اُن لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔[2]

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ [2] ادب المفرد باب الغیبۃ،

اس حدیث مین بھی اعمال اور جزاو سزا کی مناسبت ظاہر ہے، مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے، اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے، اس لئے یہ بدبو اسی مردارخواری کا نتیجہ تھی،

اس حدیث مین ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے، اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگون کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہین اسی طرح اُن کے اس عمل کی نجاست وگندگی کی بو بھی دنیا مین پھیل کر لوگون کو اُن سے متنفر کرتی ہے، اسی نکتہ کو آپنے دوسری حدیث مین بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا "اے وہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمھارے دلون کے اندر جاگزین نہین ہوا ہے، مسلمانون کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش مین رہو، کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش مین رہے گا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا، اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دیگا"[1]

لغت کے رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی مین اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہین، مگر مذہبی تعلیم مین شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہین، اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیان ظاہر کی جائین تو یہ غیبت نہین، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ان دونون باتون کی تردید ہوتی ہے،

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

ایک حدیث مین ہے کہ لوگون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہین، آپ نے فرمایا، تمھارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے" کہا گیا کہ اگر میرے بھائی مین وہ عیب موجود ہو جس کو مین بیان کرتا ہون، تو فرمایا اگر وہ عیب اس مین موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہین ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی مین اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہین، بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی، لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہل لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی مین کی جائے، باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہین ہے بلکہ سب و شتم مین داخل ہے،

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہین ہے، بلکہ ہاتھ پانون، اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہی تو اس کے اس عیب کے نمایان کرنے کے لئے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے، ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔[2]

---

[1] و [2] ابوداود کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

اسی طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے،

اور قرآن مجید نے متعدد آیتون مین غیبت کے ان ہی مخفی طریقون کی برائی بیان کی ہی،

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ،	(لوگون پر) آوازے کسا کرتا ہی داد
(قلم - ۱)	کی اِدھر اُدھر کی اُدھر) چغلیان لگاتا پھرتا
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ،	ہر شخص جو (لوگون کی) عیب چینی کرتا
(همزہ)	(اور ان پر) آوازے کستا ہی، اس کی
	(بھی بڑی) تباہی ہے،

ان آیتون مین غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقون کی مذمت کی گئی ہے

اُن کی توضیح ترجمہ سے نہین ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے اہلِ لغت کی تصریحات پیشِ نظر

رکھنی چاہئین جو حسبِ ذیل ہین،

(۱) همز، سامنے، اور لمز، پیٹھ پیچھے برائی کرنا،

(۲) همز، خاص طور پر لوگون کے نسب کی برائی بیان کرنا،

(۳) همز، ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا،

(۴) همز، زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا،

(۵) همز، برے الفاظ سے ہم نشینون کی دل آزاری کرنا،

(۶) لمز، آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینون کی برائی بیان کرنا،

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہان تک وسیع ہے،

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے تاکہ اُن کو تنبیہ اور ندامت وشرمندگی ہو، گر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کردیا جائے تو اُن کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی، اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا، قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں، یا کفر کرتے ہیں، اُن کا حال یہ ہے، اس طریقۂ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا، اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہیں وہ اس لئے کہ انکی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں،

لیکن معاملات میں ایسے موقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآنِ پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے، قرآنِ پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، لیکن
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ	جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا اور
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ (نساء - ۲۱)	جانتا ہے،

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے،

لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگون سے بیان کرے، اور ظالم کے ظالمانہ کامون کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا،

حدیث مین ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین باریابی کی اجازت طلب کی، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان مین کس قدر برا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگون کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوالِ واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار مین دوسرون کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہین کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہین، تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے،

امام غزالی نے احیاء العلوم مین ان مقاصد کو چھ صورتون مین محدود کر دیا ہے،

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی مین فریاد کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، لصاحب الحق مقالاً،

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیون کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب، (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقون کی برائیان قرآن نے طشت از بام کی ہین)

(۳) فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] بخاری کتاب الادب باب مایجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب،

کی خدمت میں حضرت ابو سفیانؓ کے بخل کی شکایت کی، (اور آپ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا)

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غرض سے ایک شخص کو بئس ابن العشیرہ " قبیلہ کا برا آدمی " کہا تھا،

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو مگر غایتِ شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑھ نہ ہو، مثلاً اعمش یا اعرج کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا،

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث کہنا،

دُوْرُخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہیئے یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیئے، بلکہ یہ بد اخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ چغلخور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دُوْرُخا آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے،

دُوْرُخے پن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے، اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دُوْرُخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے، اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے، ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب اُن کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں، بو

بولے "ہم لوگ عہد رسالت مین اس کا شمار نفاق مین کرتے تھے"[1] اور قرآنِ مجید مین بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے،

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۔ (بقرہ - ۲)	اور جب اُن لوگون سے ملتے ہین جو ایمان لاچکے تو کہتے ہین ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہین اور جب تنہائی مین اپنے شیطانون سے ملتے ہین تو کہتے ہین ہم تمہارے ساتھ ہین، ہم تو صرف مسلمانون کو بناتے ہین

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقون کو اردو مین دو رُخا اور عربی مین ذوالوجہین کہتے ہین، اور احادیث مین اس قسم کے لوگون کے لیے وعید شدید آئی ہے، مثلاً فرمایا "قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے بُرا دو رخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگون کے پاس جاتا ہے تو اس کا رُخ اور ہوتا ہے، اور دوسرون کے پاس جاتا ہے تو اور"[2]

ایک اور حدیث مین فرمایا:-

"دنیا مین جس کے دو رخ ہون گے قیامت کے دن اس کے منہ مین آگ کی دو زبانین ہون گی"[3] یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگون سے دو رنگ کی باتین کیا کرتا تھا۔

[1] صحیح بخاری باب ما قیل فی ذی الوجہین [2] بخاری کتاب الادب باب ما قیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم ومالک

[3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی ذی الوجہین

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام مین بدنیتی ہی بدنیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام مین اس کو حسنِ نیت نظر نہین آتا، دوسرے کی طرف اَن ہوئی باتین منسوب کرنے لگتا ہے، دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اُس سے کترانے لگتا ہے، اس سے آپس مین نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندون کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ. (حجرات-۲)	اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسّس و تلاش کی بھی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہین، فرمایا:۔

"تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو، اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بیجا ہوس کرو، اور نہ آپس میں حسد رکھو، اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منھ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے، آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ"[1]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے، اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے، ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواجِ مطہرات میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آ پڑے، وہ آپ کو کسی عورت کیساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے، آپ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھ کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد و ترمذی و مالک، باب تحریم الظن [2] صحیح مسلم باب انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرءۃ یقول ھذہ فلانۃ ۱۲

مدّاحی اور خوشامد

مدّاحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنارت اور ذلّت کی علامت ہے، اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے، اور یہ اُس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے، جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے، خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہون کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفین کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہین ہوتین، یہ جھوٹ ہے، دوسرا یہ کہ وہ منھ سے جو تعریفین کرتا ہے اس کو اپنے دل مین خود درست نہین سمجھتا، یہ نفاق ہے، تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدون کے لئے اربابِ قدر وجاہ کی خوشامدانہ تعریف کرکے اُن کی اور لوگون کی نظرون مین اپنے کو ذلیل ورسوا کرتا ہے، جس سے اسکی دنارت اور ذلّت ظاہر ہوتی ہے،

بیجا تعریفون سے ممدوح مین بھی دو برائیان پیدا ہو جاتی ہین، ایک غرور، اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی، تعریفین سنکر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہین لگاتا ہے، اور پے در پے تعریفین سنکر اُس کو یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے، اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص

اس کو ایسا ہی سمجھے، بادشاہوں، امیروں، دولتمندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس طرح وہ برخود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے،

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے[1] اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے،

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ	جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں، اور
بِمَا اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا	جو انھوں نے نہیں کیا اس پر تعریف
بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ	کئے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَ	نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ،	جائیں گے اور ان کے لئے دردناک
(آل عمران - ۱۹)	سزا ہے۔

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام[2] ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرت الٰہی دستگیری فرمائے، اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آل عمران [2] فتح القدیر شوکانی،

اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہین، اس گناہ مین کسی نہ کسی درجہ مین شریک ہین، جس کی تفصیل بہت سی حدیثون سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تم نے اسکو برباد کر دیا، ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یون کہو کہ مین یہ گمان کرتا ہون بشرطیکہ اس کے علم مین وہ واقعی ایسا ہو، اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے۔[۲]

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سُن کر مغرور ہو جائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہین لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہین معلوم،

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفین جو لوگون کے منہ پر کی جاتی ہین اُن کو سُن کر اُن کے نفس موٹے ہو جاتے ہین، اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھون کی روشنی زائل ہو جاتی ہے، ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمان رضؓ کے منہ پر ان کی تعریفین کین، تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ مین خاک جھونک دی، اور فرمایا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ" مداحی کرنے والون

---

[۱] صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح [۲] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب مذکور،

سے ملو تو اُن کے منھ مین خاک جھونک دو[۱]" ادب المفرد مین ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد مین تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے، تو اس نے اس کی بڑی تعریفین شروع کین، آپ نے فرمایا "اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کردو[۲]"

[۱] صحیح مسلم و ابو داود باب کراہیۃ التمادح [۲] باب یحثی فی وجوہ المداحین،

بُخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیون مین سے ہے، یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیون کی جڑ ہے، خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنارت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی، اور بہت سی برائیان اسی ایک جڑ کی مختلف شاخین ہین، اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلھاڑی ماری، اور بھوکون کو کھلانا، ننگون کو پہنانا، محتاجون کو دینا، یتیمون کی خبرگیری، اور مقروضون کی امداد مسلمانون کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہین، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبریلؑ کی آمد کا حال سنایا، تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلون کی بنا پر دلایا وہ یہ ہین:

"یا رسول اللہ! آپ قرابت والون کا حق اور مقروضون کا قرض ادا کرتے ہین، غریبون کو سرمایہ دیتے ہین، مہمانون کو کھلاتے ہین، اور حق کے مصیبت زدون

کی مدد کرتے ہیں'' (صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے، بخالت اُن بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے، تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے، اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوْا	تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَ	ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین
لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝	کو کھلاتے نہ تھے، اور بحث کرنے
وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝	والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کرتے تھے
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (مدثر ۲)	کیا کرتے تھے، اور روزِ جزا کو جھٹلاتے

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے، اور وہ عمل کی جزا و سزا

پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا، جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہین، وہ اخلاص سے دوسرون کے ساتھ فیاضی بھی نہین کرسکتا، یہی نکتہ سورۂ ماعون مین جو مکہ کی پرانی سورتون مین سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا،

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ	کیا تونے اُس شخص کو دیکھا جو جزا کے
فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ	دن کو جھٹلاتا ہے، بس یہی وہ ہے
وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ	جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے
(ماعون)	اور فقیر کے کھانے پر آمادہ نہین کرتا ہے

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہین، کیونکہ یہ فیاضی اُس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہین ہوسکتی، جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا مین پانے کا متوقع رہتا ہے، اور جہان کہین اُس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہین ہوتی، وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہین ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہین کہ اُس کے دل مین یہ یقین نہین کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے، اور وہ کبھی ضائع نہین جاسکتی

ایک اور مکی سورہ مین اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جسکی روزی زیادہ نہین، اور اس لئے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، خدا فرماتا ہے،

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ	یہ خیال صحیح نہین، بلکہ بات یہ ہی

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ	کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہین کرتے،
الْمِسْکِیْنِ ۝ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ	اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے
اَکْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ	کو رغبت نہین دلاتے، اور مردہ کے
حُبًّا جَمًّا ۝	متروکہ مال کو کھا جاتے ہو، اور مال
(الفجر)	و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو،

ان آیتون مین باتین کئی بیان کی گئی ہین، مگر یہ سب بخل کی مختلف صورتون کی تشریح ہین، سورہ ہمزہ مین اُس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیون کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ ان کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا، اور یہ چیز اُس سے کبھی علحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے، فرمایا،

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ	جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اسکو،
یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝	سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ
کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ	زندہ رکھیگا، ہرگز یون نہین، وہ
(ھمزہ)	بالضرور، دوزخ مین ڈالا جائیگا،

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کار خیر مین خرچ نہ کرنے والے کو اُس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے،

کَلَّا اِنَّهَا لَظٰی ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی ۝	ہرگز نہین وہ تپتی آگ ہے کھینچ لینے
تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی ۝	والی کھال، پکارے گی اس کو

وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ٥	جس نے (حق سے) پیٹھ دی، اور پھر
(معارج - ۱)	گیا، اور اکٹھا کیا اور سینتا،

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہین، بلکہ وہ صرف چیزون کے حصول کا ذریعہ ہے، سونے چاندی کی اینٹین خود بخود روٹی، کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہین بن سکتین، اس لئے اُن کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہین، اُن کو ضروری اور اعلیٰ مقصودون کے حصول مین خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے، اور یہی اعلیٰ مقصود ہین جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ مین خرچ نہین کرتا، وہ اپنے لئے درہم و دینار نہین جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ	کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ مین خرچ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	نہین کرتے تو اُن کو دردناک سزا
اَلِيْمٍ ٥ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا	کی خوشخبری سنا دے، جس دن اسکو
فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا	دوزخ کی آگ مین گرم کیا جائیگا،
جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ	پھر اس سے اُن کی پیشانیان، کروٹین
هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ	اور پیٹھین داغی جائین گی، اور کہا
فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ٥ (توبہ ۵)	جائیگا کہ یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے...

یہ بخیل کی اس حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لئے مضر ہے جس کے رُکن وہ خود ہیں،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ	اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی
بِمَا آتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ	مہربانی سے اُن کو دیا ہے، روکے
هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ	رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں
لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا	بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں
بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ،	بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے
	ہیں اس کا طوق بنا کر ان کے گلے
(آل عمران - ۱۸)	میں قیامت کے دن پہنایا جائیگا،

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا تھا، وہ قیامت کے عالم مثال میں واقعی اُن کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔[1]

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلقِ خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی؛ اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے، اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے،

وَاللهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ	اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

فَخُوْرَ ٥ اِلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ	سے محبّت نہین کرتا، جو آپ بخل کرتے
یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ	ہین، اور لوگون کو بھی بخل کی ترغیب
(حدید-۳)	دیتے ہین،

اور جس سے خدا محبّت نہ کرے اُس سے کون محبّت کرسکتا ہے، اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے، اور عزیز و اقربا بھی محبت نہین کرتے، اور ایسے لوگون کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہو کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسرون کو ذلیل سمجھتے ہین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندون کی نگاہون مین بھی ذلیل و خوار ہوتے ہین،

قرآنِ پاک مین بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا قصہ سورۂ قصص مین ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ مین ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور مین جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہو گی) خزانے تو الگ رہے خزانون کی کنجیون کے گچھون کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا مین اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولتمند گذر چکے ہین، جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی انجام

یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، خدا نے فرمایا،

اَوَ لَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ	کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے
اَھْلَکَ مِنْ قَبْلِہٖ مِنَ الْقُرُوْنِ	قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور
مَنْ ھُوَ اَشَدُّ مِنْہُ قُوَّۃً وَّ	اور اس سے زیادہ دولت مند کو
اَکْثَرُ جَمْعًا ۝ (قصص ۔۸)	تباہ کر چکا ہے،

زمانۂ محمدیؐ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہدیا گیا،

مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا	ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس
کَسَبَ ۝ (ابی لھب)	نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا،

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اُس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے، اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے،

ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ	ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے
لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَمِنْکُمْ	کو بلایا جا رہا ہے، تو تم میں کوئی
مَّنْ یَّبْخَلُ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا	بخل کرتا ہے، اور جو کوئی بخل کرتا
یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاللّٰہُ	ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے،

الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ اور اللہ بے نیاز ہے، اور تم ہی محتاج ہو، (محمد - ۴)

یعنی اُس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑین گے،

بخیل آدمی دنیا مین بھی طرح طرح کی مصیبتون اور مشکلون مین گرفتار رہتا ہے۔ کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اُس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے۔ نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقرا اس کے لیئے بد دعا کرتے ہین، یہان تک کہ بیوی بچے جن کے لیئے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اُس سے خوش نہین رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہان رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اُس پر قبضہ کرے، چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہین، مگر ان تمام مصیبتون کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس مین سے کچھ خرچ نہین ہونے دیتا، لیکن اِدھر اسکی آنکھ بند ہوئی اور اُدھر اس کے وارثون نے اللے تللے اس کو اوڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کی دم مین اُڑا دیتی ہے، اور ہزارون بری عادتون مین مبتلا اور آخر مین مفلس و قلاش ہو جاتی ہے،

خدا اپنے رسولؐ کی زبانی فرماتا ہے،

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ	اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا،
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ	اور (خدا کی یا نیکی کی باتون کی) پروا
لِلْعُسْرٰى ۙ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ	نہ کی، اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو
مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۙ	ہم اس کو سخت کام کے لئے آسان
	بنائین گے، اور جب وہ گرے گا
(لیل)	تو اُسکا مال اس کے کام نہ آئیگا،

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بری عادت وخصلت اور برے کردار ہین جن مین وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے، اور اُن کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتین وہ جھیلتا ہے، راتون کو آرام سے سو نہین سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہین اٹھا سکتا، عزیز واقارب، دوست واحباب سے اُس کو مسرت نہین ہوتی، وہ سب سے نالان اور اُس سے سب نالان رہتے ہین، پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڈھے مین گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا، تو اللہ تعالی پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ	اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ
الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ
اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ
فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ

(منافقون - ۲)

اس مین سے اس سے پہلے کہ تم مین سے
کسی کو موت آئے (خدا کی راہ مین)
خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آنے
لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے
مجھے تھوڑی دیر اور کہین مہلت نہ دی
کہ مین خیر خرات کرتا اور نیکو کارون

(پ ۲۸ ع ۱۴)

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہین ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہین سکتا، اس کے لئے سامان پہلے سے چاہیے تھا،

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہین کہ جب وہ غریب ہوتے ہین تو بڑی بڑی دعائین کرتے ہین، خوب خوب وعدہ کرتے ہین کہ اگر خدا نے ہمین اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کرین گے، وہ کرین گے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ اُن کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہین، اور نیکی کے ہر راستہ سے منھ موڑ لیتے ہین، ایسے ہی لوگون کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظون مین کھینچا ہے،

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ
لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ
لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ

اور اُن مین کوئی ایسا ہے جس نے
خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو اپنے
فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کرینگے
اور نیکو کارون مین سے ہون گے،

مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ.
(توبہ - ۱۰)

پھر جب خدا نے اُن کو اپنے فضل سے دیا تو اس مین بخالت کرنے لگے، اور ٹل کر پھر گئے،

خدا فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے دل مین نفاق نے گھر کر لیا.

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ
(توبہ - ۱۰)

تو اللہ نے اُن کے دلون مین اس کا نتیجہ نفاق رکھا،

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتین سچے مومنون مین جمع نہین ہوتین، بخل اور بد خلقی[1]، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن برائیون سے بچنے کی خدا سے دعا مین مانگا کرتے تھے، اُن مین سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ "خداوندا مین بخل، کسل مندی، کبر سنی، قبر کے عذاب، اور زندگی اور موت کی آزمایش سے تیری پناہ مانگتا ہون[2]"

اسلام مین زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرات کی ترغیبات شریعتِ محمدیؐ مین اسی لئے ہین کہ انسانون کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک و صاف رہین،

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہین ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے

---

[1] جامع ترمذی [2] صحیح مسلم،

کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششون کا حق ادا نہین کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہین اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤن کے مستحق ہین، جس کو علم ملا ہے اُس کو چاہیئے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسرون کو بتائے، جو ایسا نہین کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً	اور کون اُس شخص سے زیادہ ظالم
عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ ؕ	ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے
(بقرہ - ۱۶)	پاس ہے چھپائے۔

حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا"[1] اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہین دیا، اس کا شمار بخیلون مین ہوگا،

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصون مین منقسم کیا ہے، اللہ کے حق اور بندے کے حق، اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندون کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ، یعنی مستحق لوگون کے ساتھ بخشش ہے، دیکھئے کہ ذیل کی آیتون مین ان ہی دونون کی عدم بجاآوری کو دوزخ مین جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے،

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ، قَالُوْا	کیا چیز تم کو دوزخ مین لے گئی کہینگے
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ	کہ ہم نمازیون مین سے نہ تھے، اور
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۙ (مدثر - ۲)	نہ محتاجون کو کھلاتے تھے۔

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجاآوری سے انحراف، اور دوسرا بندون کے حق سے تغافل
ہے یہی بات سورۂ ماعون کے آخر مین ہی،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ — پھر خرابی ہے اُن نمازیون کی جو اپنی

عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ○ — نماز سے بے پرواہ رہتے ہین وہ جو

الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ○ وَيَمْنَعُونَ — دکھاوا کرتے ہین، اور چھوٹی چھوٹی

الْمَاعُونَ (ماعون-۱) — چیزون کو مانگے نہین دیتے،

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہین ادا کرتے ہین اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہین، یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے، اور دوسری آپس مین مانگنے کی معمولی معمولی چیزون مین جیسے نمک، آگ، پانی، اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزون مین بخل سے کام لینا ہے، یہ بندون کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدمِ تعمیل کا سبب بنتا ہے، اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے،

حرص و طمع

حرص و طمع یا لالچ وہ برائی ہے جس مین نفس کی دنارت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصًا وہ حرص و طمع جس مین بخالت کی بھی آمیزش ہو، عربی مین اس کو شُحّ کہتے ہین، جس کی برائی قرآن مین کئی موقعون پر آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، گھر کا مالک زیادہ دینا نہین چاہتا، اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہین، شوہرون کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ زیادہ خرچ نہین دیتے، اور بیویان لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہین، یا ایک شخص کے کئی بیویان ہون تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے، اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملون مین کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف مین رہتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو، اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے، تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا، عشرت کدہ بنجائے گا، میان بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ مین قرآن کی تعلیم ہے،

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ | اور طبیعتوں (نفوس) مین حرص
وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ | دھری ہے، اور اگر تم احسان کرو،
اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا | اور تقویٰ اختیار کرو، تو اللہ کو تمھارے
(نساء - ۱۹) | کامون کی ساری خبر ہے،

یعنی میان بیوی دونون حرص اور لالچ چھوڑ دین، اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرین تو اللہ تعالیٰ جو ہر ایک کے کامون سے واقف ہے، سب کو اُن کے کامون کے مطابق جزا دے گا،

اس کاروباری دنیا مین ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے، جب تک انسان اپنی حرص و طمع کو روک کر اچھے کامون مین روپیہ خرچ نہین کرے گا وہ کامیابی حاصل نہین کرسکتا، خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی فرمایا،

وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ | اور خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کرو،
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ | اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ، (تغابن - ۲) | گیا وہی کامیاب ہین،

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانون کا وصف یہ ہے کہ دوسرون کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہین،

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ | اور اپنے اوپر (اورون کو) مقدم
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ | رکھتے ہین، اگرچہ خود اُن کو ضرورت

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (حشر-١)

ہو، اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہین،

اسی کا نام ایثار ہی، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے، اور یہ زینہ اُس وقت تک کسی کو مل نہین سکتا جب تک حرص وطمع کا خاتمہ نہ ہو، اسی لئے خدا نے فرمایا جو حرص وآز سے پاک ہون گے، وہی کامیاب ہون گے،

لالچی یہی نہین کہ اپنے مال کو خرچ نہین کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے، کیونکہ اس مین دو اور بد اخلاقیان شامل ہین، ایک بخل اور دوسری حسد، فرمایا،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ	اور اس کی ہوس نہ کرو جس مین اللہ
بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ	نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ	ہے، مردون کے لئے اُن کی کمائی کا
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا	اور عورتون کے لئے اُن کی، اور اللہ
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	سے مانگو اس کے فضل مین سے حصہ،
كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (نساء-٥)	بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز مین کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس

اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیون مل گئی، کاش خود اُسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم مین سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلانا چاہئے، اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا، اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت مین قناعت پیدا ہوگی، ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا، اسی لئے فرمایا،

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ	اور بے شک ہم نے تجھ کو دین سات
الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝	آیتین، اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے
لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا	تو اپنی آنکھین ان چیزون پر ست پسار
مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ	جو ہم نے ان مین سے مختلف لوگون
(حجر-۶)	کو فائدہ اٹھانے کو دی ہین،

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی، اس کی نظر مین دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟

یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "حرص و طمع سے بچو، کہ اسی نے تم سے پہلون کو برباد کیا، اسی نے اُن کو آمادہ کیا، کہ انھون نے خون بہایا اور حرام کو حلال سمجھا"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، صحیح ابن حبان اور حاکم مین اس سے زیادہ مفصل ہے، فرمایا "حرص سے بچو، کیونکہ اسی نے اگلون کو اس کی دعوت دی،

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم،

کہ انھون نے (بے گناہون کا) خون بہایا، اسی نے اگلون کو دعوت دی کہ انھون نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اور اسی نے اگلون کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا[۱]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک تقریر مین فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومین اسی حرص سے تباہ ہوئین، اسی نے اُن کو کہا تو انھون نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انھون نے بخل کیا، اسی نے اُن کو فسق و فجور کے لئے کہا تو انھون نے فسق و فجور کیا[۲]"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان مین سب سے بری بات کُڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے[۳]"، حریص آدمی اس لئے ہمیشہ غم مین کُڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہین ملا، وہ نہین ملا، فلان کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہین، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن مین رکھنے والی فرمایا، نسائی مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ایمان اور حرص ایک دل مین جمع نہین ہو سکتے[۴]"، سبب ظاہر ہے کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ صبر و توکل اور قناعت ہے، اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ مین فرمایا کہ "انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اُس کی دو چیزین جوان رہتی ہین، جینے کی خواہش اور مال کی حرص[۵]"۔ کئی صحابیون کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریون کے جھنڈ مین چھوڑ دیئے جائین وہ ان کو اتنا برباد نہین کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے[۶]۔

[۱] صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم [۲] ابو داؤد و حاکم [۳] صحیح ابن حبان و ابو داؤد کتاب الجہاد باب الجرأة والجبن [۴] نسائی [۵] ترمذی [۶] ترمذی و صحیح ابن حبان و طبرانی و ابو یعلی و بزار۔ (منذری ۲ صفحہ ۲۳۰)

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے، اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے، اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں، اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے، اسلام نے اس نظامِ عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے،

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا	اے ایمان والو! آپس میں ایک
اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ؕ	دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ
(نساء - ۵)	سے مت کھاؤ،

اس آیت نے اُن تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے، یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا دے

نریب سے لے یا زور وظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے، یا اس مین خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے ہم (مسلمانون) پر ہتھیار اٹھایا، اور جس نے ہم (مسلمانون) کو دھوکا دیا، وہ ہم (مسلمانون) سے نہین"[1] جان اور مال معاملات مین دو اہم چیزین ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر سے فقرہ نے دونون کی حفاظت کی اہمیت بتادی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا، آپ نے اُس مین ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے، آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیون نہین رکھا کہ لوگ دیکھ لین، جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہین[2] یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے،

ارشاد ہوا "جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملے گا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا"[3] ایک دفعہ ایک معاملہ مین ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپ نے فرمایا "اگر اس نے قسم کھائی تاکہ وہ ظلم سے مال لے تو خدا سے جب وہ ملیگا تو خدا اس سے منھ پھیر لے گا"[4]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا [3] و [4] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من اقتطع حق مسلم،

کسی کے مال وجائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو "غصب" کہتے ہین، غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السّلام کے قصہ مین ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھوؤن کی کشتیان زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا،

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ	وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبون کی تھی
يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ	جو دریا مین محنت کرتے تھے، تو مین
اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ	نے چاہا کہ اس مین کچھ عیب کر دون،
مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ	اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا
غَصْبًا ۝ (کہف - ۱۰)	جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا،

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی، کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی،

حضرت سعید بن زید صحابی روایت کرتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طوقہ اللہ فی سبع ارضین[۱]، تو اس کو زمین کے ساتون طبقون مین سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائیگا یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے مین زمین کے یہ ساتون طبق ہار کی طرح ڈالے جائین گے[۲]،

[۱] صحیح مسلم باب تحریم الظلم وغصب الارض، یہ عبادت کئی طرح سے ہے، فی سبع ارضین، من سبع ارضین الی سبع ارضین [۲] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور۔

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہین جو وکیلون کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلون کے زور سے غیرون کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہین، حالانکہ انھین اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "فریقین مین سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے، اور مین اس کے حق مین فیصلہ دیدیتا ہون، اگر مین نے اس کو کوئی ایسی چیز دلادی جو اس کی نہین تو وہ خود نہ لے کیونکہ مین نے اُس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے"۔

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہین جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہین، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لیجا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہین،

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	اور آپس مین ایک دوسرے کا مال
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى	ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ، اور نہ
الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ	پہنچاؤ حاکمون تک اس کا معاملہ
أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَ	تاکہ کھا جاؤ لوگون کا کچھ مال گناہ سے
أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ، (بقرہ-۲۳)	اور تم جان رہے ہو،

ـــــــــــــــ

لہ ابوداؤد کتاب الاقضیہ،

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعوی اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس مین پاکر اُن کا مال خلاف انصاف نہین کھانا چاہیے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ مین انگارے بھرتا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ	بے شک جو یتیمون کا مال ظلم سے کھا
الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ	جاتے ہین، وہ اپنے پیٹ مین آگ
فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ	کھاتے ہین، اور اب وہ آگ مین
سَعِیْرًا (نساء-۱)	پیٹھین گے،

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے، اسی لئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے، یعنی ہات کاٹ ڈالنا

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا	اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت
اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً ۢبِمَا كَسَبَا	ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو، سزا ان کی
نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ	کمائی کی، تنبیہ اللہ کی طرف سے اور
حَكِيْمٌ ۝ (مائدہ ۵-۶)	اللہ ہے زور آور حکمت والا،

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے، اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں،

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا، مرتکبِ فعل

کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے، پھر اس کے بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے، اور بے گناہ جانین بھی ضائع جاتی ہین، اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے، اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کردیتا ہے، اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے؛ بلکہ اس دولت کا بڑا حصّہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کرڈالتا ہے

اہلِ عرب مین شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والون سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی، سورۂ ممتحنہ مین ان چند باتون کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیون سے لیا جاتا تھا، ان مین سے ایک یہ بھی ہے کہ "وہ چوری نہ کرین گی"۔ فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خاتونین اسلام قبول کرنے آئین، تو آپ نے اُن سے بھی اس کا عہد لیا، اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہین وہ میرے اور میرے بچون کے لئے پورا خرچ نہین دیتے، مگر یہ کہ مین اُن کے مال سے کچھ چھپا کر لے لون، فرمایا "تم اُن کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمھارے اور تمھارے بچون کے لئے کافی ہو۔"[1] اس روایت سے دو باتین معلوم ہوئین، ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانون مین ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی، دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کرین اور وہ حسبِ ضرورت ہم سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب النفقات،

پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہین،

یہ عہد صرف عورتون ہی سے نہین بلکہ مسلمان مردون سے بھی آپ نے لیا ہی، حضرت عبادہ بن صامت رضی صحابی کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا "ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کروگے" پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے اور جو ان مین سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی، تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہوگیا، اور اگر کسی نے ان مین سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا، تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ مین ہے، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے[1]"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چور پر لعنت بھیجی، فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اُس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہی،

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لئے کرتا ہی کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہین رکھتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اُس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہی کہ جب بندے نہین دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہین دیکھتا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب چور چوری کرتا ہے تو اس مین ایمان نہین رہتا[2]"

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ "تم مین سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہی، مگر حق کے ساتھ" یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود [2] ایضاً [3] ایضاً،

کام کر کے معاوضہ مین حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت مین فرمائی گئی،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا	اے ایمان والو، تم آپس مین ایک
اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ	دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ	کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس
مِّنْكُمْ۔ (نساء-۵)	کی خوشی سے،

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس مین ہر اُس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو،

عرب مین قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگون سے چیزین عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگون نے اُس کی سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے قومین اس لئے تباہ ہوئین کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو اُن کو سزا دیتین، اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتین، خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو مین اس کا ہاتھ کاٹتا[1]،

ایک صحابی ایک چادر سرہانے رکھکر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑ کر آیا تو صحابی موصوف نے آکر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی، کیا تیس درہم کے لئے اُس کا ہاتھ کاٹا

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود،

جائے گا، مین نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی، اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپ نے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیون نہین کر لیا[۱]۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز مین مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت مین آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپنے فرمایا کہ مین نے دوزخ مین اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیون کا سامان چرا لیتا تھا، اور اگر مالک ہشیار ہو جاتا تو کہدیتا تھا کہ اتفاق سے اس مین پھنس کر چلا آیا، اور اگر وہ بے خبر ہوتا تو لے جاتا تھا، آپنے فرمایا مین نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ مین اپنی آنتین گھسیٹتا پھرتا تھا[۲]۔

---

[۱] ابوداؤد کتاب الحدود [۲] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف۔

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہی جس کو سرقہ کہتے ہین، اور جس کی پاداش مین چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہی، اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکسان کی ہی، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہی کہ اُس نے اُن نازک سے نازک ناجائز معاملون کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہین سمجھا جاتا تشریح کی اور ان کی برائیون کی تشہیر کی ہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیمون سے اُن کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہی،

اس سلسلہ مین سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے، جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس مین خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہین، اور جس سے سب سے زیادہ غریبون کو نقصان پہنچتا ہی، اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین مین سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے، یہی وہ میزان یعنی ترازو ہی جسے خدا نے دنیا مین قائم کیا ہی، اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہین دیتا یا دینے

میں کمی کرتا ہے وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے، فرمایا،

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ	اور آسمان کو اونچا کیا، اور ترازو
اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا	رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں،
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو
الْمِيْزَانَ ۝ (رحمان-۱)	تولو، اور مت گھٹاؤ تول،

اس ترازو سے انسان کا ہر قول وفعل تلتا ہے، اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے،

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے، اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور تاکید میں آئی ہیں، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لئے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمان داری کی تاکید بار بار کی گئی ہے، حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں،

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا	اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان
مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ، وَزِنُوْا	دینے والے اور تولو سیدھی ترازو
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝	سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ	ان کی چیزیں، اور مت پھرو ملک

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ (شعراء-۱۰) میں فساد پھیلاتے .

یہی حضرت شعیب مدین والوں کو سمجھا کرکہتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گذر میں آباد تھے،

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ	اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں
اِنِّیْ اَرٰکُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْ اَخَافُ	تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں،
عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۝	اور ایک گھیر لینے والے دن کی
وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ	آفت کو تم پر ڈرتا ہوں، اور اے
بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ	میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف
اَشْیَآءَ ھُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی	سے پورا کرو، اور لوگوں کی چیزیں
الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝	ان کو گھٹا کر مت دو، اور ملک میں
(ھود-۸)	فساد پھیلاتے مت پھرو،

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے، اور یہ بالآخر اُن کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی اُن کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے،

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہی نصیحت پھر سورۂ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اعراف-۱۱)

تو ناپ اور تول پوری کرو، اور مت گھٹادو لوگون کو اُن کی چیزین اور زمین مین اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لئے بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام مین جن چیزون کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ، (انعام-۱۹) اور ناپ اور تول کو پورا کرو،

سورۂ بنی اسرائیل مین جو اخلاقی نصیحتین فرمائی گئی ہین اُن مین سے ایک یہ ہے،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (اسرائیل-۴)

اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھردو، اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے، اور اس کا انجام اچھا ہے،

آیت کا آخری ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع مین کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخرکار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہوکر رہتی ہی،

خوب غور کرکے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگون کے دلون سے یہ یقین گم ہوجاتا ہے کہ اُن کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھین ہر وقت کھلی ہین اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا

کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورۂ مطففین میں جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا ہے۔ فرمایا،

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ	خرابی ہے اُن گھٹا کر دینے والوں
اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ	کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں
يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ	تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝	یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان
اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ	کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے
مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝	بھاری دن کے لئے ان کو اٹھایا
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ	جائے گا، جس دن سب لوگ
الْعٰلَمِيْنَ ۝	دنیا کے مالک کے لئے کھڑے
(مطففین - ۱)	ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیون مین ابھی تک مشترک ہو، اور وہ بانٹ کر علٰحدہ علٰحدہ نہ کیا گیا ہو اس مین سے کوئی چیز دوسرے ساجھیون سے چھپا کرلے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مال غنیمت مین جو بددیانتی اور چوری کی جائے اُس کو کہتے ہین۔ غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیون کا حصّہ ہی، جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصّہ الگ الگ نہ کردے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دیدے، اس مین سے کچھ چھپا کرلے لینا غلول ہے، اور یہ ایسی برائی ہے جس مین بددیانتی اور چوری دونون ملی ہوئی ہین۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز مین ہر ایک کا حصّہ ہے۔ تو اس مین سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہئے۔ لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہوجاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہین ہوا ہے، اس مین ہر ایک کا برابر برابر حصّہ ہے، اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لئے حلال نہین ہوسکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس مین سے کوئی چیز چھپا کرلیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے

کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہین، اسی لئے وہ دوسرون سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہی
تیسری بات یہ ہی کہ کسی چیز کو چھپا کرلے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہی،

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا، اور چونکہ انبیاء علیہم السّلام بھی امیر ہوتے ہین اور وہ گناہون سے مبرا ہوتے ہین، اس لئے اُن کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہین ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کرین گے۔ فرمایا،

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ،	اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہین کہ
(آل عمران - ۱۷)	وہ غنیمت مین سے چھپا کرلے لے،

پھر فرمایا،

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ	اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کریگا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ	تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لیکر
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا	آئیگا، پھر ہر کوئی اپنا کیا پورا پورا پائیگا
يُظْلَمُوْنَ، (آل عمران - ۱۷)	اور اُن پر ظلم نہین کیا جائے گا،

غزوہ خیبر کے مالِ غنیمت مین سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اُس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اُس کا

کام ہی تمام ہو گیا، مسلمانون نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہی، جس شملہ کو اس نے خیبر مین تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہی، لوگون نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہی آگ کا۔[۱]

خیبر مین ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ سے عرض کیا گیا، آپ نے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو، یہ سن کر لوگون کے چہرون کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا تمھارے بھائی نے مالِ غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے، صحابہؓ کہتے ہین کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیون کا ایک ہار نکلا جو چند آنون سے زیادہ کا نہ تھا،[۲]

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے، سب لوگ اپنا اپنا مالِ غنیمت لے کر آتے، پھر اس مین سے پانچوان حصہ نکالا جاتا، اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا، اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالون کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] و [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول،

یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا کیا تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟ اس نے کہا سنی تھی، پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے، اس نے معذرت کی، فرمایا تم اس کو قیامت میں لے کر آنا، میں نہیں قبول کرتا[1]۔

اعمال کو ہدایت کی گئی کہ اُن کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لاکر پیش کریں، فرمایا "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لیگا تو وہ غلول ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا[2]۔

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول [2] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کرلے[1]۔

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہلِ غرض اُن کو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے۔ اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑگیا۔ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی[2]۔

عرب میں یہودیوں کے مقدمے اُن کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے۔ اور چونکہ دولت اور تموّل نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کردئے تھے، اس لئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے۔ قانون کی زد سے بچنے کے لئے علانیہ رشوتیں دیتے تھے، اور اُن کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے، اور ایک کا حق دوسرے کو دلادیتے

---

[1] مجمع البحار علامہ فتنی [2] ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ مہر البغی۔

تھے، اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے[1]، چنانچہ توراۃ کے قوانین مین تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی؛ قرآنِ مجید کی اس آیت مین اُن کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہی،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ	خدا نے کتاب سے جو اُتارا اسکو جو
اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ	چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی
بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا، اُولٰٓئِکَ مَا	معاوضہ حاصل کرتے ہین وہ اپنے
یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا	پیٹون مین آگ بھرتے ہین، خدا
النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ	ان سے قیامت کے دن بات نہ
الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَ	کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کریگا،
لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (بقرہ-۲۱)	اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے؛

"پیٹ مین آگ بھرنا" اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ مین آکر خدا کے احکام مین ردوبدل اور منشاے الٰہی مین تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لئے یہی سزا اُن کو ملیگی، ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر مین نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لئے رشوتین دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف توراۃ مین ہین وہ عام لوگون کو نہ بتائین، لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ احکامِ الٰہی مین عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا

[1] صحیح بخاری رجم زانی،

کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے، فرمایا،

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (مائدہ-۹)

اور تو اُن میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی، اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، اُن کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں،

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ، (مائدہ-۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے،

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے،

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (بقرہ-۲۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ، اور تم جان رہے ہو،

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسرون نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت مین صاف وصریح ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونون پر لعنت فرمائی ہے[1]، رشوت دینے والے پر یون کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے، اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونون مین منع ہی؛

خیبر کے یہودیون سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبد اللہ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہدیتے تھے کہ ان دو مین سے جو چاہو لے لو، یہودیون نے اپنے دستور کے مطابق اُن کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس مین چندہ کرکے اپنی عورتون کے کچھ زیور اکھٹے کئے اور کہا کہ یہ قبول کرو، اور اس کے بدلہ تقسیم مین ہمارا حصہ بڑھا دو، یہ سُن کر حضرت ابن رواحہ نے فرمایا "اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق مین مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہین کر سکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہین کھاتے" یہودیون نے ان کی یہ تقریر سُن کر کہا کہ یہی وہ (انصاف) ہی جس سے آسمان وزمین قائم ہین[2]"

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی[3]، ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہی، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہی، یہ

[1] ابوداؤد کتاب الاقضیہ [2] موطا امام مالک کتاب المساقاۃ [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ کتاب الجہاد

یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔

عامل کا کیا حال ہو کہ ہم اس کو بھیجتے ہین تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہو، تو اپنے باپ یا مان کے گھر مین بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہین یا نہین، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے، وہ اس مین سے جو لے جائیگا وہ قیامت مین اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ، گائے، بکری جو ہو، پھر آپ نے اپنے دونون ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا: "خداوندا مین نے پہنچا دیا"[1]

اس تقریر مین آپنے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے،

---

[1] صحیح بخاری باب ہدایا العمال،

سودخواری

سودخواری، حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہی، حرص وطمع تو یون کہ سودخوار اس سود کے ذریعہ چاہتا ہی کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آجائے، بخل یون کہ وہ کسی غریب مقروض کیساتھ کوئی رعایت کرنا نہین چاہتا اور نہ کسی کار خیر مین دے کر اپنے سرمایہ مین کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہی کہ اللہ تعالیٰ نے سودخواری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ مین کیا ہے، اور ظلم یون کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگون کو ان کی محنتون کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہین کرتا، اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا،

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ - ۳۸)

نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے،

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اُس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خوری کی عادت بھی عرب مین یہودیون کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے

سودی قرض لیتے تھے، یہودیون پر نعمتون کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ مین ہے،

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا	اور اُن کے سود لینے کے سبب سے
عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ	حالانکہ وہ اس سے رُوکے گئے تھے
بِالْبَاطِلِ (نساء-۲۲)	اور لوگون کے مال کو ناروا طریق سے

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی ہمیشہ کے لئے دور کر دیا،

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا	جو سود کھاتے ہین وہ ایسے اٹھین گے
يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ	جیسے وہ اٹھتا ہو جس کے شیطان نے
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ	پٹ کر حواس کھو دیئے ہون، یہ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ	اس لئے کہ انھون نے کہا کہ خرید و
مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ	فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح
وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ	ہے، اور اللہ نے خرید و فروخت کے
مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى	معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے
فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى	تو جس کے پاس اس کے پروردگار
اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ	کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا، تو
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ	اس کا ہے جو پہلے دیا گیا، اور اس کا

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (بقرہ - ۳۸)

معاملہ خدا کے سپرد ہی، اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہین، وہ دوزخ مین رہین گے خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ وخیرات کو بڑھاتا ہی، اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پیار نہین کرتا،

قیامت مین سود خوار کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا مین سود خوارون کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسرون کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقون سے بڑھانے مین ایسے مشغول رہتے ہین کہ اُنھین کسی کار خیر کا خیال نہین آتا، تو قیامت مین بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھین گے، آیت کے آخر مین اللہ تعالیٰ نے سود خوارون کو ناشکر گنہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ خدا نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبون کو دیتے، مستحقون کو بانٹتے، مگر انھون نے اس کے بجائے غریبون کو اور لوٹا، اور ظلم سے اُن کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا، اور یہ نعمت کی ناشکری تھی،

یہودیون کی دیکھا دیکھی عربون مین بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے جیسے حضرت عباس بن عبد المطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان مین سے قرضدارون نے مقروضون سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتین اترین جو پہلی ہی آیتون کے سلسلہ مین ہین،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال کرو،

وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا
فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ
لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ
اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۝ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ
اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُوْنَ ۝

(بقرہ ۳۸۰)

اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو،
اگر تم واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ
کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی
کے لئے ہشیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز
آؤ تو تمہارے لئے تمہارا اصل سرمایہ
ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ کوئی تم
پر ظلم کرے، اور اگر وہ (مقروض)
تنگدست ہو تو اس کو کشادگی تک
مہلت دو، اور معاف کر دینا تمہارے
لئے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو،
اور اس دن سے ڈرو جس میں تم خدا
کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر کسی کو
وہ پورا پورا دیا جائیگا جو اس نے کمایا

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے، اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہو گا اس کا حساب ہو گا تو اگر تم نے نیکی کی ہو گی، اور مقروضوں کو معاف کیا ہو گا تو خدا کے یہاں پورا پورا مل جائے گا،

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے

کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کرسکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے، اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کردیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہان تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، خدا نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا	اے ایمان والو! (اصل سے) دوگن
الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً	چوگنا سود مت کھاؤ، اور خدا سے
وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ، اور
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ	اس آگ سے بچو جو منکرون کے لئے
لِلْكَافِرِينَ ۝ (آل عمران - ۱۴)	تیار کی گئی ہے

اس آیت مین تصریح ہے کہ سود خواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافرون کے لئے تیار کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک رویاے صادقہ مین سود خوارون کو جس حال مین دیکھا اس کی تصویر یہ ہے، فرمایا مین نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس مین ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ مین پتھر لئے کنارہ کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اُس کا منھ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ مین چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیل نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر مین تیر رہا ہے، سود خوار ہے،[۱]

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین و کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح ۱۲

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کرکے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہین، سودخوار آسانی سے اس پر قبضہ کرلیتا ہے تو وہ انسان کے خون مین تیرتا ہے، اور جو پتھر لقمہ تر بن کر اس کے منھ مین چلا جاتا ہے تو وہ وہ دولت ہی جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے،

گناہ کے شریک وہ بھی ہین جو کسی گناہ کی اعانت مین شریک ہون، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی،[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب البیوع،

شراب خواری

شراب خواری اُن عادات ذمیمہ مین سے ہی جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہی کہ دنیا کی اکثر قومین اس مین مبتلا نظر آتی ہین، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے اُن مین بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے، اور اس کا پینا اچھا نہین سمجھا گیا ہی[1] لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے، شراب عرب کی گھٹی[2] مین پڑی تھی، شراب پینا، پلانا اچھے اچھے گھرانون مین لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، بی بیان شوہرون[3] کو اور چھوٹے اپنے بزرگونکو اپنے ہاتھون سے پلاتے تھے اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگون نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت مین گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس مین لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلون مین آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ مین آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پھاڑ ڈالتے، اور یہ نہین دیکھتے کہ یہ کس کا ہے[4]، اور

---

[1] لوقا ۱-۱۵ [2] سبعہ معلقہ مین قصیدہ الاہبی بصحنک [3] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [4] سبعہ معلقہ مین طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری مین حضرت حمزہؓ کا قصہ ۔

ساتھیون کو اس کے کباب لگا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا، اور اس مین مویشیون کی بازی لگاتے، ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کئے جاتے، ان کو سب مل کر آپ کھاتے اور بچ رہتا تو غریبون کو بھی کھلاتے،

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہین، خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیئے جو بہت بڑی نعمت ہین، لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو، اور کھانے کے کام مین بھی لاتے ہو، فرمایا،

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ	اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے،
تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا	تم اُن سے نشہ بناتے ہو اور اچھی
حَسَنًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً	روزی، اس مین ان لوگون کے
لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔ (نحل - ۹)	لئے خدا کی نشانی ہے جو سمجھتے ہین،

اس آیت مین نشہ کو "رزقِ حسن" کے مقابلہ مین رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ "رزقِ حسن"[1] نہین، ان آیتون مین میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہین ہین[2]، اوپر دودھ اور گوبر اور خون، اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلایشون کے اندر سے کیسا پاک وصاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے، کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک، اور غذا جیسی پاک چیز دونون پیدا ہوتی ہین،

مدینہ مین آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا،

---

[1] تفسیر کبیر امام رازی [2] مفسرین کی مختلف رائین ہین۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)

تم جب نشہ مین ہو تو نماز کے قریب جاؤ یہان تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو

اس آیت نے ہشیارون کو چونکا دیا، کچھ لوگون نے بالکل چھوڑ دی، اور دوسرون نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگون کے دلون مین آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوے کے بارہ مین اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا،

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرۃ - ۲۷)

(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوے کے بارہ مین پوچھتے ہین، کہہ دے کہ ان دونون مین بڑا گناہ ہے اور لوگون کیلئے کچھ فائدہ کی چیزین بھی ہین اور ان کا گناہ انکے فائدہ سے بڑا ہی

فائدہ یہ ہے کہ لوگون کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہین، دوسرون کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیان اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہین، اس آیت نے بہت سے لوگون کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہین آیا تھا اس لئے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ	اے ایمان والو! شراب اور جوا اور
الْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ	چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ	کام ہین، شیطان کے، سو ان سے
فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ	بچتے رہو، شاید تمھارا بھلا ہو، شیطان
اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ	تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس
بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ	مین شراب اور جوے سے دشمنی
فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ	اور بیر ڈال دے، اور تم کو اللہ
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ	کی یاد سے اور نماز سے روک دے،
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (مائدہ-۱۲)	پھر اب تم باز آتے ہو،

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا، خداوندا! ہم باز آگئے[1]، اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیون مین خم الٹے جارہے تھے، اور شراب زمین پر بہائی جارہی تھی[2]۔ اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتادیے ہین، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس مین لڑتے جھگڑتے ہین، اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کامون سے غافل کردیتی ہے، ان تینون اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت مین شراب اور جوے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے

---

[1] ابوداؤد، اشربہ [2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ،

اکئی مطلب ہوسکتے ہین، ایک چیز تو کھلی ہوئی ہی یعنی شراب اور جوے کو چڑھاوے کے بتون اور بانٹ کے پانسون کے ساتھ ملاکر شیطان کے ناپاک اور برے کامون مین سے شمار کیا ہی اس لئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست مین کوئی شک ہی نہین، اسکے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ مین ہے کہ جب اُن کے گھونسے سے اتفاقاً ایک قبطی مرگیا تو فرمایا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (قصص-۲) "یہ ہوا شیطان کے کام سے" یعنی بہت ہی برا کام ہوا، اسی طرح اس آیت اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (بنی اسرائیل-۳) "بے شبہہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہین" کی روشنی مین ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوے، بتون کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانور کو بے کار ذبح کرکے پانسون سے اُن کی بانٹ مین جن کو عرب جاہلیت مین فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہی کون نہین جانتا، شراب خواری، قماربازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیون نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کردیا ہے جس کی نشانین زمانہ کے صفحون پر لکھی آج بھی ملتی ہین۔

اس کے بعد ان شیطانی کامونکی دو برائیان قرآن نے بتائی ہین، ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہوکر لوگ آپس مین لڑتے ہین، اور وہ کام کرگذرتے ہین جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے، کتنے قتل، کتنی خودکشیان

اور کتنے سخت حادثے اس کے بدولت روزانہ پیش آتے ہین، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے مین ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد، اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے، بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کامون سے بھی ایسا کھو یا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہین رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہین چھا جانے کو، اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھالے وہ خمر مین داخل ہے، حضرت عمرؓ نے منبر نبویؐ پر کھڑے ہو کر فرمایا "شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے[1]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے[2]" یہ فرمایا "جس نے دنیا مین شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی، وہ آخرت مین اس سے محروم رہیگا[3]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج مین تشریف لے گئے تو آپ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے، ایک مین دودھ تھا اور دوسرے مین شراب، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا، ناموس وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا "اس خدا کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی[4]"

گویا شراب مثال کی دنیا مین گمراہی کی تصویر ہی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [2] صحیحین کتاب الاشربہ [3] ایضاً [4] ایضاً،

حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے"[1] یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کی نشانیون مین سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا"[2]

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سترِ ذرائع کے طور پر حرام کئے، یہان تک کہ شروع شروع مین ان برتنون کے استعمال کو بھی حرام کیا، جن مین شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے، تو اس سختی کو اٹھا دیا،[3]

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۱) "گناہ اور تعدی مین ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو" کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا سب حرام ٹھہرایا گیا، فرمایا "خدا نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسرون کے لئے نچوڑنے والے، اپنے لئے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے، سب پر لعنت فرمائی ہے"[4] یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہر نشہ کی چیز حرام ہے، اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے"[5]

---

[1] صحیحین کتاب الاشربہ [2] ایضاً [3] ایضاً،
[4] ابوداؤد کتاب الاشربہ [5] صحیحین و ابوداؤد و ترمذی کتاب الاشربہ

غیظ و غضب

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ مین کر بیٹھتا ہے، اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لئے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانون کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہین وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (آل عمران-۱۴) اور دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ (شوریٰ-۴) "اور جب اُن کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہین"۔ انسان کا سکون کی کی حالت مین معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت مین جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہین ہے لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اُس وقت بھی اپنے کو قابو مین رکھے، اور معاف کر دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہین ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ مین اپنے کو قابو مین رکھے"۔[1]

---

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب و بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب۔

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہ بن قدامہ، حضرت ابو درداؓ وغیرہ
کئی صحابیون سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض
کی کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو، اُس کو یہ معمولی
بات معلوم ہوئی، تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی، آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ "غصہ نہ کیا
کرو"[1] مسند احمد مین ہے کہ اُن صاحب کا بیان ہے کہ پھر مین نے دل مین غور کیا تو
معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت مین ساری برائیون کی جڑ ہے،

مشہور صحابی حضرت ابو سعیدؓ خدری کہتے ہین کہ ایک دفعہ آپ نے عصر کی نماز کے بعد
صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتین فرمائین، جن مین سے ایک یہ تھی، فرمایا آدم کے بیٹے کئی طبقون
مین پیدا کئے گئے ہین، ان مین کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر مین آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا
ہے، اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونون مین ایک بات
کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے،
اور دفع بہت دیر مین ہوتا ہے، تو ہان! ان مین سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر مین
آئے اور دور جلد ہو جائے، اور ان مین سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور
بہت دیر مین ہوتا ہو، ہان! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہین
کہ اس کی آنکھین لال اور اس کی رگین پھول جاتی ہین، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو
اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے[2]"

[1] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب) [2] جامع ترمذی (منذری باب مذکور)

ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا غصہ شیطان سے ہے، اور شیطان آگ سے بنا ہے، اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیئے کہ وضو کرے[1] حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیئے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیئے کہ لیٹ جائے[2]،

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا، اور رگیں پھول گئیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کہے[3]،

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ	معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی کی
وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ وَاِمَّا	بات کہہ، اور نادانوں سے درگذر کر،
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ	اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھارے،
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ	تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہ سننے
عَلِيْمٌ، (اعراف-۲۴)	والا اور جاننے والا ہے،

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کظم غیظا [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب،

اسی قسم کی آیت سورۂ حٰم السجدہ (۵) مین بھی ہی، جس کا ترجمہ یہ ہی،

"نیکی اور بدی برابر نہین، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا، جیسے دوست رشتہ والا، اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے، اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ بیشک وہی سننے والا جاننے والا ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہین، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک مین ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہی، اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ خداوندا! مین شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہون (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا، اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہو گا کہ غصہ شیطانی حرکت ہی، تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا،

دو ظاہری علاجون مین سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہی کہ تبدیلِ ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہی کہ غصہ کی حالت مین گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھین لال ہو جاتی ہین، چہرہ سرخ ہو جاتا ہی، تو پانی پڑنے سے مزاج مین ٹھنڈک آئے گی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی،

بغض و کینہ

دل مین کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیر پا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہین، اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف فرمائی ہے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا	اے ہمارے پرورد گار، ہم کو اور ہمارے
الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ	بھائیون کو جو ہم سے آگے ایمان مین
وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا	پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلون
لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ	مین ایمان والون کا کینہ مت رکھ،
رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○	اے ہمارے پرورد گار تو نرمی
(حشر-۱)	والا مہربان ہے،

جنت کی خوبیون مین سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس مین جو لوگ ہون گے آپس مین بھائی بھائی ہون گے، وہان بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا، فرمایا،

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ○ (حجر-۴)

اور ہم نے ان کے سینون سے جو کینہ تھا نکال لیا، بھائی بھائی ہو کر تختون پر آمنے سامنے بیٹھے،

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ ج (اعراف-۵)

اور ہم نے ان کے سینون سے جو کینہ تھا نکال لیا، نہرین اُن کے نیچے بہتی ہون گی،

ان آیتون کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیون مین کینہ رہے گا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی مین جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہئے، فرمایا،

"اے لوگو! آپس مین ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس مین بھائی بھائی بن جاؤ کسی بھائی کے لئے حلال نہین کہ اپنے بھائی کو تین دنون سے زیادہ چھوڑ دے[1]"

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیون مین کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنون سے زیادہ کوئی اپنے دل مین نہ رکھے، ابو ایوبؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہین کہ اپنے بھائی کو تین دنون سے زیادہ چھوڑ دے، دونون ملین تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے، اور

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و مالک، ابو داؤد، ترمذی، نسائی

ان دونون مین بہتر وہ ہے جو سلام مین پہل کرے۔[1] ایک اور روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کسی مومن کے لئے جائز نہین کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے تین دن جب ہوجائین تو ان مین سے ہر ایک دوسرے سے اگر ملے، پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونون کو مزدوری ملی، اور اگر اس نے جواب نہین دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا۔[2] کئی حدیثون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہین، تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہین کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیون مین آپس مین کینہ ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونون کو ابھی رہنے دو میل کرلین۔[3] اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہین، تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے، اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والون کے اعمال اُن کے کینہ کے سبب لوٹا دیئے جاتے ہین، جب تک وہ اس سے باز نہ آئین۔[4] یہ بھی حدیث مین ہے کہ "آپ نے فرمایا تین شخصون کی بخشایش نہین، ان مین سے ایک وہ جو اپنے سے کینہ رکھتا ہو۔[5]

ان حدیثون پر غور کیجئے، شرک اور کینہ دونون کو ایک خاص پہلو سے برابر کا

---

[1] مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد [2] سنن ابی داؤد [3] مالک و مسلم، ابوداؤد ترمذی و ادب المفرد بخاری [4] طبرانی فی الاوسط (منذری ۲ صفحہ ۱۶۴ مصر) [5] ادب المفرد بخاری باب الشحناء،

درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزون سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندون کا حق، جب تک شرک رہے گا، اللہ کا کوئی حق ادا نہین ہو سکتا، اسی طرح جن دو آدمیون مین کینہ رہے گا اُن مین سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے، اور ان ہی دونون حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہی،

ظُلم

ظلم کا لفظ قرآنِ پاک مین کئی معنون مین آیا ہے، یہان تک کہ کفر و شرک اور عصیان کے معنون مین بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہان مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندون پر کرتے ہین، قرآن مین اس کے لئے دو اور لفظ بَغْی (سرکشی) اور عُدْوان (تعدی) آئے ہین، یہ ظلم اسلام کی شریعت مین حرام ہے،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ	کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ	کے کامون کو جو کھلے ہون یا چھپے
وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ	اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو
(اعراف - ۴)	حرام ٹھہرایا ہے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ	اور خدا بے حیائی، اور ناپسندیدہ
وَالْبَغْيِ، (نحل - ۱۳)	کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے،

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی، اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن وامان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ	اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں،
هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ، وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ	اور برائی کا عوض اسی طرح کی
سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا، (شوریٰ ۴)	برائی ہے،

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے،

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا، اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا،

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى	پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے،
اللّٰهِ، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ	تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے،
(شوریٰ ۴)	بیشک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا،

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی،

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ	اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے

فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ | بعد بدلے لے تو اس پر کوئی ملامت
(شوریٰ - ۴) | کی راہ نہین،

ملامت اُس پر ہے جو لوگون پر ظلم کرنے مین پہل کرے، اور ملک مین ناحق فساد برپا کرے،

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ | راہ اُن پر ہے جو لوگون پر ظلم کرتے ہین،
النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ | اور زمین مین ناحق دھوم مچاتے ہین،
بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ | ان کیلئے دُکھ والی سزا ہے،

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلبِ قصاص کی منصفانہ اجازت دیگئی،

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ | اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث
جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا | کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے
يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ | مین زیادتی نہ کرے، بے شبہہ اس
مَنْصُوْرًا ، (اسرائیل - ۴) | کو مدد دی جائے،

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کیجائے، تاکہ دنیا مین عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثون کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش مین حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزون اور دوستون کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگین، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام مین بھی کبھی ختم نہ ہوگا،

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیون کو علانیہ بیان

کرے اس کے دو فائدے ہین، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے مین کچھ ہچکچائین گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگون کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ	نہین آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ہ (نسآء-۲۱)	سنتا جانتا ہے،

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانون کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑین اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگون کرین،

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى	تو اگر اُن مین سے ایک دوسرے پر
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ	چڑھ آوے تو سب لڑو اس چڑھائی
حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ،	والے سے، یہان تک کہ وہ اللہ
(حجرات-۱)	کے حکم پر پھر آئے،

یہ تو مسلمانون کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے، اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانون کو اس کا ساتھ نہین دینا چاہیے، فرمایا،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ	اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ
صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس جرم
اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى	پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی

الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (مائدہ-۱)

کر بیٹھو، اور نیکی اور تقویٰ کے کامون پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک وہ سخت سزا والا ہے،

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا مین مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا موثر حربہ جس کا نام آجکل عدم تعاون اور نان کوآپریشن ہے، اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے، اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ، اور ظلم وتعدی کے کامون مین ظالمون کا ساتھ نہ دیا جائے، اور اُن کے ظلم کے کامون مین شریک نہ ہوا جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتین زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہین،

حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانون کو فرمایا کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے[۱]، اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالئے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلاکر سننے والون کے دلون مین توجہ کی خلش پیدا کردی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل وجان متوجہ ہوگئے، تو اس کمالِ التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے

[۱] صحیح بخاری ابواب المظالم وصحیح مسلم باب نصر الاخ ظالمًا او مظلومًا،

یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی، فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے میرے بندو! میں نے اپنے لئے اور تمھارے لئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو"[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا"[2] ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا۔ یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھاپن قیامت کے دن ہولناک دن میں اندھیراپن کر نمودار ہوگا،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے"[3] براءؓ بن عازب کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا، اور سات باتوں سے روکا ہے، اُن میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے[4]، حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ نے یمن بھیجا، تو ان کو نصیحت فرمائی کہ "مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا،

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۵۴ و صفحہ ۱۶۰ و صفحہ ۱۶۰ و ادب المفرد بخاری باب الظلم [2] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم [3] صحیح بخاری ابواب مظالم [4] ایضاً

کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ مین کوئی پردہ نہین[1]" حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ آج ہی اس سے پاک ہولے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیان دلوائی جائین گی، اور نیکیان نہ ہون گی تو مظلوم کی بدیان ظالم پر لاد دی جائین گی[2]" فرمایا کہ "ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہین[3]"

فرمایا اہلِ ایمان دوزخ سے پاک ہوچکین گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائین گے۔ وہان دنیا مین ایک نے دوسرے پر جو ظلم کئے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہوجائینگے تب اُن کو بہشت مین جانے کی اجازت ملے گی[4]"

---

[1] صحیح بخاری ابواب المظالم [2] ایضاً [3] صحیح مسلم باب تحریم الظلم [4] صحیح بخاری ابواب المظالم

فخر و غرور

انسان مین جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل مین اُس کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہین، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کرجاتا ہے کہ وہ اور لوگون کو جن مین یہ وصف نہین پایا جاتا، یا کم پایا جاتا ہے، اپنے کر حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہین، دنیا مین سب سے پہلے اس بد اخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ مین اپنے کو بالا تر سمجھا اور پکارا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (اعراف - ۲) مین اس سے بہتر ہون، وہ مٹی سے بنا ہے، اور مین آگ سے بنا ہون، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ٥ (اعراف ۲) یہان سے اُتر جا، یہان تجھے غرور کرنا زیبا نہین، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہان ذلت کی چھوٹائی ملی،

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہین، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگون کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف

مین ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مین ایک حسین شخص ہون، اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، مین یہ نہین پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن مین تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا نہین تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے، اور لوگون کو حقیر سمجھا جائے[۱]،

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیون کا سرچشمہ بنا دیا، پیغمبرون کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہین جو اپنے آپ کو اور لوگون سے بڑا سمجھتے ہین، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبرون کی ہدایت کو قبول کر لیتے

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ	اور (قیامت کے دن) سب لوگ
الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا	خدا کے روبرو نکل کھڑے ہون گے،
اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ	تو (جو لوگ دنیا مین) کمزور تھے
اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ	اس وقت) ان لوگون سے جو بڑی
عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ	عزت رکھتے تھے، کہین گے کہ ہم تو
(ابراهیم-۳)	تمھارے قدم بقدم چلنے والے تھے
	تو کیا (آج) تم عذاب خدا مین سے
	کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو،

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیان دے کر

---

[۱] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر

فرعون اور اس کے اعیانِ دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھون نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے،

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا	تو وہ سب شیخی مین آگئے، اور وہ تھے
عَالِيْنَ، (مومنون - ۳)	(بھی) سرکش لوگ،

اسی تکبر کی بناپر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانون کی طرح کھاتا پیتا اور بازارون مین چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہین کرتے تھے، اُن کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے مین عام لوگ شامل ہوگئے ہین، اس مین وہ بھی شامل ہوجائین.

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اس پر اُن کی قوم کے سردار جو (ات
مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا	کو) نہین مانتے تھے، لگے کہنے کہ ہم کو
بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ	تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے
اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا	ہو، اور ہمارے نزدیک صرف وہی
بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ	لوگ تمھارے پیرو ہوگئے ہین جو ہم مین
عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ	رذالے ہین، (اور پیرو ہو بھی گئے ہین
نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ،	تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے
(هود - ۳)	اور ہم تو تم لوگون مین اپنے سے کوئی
	برتری نہین پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہین.

غرض پیغمبرون کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگون کو انکار تھا

جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگون سے یا خود پیغمبرون سے بڑا سمجھتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید مین نہایت شدت سے ان لوگون کی برائی بیان کی ہے، اور مختلف الفاظ مین بیان کی ہے، تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیشِ نظر ہو جائین، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہین، بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ	لیکن جو لوگ منکر ہین (ناحق کی)
وَّشِقَاقٍ ۝ (ص - ۱)	بیکڑی اور مخالفت مین (پڑے) ہین،

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبّار اختیار کیا ہے،

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ	جتنے مغرور اور سرکش ہین اللہ ان
قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ، (مومن ۴)	کے دلون پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے،

دو موقعون پر اس کے لئے مُختَال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہین جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہین،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ	اللہ اس کو پیار نہین کرتا جو مغرور
مُخْتَالًا فَخُوْرًا ، (نسآء - ۶)	اور فخار ہو،
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ، (نحل ۳)	اللہ غرور کرنے والون کو پسند نہیں کرتا،

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی یہین دے دی گئی ہے،

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى	کیا جہنم مین مغرورون کا
لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ، (زمر - ۷)	ٹھکانا نہین،

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (زمر) تو وہ دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہی،

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہو کہ اُن کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے،

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر وغرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہین، ان کا کوئی شمار ہی نہین کیا جاسکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگون کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہین، بلکہ بہت سے لوگون کو اس قابل بھی نہین سمجھتا، کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگون سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کرین، راستے مین لوگون سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسون مین صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، الغرض اس کے ثمرات ونتائج ہزارون صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل مین رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا،[1] اور امام غزالی نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہو کہ مسلمانون کے جو مخصوص اخلاق ہین وہی جنت کا دروازہ ہین، اور غرور ان تمام دروازون کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل مین ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت مین داخل نہ ہوگا، یعنی دنیا کی طرح آخرت مین بھی مسلمانون سے الگ تھلگ رہیگا،

یہ بداخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگون مین پائی جاتی ہے، اور اس کے نتائج

[1] ابو داؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر،

گوناگون صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اس لئے اُن سب کا استقصا، تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیے ہین، مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امرا، و سلاطین سے تعلق رکھتے ہین، اُن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہین، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم مین بنا لینا چاہئے" ایک بار آپ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابۂ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ عجمیون کی طرح تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوا کرو[1]

بڑے آداب و القاب کا اپنے نامون کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلافِ واقعہ ہون تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہون تو فخر و غرور کا ذریعہ ہین، عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے برا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے[2]"

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتون کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مین کیا ہے، مثلاً

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا	اور زمین مین اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس
إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ	دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین
وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ؁	کو تو پھاڑ نہین سکیگا، اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑون کی لمبائی کو پہنچ سکیگا
(بنی اسرائیل - ۴)	
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ	اور لوگون سے بے رخی نہ کر اور زمین
وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا	مین اترا کر نہ چل، بیشک اللہ اس کو

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل
[2] صحیح بخاری

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ — پیار نہین کرتا جس کو گھمنڈ ہو،

فَخُوْرٍ ٥ (لقمان - ٢) — فخار ہو،

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے،

ثَانِیَ عِطْفِهٖ، (حج - ١) — اینٹھتا ہوا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ[1] — جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا

يَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ — خدا اسکی طرف قیامت کے دن نہ دیکھیگا

ایک حدیث مین ہے کہ گذشتہ لوگون مین ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس مین دھنسا چلا جا رہا ہے[2]، اس کے برعکس بہت سے افعال ہین جو تواضع وخاکساری پر دلالت کرتے ہین، اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ — اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے

يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا — تو وہ ہین جو زمین پر فروتنی کے ساتھ

وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ — چلین، اور جب جاہل ان سے (جہالت

قَالُوْا سَلٰمًا، — کی) باتین کرنے لگین تو (ان کو)

(فرقان - ٦) — سلام کرین (اور الگ ہو جائین)

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی اسبال الازار [2] ترمذی ابواب الزہد،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو زانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے، فرمایا "خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہی متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے[۱]"۔

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمل اوڑھتا ہوں، اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہی کہ "جو شخص یہ سب کام کرتا ہی اس میں غرور نہیں پایا جاتا[۲]"

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں، حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں،

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا،

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ	لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم)
ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا	اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا، اور (پھر)
وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ (حجرات-۲)	تمھاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں

[۱] ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب الاکل متکئا [۲] ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی الکبر،

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے،

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ — اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے،

(حجرات - ۲)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تشریح کی، اور فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے تمھارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت، تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منھ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے[1]،

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن و جمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتہ عمدہ ہو تو فرمایا کہ "خدا حسن کو پسند کرتا ہے"[2] یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال، غرور و تکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی کو آپ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں، جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے، اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا[3]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر [3] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار،

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا، اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی، مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی، اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں،

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا	(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی
لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ	کھیل اور تماشا اور ظاہری طمطراق
بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ	اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر
وَالْاَوْلَادِ ،	کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ
(حدید - ۳)	کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا ہی ہے

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا، اور پہن کر پھاڑ ڈالا[1]

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا ،

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیئے جا سکتے ہیں، اس لئے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابلِ ستائش وصف ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "قوی امین" کہا ہے اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ	(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو
اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ،	تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں
(ھود-۷)	کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوعِ انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ	اللہ (ہی) وہ (قادرِ مطلق) ہے جس نے
ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ	تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں
قُوَّۃً،	کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا پھر
	(طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی
(روم-۶)	کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامانِ جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے
مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ	اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے
تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ	جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں

وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ	کے (مقابلہ کے) لئے ساز و سامان
دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ	مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ
اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۔	کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی
(انفال ـ ۰)	دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان
	کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں
	جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث مین ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[1]، اگرچہ متعدد حدیثون مین ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہین، بلکہ تواضع وخاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابل ستائش وصف ہے، اسی بنا پر بعض حدیثون مین ضعف کا مقابلہ کبر وغرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

الا اخبرکم باھل الجنۃ	کیا مین تمکو بتاؤن کہ جنتی کون ہے؟
کل ضعیف متضعف الا	ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس
اخبرکم باھل النار کل	کو کمزور سمجھین، کیا مین تم کو بتاؤن

[1] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز۔

عتل، جواظ متکبر[1]، | کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص،

دوسری حدیث مین ہے،

احتجت النار والجنۃ فقالت | دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا،
ھذہ یدخلنی الجبارون | دوزخ نے کہا مجھ مین جبار اور متکبر
المتکبرون وقالت ھذہ | لوگ داخل ہوے، اور جنت نے
یدخلنی الضعفاء والمساکین[2] | کہا کہ مجھ مین کمزور اور مسکین لوگ؛

ان حدیثون سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مین ضعف بجاے خود قابل مدح و صفت نہین ہے، بلکہ اس کو صرف اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے،

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومین ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر و غرور کرتی ہین اور اس فخر و غرور کے نشہ مین دوسرون کو حقیر سمجھتی ہین، بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہین، زمانۂ سابق مین اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزین ہمیشہ قائم رہین گی اور قیامت کبھی نہ آے گی، اور اگر آئی بھی تو قیامت مین بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الکبر۔ [2] مسلم کتاب صفات المنافقین واحکامہم باب النار یدخلہا الجبارون۔

شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے،

اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّاَعَزُّ	مین تجھ سے زیادہ مالدار ہون اور
نَفَرًا۔ (کہف ۔ ۵)	(میرا) جتھا بھی بڑا زبردست (جتھا) ہے۔

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ مین کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لئے اس قدر کبر و غرور جائز نہین،

اَکَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَکَ مِنْ	کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ	جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے
سَوّٰکَ رَجُلًا۔ (کہف ۔ ۵)	سے پیدا کیا، پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا!

نتیجہ یہ ہوا کہ عذابِ الٰہی نے اس کی دولت کو ملیامیٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائدار چیز فخر و غرور کے قابل نہین، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور زندون سے گذر کر مردون کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر و غرور مین باہم مقابلہ ہوتا تھا، اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ "تکاثر" ایجاد ہو گیا تھا، جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ مین انسانون کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی،

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ	تم کو مال اور اولاد کی کثرت مین
الْمَقَابِرَ،	ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے

غافل بنا دیا ہے، یہان تک کہ تم

قبرون سے جا ملتے ہو،   (تکاثر-۱)

لیکن اسی کے ساتھ اسلام مین یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہین، بلکہ اجتماعی و تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابلِ فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر و غرور کے بجاے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جاے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے،

تزوّجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم[1]،

محبت کیش، اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرتِ تعداد مین تم پر دوسری قومون کے مقابل مین فخر کرون گا،

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قومون اور ملکون کی سیاست کا رُخ بدل دیا ہے، اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا،

---

[1] ابوداود کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار،

ریا

ریا، کے لغوی معنی دکھاوا اور نمایش کے ہین، انسانی اعمال کی اصل حقیقت اُنکی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لئے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثون مین ہے کہ انما الاعمال بالنیات عمل نیت سے ہے، اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، نمایش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہی کہ انسان اپنی اچھائی اور برائی کا اظہار کرکے لوگون مین اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کرکے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہین، اسی لئے قرآن نے ان دونون کو ایک ساتھ جگہ دی ہے، اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد مین مسلمانون کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور، اور اپنی قوت کی نمایش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا   اور ان (کافرون) جیسے نہ ہوجاؤ جو

مِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ۔ (انفال-۶) | شیخی کے اور لوگون کے دکھانے کے لئے اپنے گھرون سے نکل کھڑے ہوئے

یہ ریا اور نمایش انسان کے ہر اُس عمل مین ظاہر ہوتی ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال مین خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کرلیا جاتا ہے اسی لئے خدا فرماتا ہے،

اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوَاهُ ، (فرقان-۴) | کیا تونے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مین شرک سے بے نیاز ہون تو جو شخص میرے لئے کوئی ایسا عمل کرے جس مین کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہین، وہ اسی کے لئے ہے جس کو اس مین شریک کرلیا گیا ہے"

ایک صحابی روایت کرتے ہین کہ قیامت کے دن جب خدا اگلون اور پچھلون کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل مین جو خدا کے لئے کیا گیا ہے، کسی اور کو شریک کرلیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔

ایک حدیث مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے، لیکن مین یہ نہین کہتا کہ وہ چاند، سورج اور

بتون کی پرستش کرنے لگیگی، بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگون کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی[۱]

اسلام کے لغت مین کفر کے بعد برائی مین نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل مین کچھ ہو، اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عملِ خیر کی حقیقت ریا، اور نمائش کے سوا کچھ نہین رہ جاتی ہے، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدون کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجا لاتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال مین ریاکاری پائی جاتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید مین جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، (بقرہ-۳۶)	مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور سائل کو طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو، جو اپنا مال لوگون کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور روزِ آخرت کا یقین نہین رکھتا،

منافقون کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتین ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت مین شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہین ہوتا، دوسرے یہ کہ ان کے

---

[۱] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ،

ذریعہ سے لوگون پر اثر ڈالنا، اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے، پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہین، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع، للّٰہیت اور محویت و استغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے؛ عہد رسالت مین منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانون کی جماعت مین شامل رہین، اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش کی اُن کو مسلمان سمجھتے رہین، اسی لئے ایسے شخص کے عمل مین للّٰہیت اور خلوص نہین پیدا ہوسکتا؛

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ	منافق (مسلمانون کو دھوکا دے کر
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَ	گویا) خدا کو دھوکا دیتے ہین، حالانکہ
اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ	(حقیقت مین) خدا اُن ہی کو دھوکے
قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ	مین رکھے ہے؛ اور یہ لوگ) جب
النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ	نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہین تو
اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا.	الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہین
(نساء-۲۱)	(ظاہرداری کر کے) لوگون کو دکھاتے
	ہین، اور (دل سے) اللہ کو یاد
	نہین کرتے، مگر کچھ یون ہی سا،

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ	تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی)
عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ	تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے
الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ	غفلت کرتے ہیں، اور وہ جو (کوئی
(ماعون)	نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ نکلے اور فرمایا "کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے"؟ صحابہ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرکِ خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے، اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔[1]

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل و صورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی، اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائلِ اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور لوگ محض نام و نمود کے لئے

[1] ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ،

اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بد اخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لئے قرآن و حدیث مین باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس مین ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا	لوگو! اگر خیرات ظاہر مین دو تو وہ بھی
هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا	اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسرون
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ،	کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو
	چھپاؤ اور حاجتمندون کو دو تو یہ تمھارے
(بقرہ - ۳۷)	حق مین زیادہ بہتر ہے (کہ اس مین نام [illegible]

ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیون کو اپنے سایہ مین لے گا، جن مین ایک شخص وہ ہوگا، جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائین ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا[1]،

عرب کے محاسنِ اخلاق مین سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی، اور اسلام نے جہاد کو فرض کرکے مسلمانون کے لئے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے، اس لئے وہ ریاکاری کی نمایش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین،

سے پاک کر کے مسلمانون کو اس کی اصلی حقیقت بتائی، چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے، ایک شخص شہرت کیلئے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے تو ان مین کس کا جہاد خدا کی راہ مین ہے فرمایا،

"اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو"

آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد خدا کی راہ مین ہے، وہی پہلا جواب ملا۔[۱]

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس لئے اس مین ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی اس کے نتائج بد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مؤثر طریقہ سے بتائے، ایک حدیث مین ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا، جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہیگا کہ مین تیری راہ مین لڑا اور شہید ہوا۔ خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو تم صرف اس لئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے۔ اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم مین ڈال دیا جائیگا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگون کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائیگا، اور وہ جواب مین کہیگا کہ مین نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے

---

[۱] مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ

قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم مین ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولتمند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہیگا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے مین نے سب مین اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہین، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم مین ڈال دیا جائے گا،[1]

[1] مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل للریا، والسمعۃ استحق بالنار۔

خودبینی اور خودنمائی

خودبینی، خودنمائی اور خودرائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس مین اور کبر مین یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسرون سے بڑا سمجھتا ہے، لیکن خودبینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہان تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصافِ کمالیہ پر غلط ناز کرسکتا ہے

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیان نظر آتی ہین وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے، اور یہ تمام کمالات اور خوبیان اس کو ایسی معلوم ہوتی ہین گویا وہ خود اس کی اختیاری ہین، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہین، اسی کا نام عُجب اور خودبینی ہے، اسی سے نفس مین خودنمائی اور خودرائی پیدا ہوتی ہے، اور اکثر حالتون مین وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے،

حُنین کی لڑائی مین مسلمانون کی تعداد کافرون سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانون مین عُجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کرسکتا ہے، خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانون کا یہ عُجب دور ہوا، تب نصرتِ الٰہی

نے ان کے پاؤن تھام لئے، اور شکست فتح سے بدل گئی، خدا نے فرمایا،

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ	اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا،	تعداد نے تم مین خود بینی پیدا کر دی،
(توبہ - ۴)	تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا،

اسی لئے مسلمانون کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلین تو اُن مین جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمایش نہ پیدا ہو، بلکہ اُن مین سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا	اور ان لوگون کی طرح نہ ہو جو اپنے
مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ	گھرون سے اتراتے اور لوگون کو
النَّاسِ (انفال - ۶)	دکھاتے نکلے،

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمایش کو نکلے تھے،

جب کسی قوم مین تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد مین خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندون کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ مین رہتا ہے، اور یہی اُن کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا،

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ	اور کتنی بستیان ہم نے برباد کر دین جب
بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا (قصص ۶)	وہ اپنے گذران مین اترا چلین،

یہ تو چند بستیون کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی، اور اسی پر ناز کرے گا، اور اترائے گا، اور یہی وہ موقع ہے جس مین ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔

مذہبی حیثیت سے جن لوگون کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے،

فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ	تو (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو،
بِمَنِ اتَّقَى۔ (نجم-۲)	پرہیزگارون کو وہی خوب جانتا ہے،

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ مین عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے،

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى	اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہین
نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ۔ (مائدہ-۳)	کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے چہیتے ہین
قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا	(اے پیغمبر ان یہودیون سے) کہو کہ
إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ	اے یہودا اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ

لہ ابو داؤد کتاب الملاحم،

لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ، ہے کہ اور تمام آدمیون کو چھوڑ کر تم ہی

(جمعہ - ۱) خدا کے چہیتے ہو،

ان تمام آیتون پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ عُجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے، اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی مین چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت مین چاک ہوگا،

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہی، حدیث مین ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "تم نے اس کو ہلاک کر دیا" ایک بار آپ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپ نے فرمایا کہ "تم نے اس کی گردن کاٹ لی، اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ مین اس کو ایسا سمجھتا ہون[1]" مدح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہو کہ اس سے ممدوح مین عُجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہی،

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتون کے ذکر مین بندون کے سامنے اس پہلو کو نمایان کیا ہے، فرمایا،

لَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ (حدید - ۳) خدا نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہین،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مایکرہ من التمادح،

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب مین آیا، اور عربون کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لیے تمام مذہبون مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد مین رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اور اس بےموقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہین پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمایش کے پردہ مین ظاہر ہوتی ہے، اور ان بداخلاقیون کی برائی چھپی نہین،

اہل عرب جب جلسون مین شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا مین جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ مین اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بےوجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری مین اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہین، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہانتک کہ

دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا[1]،

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی، اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی، اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ	اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر
الْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَ	(ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو
لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا، اِنَّ	اور (دولت کو) بیجا مت اڑاؤ،
الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ	(کیونکہ دولت کے) بیجا اڑانے والے
الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ	شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان
لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (اسرائیل ۳)	اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے،

آیت کے آخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے، امام رازی

[1] ابوداؤد ج ۲،

اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں،

"بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہلِ عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کیلئے صرف کرتے تھے"! آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبون مین اس قسم کی فضول خرچیون کے مرتکب ہوتے ہین، وہ قرآن کی اصطلاح مین شیطان کے بھائی کہلائین گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہین ہے، کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے، اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہیدست ہو کر کسی کام کے نہین رہو گے، بلکہ الٹے تمھین کو لوگ قابلِ ملامت ٹھہرائین گے،

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً	اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑ و کہ (گویا)
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا	گردن مین بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا	پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے) تو تم اپنے بیٹھے
مَّحْسُوْرًا،	رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی
(بنی اسرائیل - ۳)	کرینگے (اور) تم تہی دست بھی ہو گے.

چونکہ یہ اعتدال کا وصفِ خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانون کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا	اور خرچ کرنے لگین تو فضول خرچی
وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ	نہ کرین اور نہ بہت تنگی کرین بلکہ

قَوَامًا — اُن کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان

(الفرقان - ٦) — بیچ کا ہو،

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے، اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے مین ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہین کرنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف مین خدا فرماتا ہے،

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا — اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ، — کرو، بیشک اللہ فضول خرچی کرنے

(اعراف - ٣) — والون کو پیار نہین کرتا،

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہین، مگر اس مین بھی بعض مفسرون کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہین،

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ — درخت کے پھل سے جب وہ پھلے

اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا — تم کھاؤ، اور اس کا حق ادا کرو جب

تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ — فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو

الْمُسْرِفِيْنَ، (انعام - ١٧) — اللہ حد سے آگے بڑھنے والون کو پسند

نہین کرتا،

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزون کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل مین ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہین اور یہ کوئی بداخلاقی نہین، بلکہ دینی امور مین پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزون کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتین اس سے چھین لی جائین، تو اسی کا نام حسد ہے، اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت مین خدا تعالیٰ نے مسلمانون پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانون کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے،

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى	یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگون
مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ،	کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے،
(النسآء - ۸)	اس پر جلے مرتے ہین.

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانون سے چھین لی جائے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم، (بقرہ-۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہین کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دین،

حسد کی تین قسمین اور درجے ہین،

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اُس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے، اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائین

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً، (نساء-۱۲)

ان منافقون کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہین اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ،

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت مین اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو مل نہین سکتی، اس لئے بالعرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لیجائے

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کرلی جائے،

ان مین پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت مین چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہین ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنون مین حسد تو نہین کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید مین ہی،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ	اور خدا نے جو تم مین سے ایک کو
بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ،	دوسرے پر برتری دے رکھی ہے،
(النسآء - ۵)	اس کا کچھ ارمان نہ کرو،

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہین ہی، اس لئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہین، اسی لئے فرمایا،

وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (نسآء - ۵)	اور خدا سے اس کا فضل مانگو،

تیسری صورت بالکل مذموم نہین بلکہ دینی امور مین مستحسن ہے، اور شریعت مین اسی کو مسابقت کہتے ہین،

حسد کے سات اسباب ہین،

(۱) بغض و عداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونون یکسان ہون، اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہی کہ اس کے

دشمن پر مصیبت آئے، اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا، اور اسی کا نام حسد ہے؛ کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی۔

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ	چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی
	تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی
وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ	ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے
اَکْبَرُ،	دلوں میں (بھرے) ہیں وہ (اس
(آل عمران - ۱۲)	سے بھی) بڑھ کر ہیں،
اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ	(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے
وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا	تو اُن کو برا لگتا ہے، اور اگر تم کو کوئی
بِھَا۔ (آل عمران - ۱۲)	گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں،

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے،

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گران گذرتا ہے، اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب

اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے، اس لئے جب وہ کسی شرف وامتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے، تاکہ وہ اس کا مطیع ومنقاد ہو سکے کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے،

أَهٰؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ
مِّنْ بَيْنِنَا،	نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر)
(انعام - ۶)	اپنا فضل کیا ہے،

حسد کا یہ سبب اکابر واشراف سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے لئے کبر وغرور اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل لازمی ہو،

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار میں جن کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو ان کو تعجب ہوتا ہے، اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے،

أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا.	کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر)
(بنو اسرائیل - ۱۱)	بھیجا ہے.

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے،

تو دونون باہم ایک دوسرے کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے ہین اوران مین جب ایک کواس مقصدمین کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، تو دوسرا قدرتی طور پراس کا بدخواہ ہوجاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویون اور ایک باپ کے متعدد بیٹون مین جو رشک وحسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السّلام کے بھائیون نے اُن کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا،

اِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَاَخُوهُ	جب یوسف کے (بے مات) بھائیون نے
اَحَبُّ اِلَى اَبِيْنَا مِنَّا وَ	(یہ) بیمین) کہاکہ باوجودیکہ ہم (حقیقی)
نَحْنُ عُصْبَةٌ،	بھائیوں کی بڑی جماعت ہیں، تاہم یوسف
	اور اسکا (حقیقی) بھائی (ابن یامین) ہمارے
(یوسف - ۲)	والد کوہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہین

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہین جب اُن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس مین ان کا شریک وسہیم ہوگیا ہے تو یہ ان کو سخت گران گذرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف وامتیاز سے دوسرا شخص جاہ ومنزلت مین ان کا شریک ہوگیا ہے وہ اس سے چھن جائے،

مسلمانون کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے اُن کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق

جاتا رہا، اس لئے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے، منافقین مین عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع مین وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔[1]

(۷) حسد کا ساتوان سبب خبث نفس اور بدطینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت مین دیکھتے ہین تو ان کو ناگوار ہوتا ہے، اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت مین حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہین،

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر اُن لوگون سے تعلق رکھتے ہین، جن مین کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لئے بیگانون مین یہ جذبہ پیدا نہین ہوتا، بلکہ صرف ان لوگون مین پیدا ہوتا ہے، جن مین باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے،

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہے کہ ان مین ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کسی تاجر پر حسد نہین ہوتا، کیونکہ ان مین کوئی چیز مابہ الاشتراک نہین،

اسلام نے مسلمانون مین باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین و المشرکین

اشتراک پیدا کردیا تھا، اس لئے اُن مین حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہوسکتا تھا، اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہین وہ سب کے سب اس وسیع برادری مین جمع ہوسکتے تھے، اس لیے اصولاً جو بداخلاقیان اس اخوت کا شیرازہ برہم کرسکتی تھین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سب سے مسلمانون کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

ایاکم والظن فان الظن اکذب	بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے
الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا	زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگون کے
تحاسدوا ولا تدابروا ولا	عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو
تباغضوا وکونوا عباد اللہ	نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو
اخوانا۔ (بخاری کتاب الادب باب	نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے خدا کے
ماینھی عن التحاسد والتدابر)	بندو بھائی بھائی ہوجاؤ،

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح مین قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے،

المعنی کونوا کاخوان النسب	اس کے معنی یہ ہین کہ رحم و شفقت،
فی الشفقة والرحمة والمحبة	غمخواری، محبت، اعانت اور خیرخواہی
والمواساة والمعاونة والنصیحة	مین نسبی بھائیون کی طرح ہوجاؤ،

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہو جب ان تمام بداخلاقیون سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہوجائے گی، اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسن اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہین، یا اُن سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، فنا ہوجائین گے،

چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں،

کانہ قال اذا ترکتم ھذہ	گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ
المنھیات کنتم اخوانا	جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دوگے
ومفھومہ اذا لم تترکوھا	تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا
تصیروا اعداء ومعنی	مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑ دگے
کونوا اخوانا اکتسبوا	تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی
ما تصیرون بہ اخوانا	بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں
مما سبق ذکرہ وغیر	حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی
ذلک من الامور	بن جاؤ، اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں
المقتضیۃ لذلک نفیا	جن کا ذکر اوپر گذرا اور اُنکے علاوہ اور
واثباتا، (فتح الباری	بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو
جلد دھم ص۳۸۴)	نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے مشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا، کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو، اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو، اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ[۱]، لیکن

[۱] مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۸۴

اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسنِ اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا، اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا۔

ایاکم والحسد فان الحسد	تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں
یاکل الحسنات کما تاکل	کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح
النار الحطب[1]،	آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے،

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ	اور برا چاہنے والے کی بدی سے
(فلق)	جب وہ حسد کرے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحسد۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمین ہین، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے، اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہین، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتین قائم ہوتی ہین تو عورتون کے حسن وجمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ مین اس قسم کے حالات وواقعات بیان کئے جاتے ہین جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہین،

عربی زبان مین اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہین، اور قرآن مجید کی اس آیت مین

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (بقرہ-۲۵)

حج کے دنون مین نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی

اسی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ مین مردون اور عورتون کا عام اجتماع ہوتا ہے، اور اس سفر مین پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جا سکتے ہین، حالانکہ یہ زمانہ صرف ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہین، بلکہ اسلام مین عام طور

اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد مین ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتون اور مردون کے ایک[1] مجمع مین خطبہ دیا، اور حمد وثنا کے بعد مردون کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تم مین کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردہ مین چھپ جاتا ہے؟" لوگون نے کہا "ہان" پھر فرمایا کہ "اس کے بعد لوگون کی صحبتون مین بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ مین نے یہ کیا، مین نے یہ کیا" اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتون کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟" اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ "ہان مرد اور عورت دونون اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہین" فرمایا "تم لوگ جانتے ہو کہ اسکی کیا مثال ہے؟ اسکی مثال اُس چڑیل کی ہے جو گلی مین ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے"[2]۔

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونون کی بے شرمی کی صورت یکسان ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال مین برقرار رہے، ورنہ جب باتین زبانون پر آئین گی تو وہ اپنی اہمیت کھو دین گی، اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کر دے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتون کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتین پیش آتی ہین تو مجاز و استعارہ کی زبان مین ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو، اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید مین اس قسم

---

[1] دونون کی نشستین الگ تھین اس۔ [2] ابو داؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابۃ اہلہ۔

کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ مین بیان کئے گئے ہین مثلاً

وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ (نساء - ۳) — حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میان بی بی ہم صحبت ہو چکے)

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (نساء - ۷) — یا تم نے عورتون کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے، اسی لئے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہین، جو فقہی مسائل کی تشریح مین مجبوراً آتے ہین، گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہین، لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہین، اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ، پیشاب، اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض . . . . کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہیے، پائخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث مین "قضاے حاجت" کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید مین اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت مین نشیب زمین کو کہتے ہین،

اَوْجَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ (نساء - ۷) — یا تم مین سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہین، اس لئے

استعارۃً اس سے پائخانہ مراد لیا گیا،

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہی جس کی اصل پائین خانہ ہے، چونکہ پائخانے عموماً مکانون کے کنارے بنائے جاتے ہین، اس لئے استعارۃً اُن کو پائین خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہوگیا، اور اب کثرت استعمال سے اس مین استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید مین خداوند تعالیٰ نے برص کی تعبیر "سوء" کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہین،

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ	اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل مین رکھو
تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ	(اور پھر نکالو) تو وہ بدون اس کے کہ
آيَةً أُخْرَى ،	کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق)
(طٰہٰ-۱)	نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ (ہی)

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوج ہے اور یہ صورت عموماً جنگ وجدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانۂ حج مین چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے، اور اس حالت مین لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے ایک عام لفظ "فسق" سے اس کی ممانعت کی،

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا	حج کے دنون مین نہ شہوت کی کوئی
جِدَالَ فِي الْحَجِّ . (بقرہ-۲۵)	بات کرنی چاہیے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی

گالی گلوج کی مختلف صورتین ہین بعض اوقات انسان ایک شخص کے مان باپ

کو برا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب مین عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہی، یہان تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام مین مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتون مین اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہو یا اس کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہی،

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتون کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہی

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ	نہین مگر جس پر ظلم ہوا ہو، وہ ظلم
(نساء-۲۱)	کو برملا بیان کرسکتا ہی)

اور قرآن و حدیث مین جا بجا بد زبانی سے بچنے کے حِکَم و مصالح نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہین.

(۱) ایک مصلحت یہ ہی کہ گالی گلوج مین لوگ عموماً تعدّی کرتے ہین، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہی تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہی تو دوسرا اس کے باپ مان دونون کو اس مین شامل کر لیتا ہے، اس لئے دوسرے کی تعدّی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، خداوند تعالی نے قرآن مجید کی اس آیت مین یہی نکتہ بیان کیا ہے.

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ	(اور مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن
مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ	معبودون کو یہ پکارتے ہین اُن کو

عَنْ دًا بِغَيْرِ عِلْمٍ . برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھکر خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔ (انعام - ۱۳)

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہیگا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہیگا۔[1]

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے"، لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا عائشہؓ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔[2]

(۳) بدزبانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے[3]، امام بخاری نے ادب المفرد میں

[3] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب و اللعن ۱۲۰

[1] بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ [2] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں،

(۴) رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے، ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے "السام علیکم" (تم کو موت آئے) کہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہا "علیکم و لعنکم اللہ و غضب اللہ علیکم" یعنی تم کو موت آئے، خدا تم پر لعنت بھیجے، اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔[1]

(۵) گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے، اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔ اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا، ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے، اور حیا جس چیز میں ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے"[2] اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے،

(۶) گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی الفحش

جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں[1]، مُردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے[2]،

(۷) گالی گلوج لڑائی کا پیش خیمہ ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سباب المسلم فسوق و	مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور
قتاله كفر[3]،	اس کے ساتھ لڑنا کفر،

ان تمام مراتب کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ليس المومن بالطعان ولا	جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا،
اللعان ولا الفاحش ولا البذی[4]	لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا،

[1] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام و ای اموره افضل [2] ترمذی ابواب البر و الصلہ باب ما جاء فی الشتم [3] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن [4] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی اللعنۃ

ایک اور حدیث مین بد زبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔[1]

یہ تمام وجوہ تو انسانون کی باہمی گالی گلوج اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہین، لیکن اس قسم کی بدزبانیان صرف انسانون تک محدود نہین ہین، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزون سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہین، مثلاً جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہین سوچتا کہ اس مین زمانہ کا کیا قصور ہے یہ جو کچھ ہوا ہے مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزون کے برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے، اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے کہ "خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ مین خود زمانہ ہون اور رات دن میرے ہاتھ مین ہین۔"[2] یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود خدا کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے۔[3]

ایک سفر مین ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا،[4] اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

---

[1] بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق [2] بخاری کتاب الادب باب لاتسبوا الدہر [3] ابو داؤد کتاب الادب باب فی اللعن [4] ابو داؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ۔

اسلام مین گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہین کہ کسی کو مغلظات سنائے جائین بلکہ ہروہ بات جس سے کسی کی توہین یا دلآزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام مین گالی نہین ہے، لیکن اسلام مین وہ ایک سخت گالی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق وکافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی۔[1]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح وتشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا۔[2] بہرحال اسلام نے جان ومال کی طرح ہر مسلمان کی عزت وآبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر مین (یعنی حجۃ الوداع مین) ایک خطبہ مین مسلمانون کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمھارے خون تمھارے مال، اور تمھاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمھارا یہ دن، تمھارے اس مہینہ اور تمھارے اس شہر مین محترم ہے۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن، ومسلم کتاب الایمان [2] فتح الباری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن،

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحون مین جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے، اُن کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیون اور بری عادتون کو گنایا جاسکتا ہو، جن کی ممانعت اسلام مین کی گئی ہو، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورۂ بالا رذائل مین سے کسی کے تحت مین ہین، اس لئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہین کی گئی ہے، اور چونکہ ان رذائل کے اخذ ورد مین خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہین کی گئی ہی اس لئے صرف اُن ہی کے بیان پر قناعت نہین کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنفون نے رذائل مین شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھکر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہو کہ اسلام نے تین اساسی برائیان قرار دی ہین، اور جس قدر رذائل ہین ان مین اُن ہی تین مین سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہو، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان مین یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغلخوری، دورخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخین ہین، دوسری اساسی برائی حبِ مال ہو، حبِ مال سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہو،

بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں، تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہی، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کرے گا، یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہش ہیں، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔	(نازعات ۲)	اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا، تو جنت اس کی آرام گاہ ہے،

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزء ہیں۔ آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگون میں امتیاز ہوتا ہے، ان کے آداب میں خوبی اور لطافت ملحوظ رکھنا حسنِ ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے،

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کامون کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیون کو آرام مل سکے، اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہوجائے۔ اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے۔ پیغمبر اسلام علیہ السّلام نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کردیا ہے،

دنیا کی دوسری قومین مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی ایٹی کیٹ

کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہین، عیسائی قومون نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام مین جو مذہب کا سرچشمہ ہی وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہی، اسی لئے اسلام وحشی سے وحشی قومون مین صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہی، اور ان کو چند روز مین مہذب اور شایستہ بنا دیتا ہی، ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارمِ اخلاق سے الگ کر دیا ہی، اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس کتاب الاستیذان، کتاب الآداب، اور کتاب السلام مین درج کیا ہی، ہم صحاح و سنن کی عام کتابون اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل مین لکھتے ہین،

فطری آداب

اسلام دینِ فطرت ہے، اس لئے اُس کے آداب کا بڑا حصّہ بھی فطری ہے، یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیاء علیہم السّلام نے اُن کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ان سب چیزوں کی اصلاح شایستہ اور ناشایستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا[1]۔ ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے،

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی سترِ عورت، اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور اُن کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ توراۃ کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے[2]،

---

[1] ترمذی ابواب النکاح [2] توراۃ پیدائش۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں، اُن کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی، جب کہ اس کو تہذیب ووقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت ونظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے، جن کو خصائلِ فطرت کہتے ہیں۔ امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں، اور ناخن کٹائے[1]، ایک حدیث[2] ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خصائل فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرنا، موئے زیرناف اور بغل کے بال صاف کرنا، اور ناخن اور مونچھ ترشوانا، ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال بنوانا، موئے زیرناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلی کرنی ہوگی،[3]

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں، چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب، اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا، واجب قرار دیا گیا ہے،

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں، جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں، وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے صرف دوسروں کو کراہت معلوم ہوتی ہے، بلکہ خود اُن کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی

[1] توراۃ پیدائش [2] باب الختان الکبیر [3] صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ [4] ایضاً،

مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلافِ فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں،

مونچھوں کا بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر ڈاڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو ڈاڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اُس شعار کے مخالف ہیں جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امت کے لئے مقرر کیا تھا،

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ، اور ڈاڑھی بڑھاؤ،[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ، اور داڑھی بڑھاؤ،[2] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرتمند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی،

---

[1] صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ [2] ایضاً،

طہارت اور اسکے آداب

تہذیب وشائستگی کی باتون مین سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے، گو کہ اسلام ایک ایسے ملک مین ظاہر ہوا جہان پانی نسبتہً بہت کم تھا، پھر بھی اس نے بعض خاص حالات مین غسل کرنا فرض قرار دیا، زن وشو کی ہمبستری کے بعد جب تک دونون غسل نہ کرلین نماز جو فرض ہے ادا نہین ہوسکتی، فرمایا،

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا، (مائدہ ۲۔) اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو،

کپڑے شرعی طور سے پاک ہون، فرمایا،

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، (مدثر ۱) اور اپنے کپڑے کو پاک کر،

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے، یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے،

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا، (مائدہ ۲۔) تو پاک مٹی کا قصد کرو،

جب نماز پڑھنا چاہین تو پہلے ہاتھ، منھ اور پاؤن دھولین، اور بھیگے ہاتھون کو

سر پر پھیر لین، اس کا نام وضو ہے،

اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا	جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منھ اور
وُجُوْھَکُمْ وَ اَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ	کہنیون تک اپنے ہاتھ دھو لو، اور
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ	اپنے سرون کا مسح کرو، اور اپنے
اِلَی الْکَعْبَیْنِ، (مائدہ-۲)	پاؤن دھوؤ،

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت مین شریک ہون، تاکہ کسی کی گندگی اور بدبوئی سے دوسرے نمازیون کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو، قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا،

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے، بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے، فرمایا،

وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ،	اور (اللہ) طہارت کرنے والون
(بقرہ-۲۸)	کو پیار کرتا ہی،

اسی طہارت کی پابندی، اور دلون مین طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے، مثلاً

ا۔ آپ نے فرمایا "جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن مین ہاتھ نہین ڈالنا چاہئے، کیونکہ سونے مین معلوم نہین کہ اس کا ہاتھ

کہاں کہاں پڑا ہے [۱] اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہئے، سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا [۲]

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک کر دے، اس لئے خیال رکھنا چاہئے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں، جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو،

۲۔ دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنّت ٹھہرایا، فرمایا، اگر میری امّت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا [۳]، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے، تو فرمایا تمھارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں، مسواک کیا کرو، (مسند احمد جلد ا ص ۲۱۴)

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہئے [۴]، یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو،

۴۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں، ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہئے، بلکہ مجنب کو چاہئے کہ اس سے پانی لے کر

---

[۱] مسلم کتاب الطہارۃ [۲] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [۳] ایضاً [۴] ایضاً،

غسل کرے. کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لئے ناپاک یا قابلِ کراہت بلکہ عام حالت میں خود اس کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا،

۵. عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑجائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے، اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے. اگر یہ احتمالات نہ ہوں، یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے

۶. پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہیئے. کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑکر جسم پر پڑ سکتے ہیں،

۷. غسل خانہ کی زمین مین پیشاب نہین کرنا چاہیئے، خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو، کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹین گندی اور ناپاک ہوکر اڑیں گی، اور بدن کو ناپاک کرین گی، یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل مین پیدا کرین گی،

۸. بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھولینا اچھا ہے، استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے. اُس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے،

۹. طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیے، [۱]

۱۰. ہفتہ مین ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے

---

[۱] یہ تمام مسائل کتبِ سنن کی کتاب الطہارۃ مین دیکھئے، ۱۲

بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہی،

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہی، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے، اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہی کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے، اور محنت مزدوری کرتے تھے، اُن کی مسجد نہایت تنگ اور انکی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے تو لوگون کو اس پشمینہ مین پسینہ آیا اور انکی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے[۱]، جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد مین آنے کی ممانعت بھی فرمائی[۲]،

۱۱- جمعہ کے علاوہ عام حالات مین بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہئے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہین تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اسکو پانی نہین ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا[۳]

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم مین سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہی، اور ایسی تعلیم نہین دی ہی جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے اس بنا پر اسلام نے بعض اُن سختیون کو دور کیا ہے جو اس معاملہ مین اور

---

[۱] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [۲] مسلم کتاب الصلوۃ [۳] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب و فی الخلقان

مذاہب مین پائی جاتی تھین، مثلاً یہودیون کے مذہب کے رو سے ناپاکون کی پاکی کے لئے ضروری تھا، کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوبلے تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کے روسے انسان کو اس معاملہ مین صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائین، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی مین پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنواسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے، کیونکہ مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[1]

یہودیون کے یہان یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ	اور (اے پیغمبر) لوگ تم سے حیض
قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا	کے بارہ مین دریافت کرتے ہین تو
النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا	(ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہی تو حیض
تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ	کے دنون مین عورتون سے الگ ہو

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین،

فَاْتُوْهُنَّ ،　　　　اور جب تک پاک نہ ہولیں ان سے مقاربت نہ کرو

(بقرہ - ۲۸)　　　　اور جب وہ پاک ہو جائیں تو انکے پاس آؤ،

اس کے مطابق آپ نے حکم دیا کہ دفاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرز عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی، اور آپ کے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے[1]

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے، قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے، اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ "مسلمان نجس نہیں ہوتا"[2] یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے،

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں، اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں، یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو، بولیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے[3] یعنی اس کے بعد خوشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے، ایک عورت نے آپ سے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا [2] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [3] ایضاً

دریافت فرمایا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے، جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ہاں "ہے" فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے[1] غرض اسلام کا اصول یہ ہے، کہ خشک زمین پاک ہے، اور پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات مین پاک کر سکتی ہے، اسی لئے آپؐ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کر دی گئی ہے، اور اسی لئے وہ حالتِ تیمم مین پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے، جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے،

اسلام میں اس باب مین سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام[2] کر دیا، اور اس کو تمام صحابہ نے ایک برکت سمجھا،

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھولئے جائیں، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے، پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے، پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے، لیکن پاؤن نہین دھوتے، پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑون کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے، اور آخر مین پاؤن دھوتے، (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام مین ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہین ہی، اور نہ عرب جیسے ملک مین یہ ہو سکتا

---

[1] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [2] بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت مین،

تھا، لیکن اگر کوئی ایسے ملک مین جہان پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر دن نہالے تو مباح ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچون وقت کی نماز کی تمثیل مین فرماتے ہین کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہ رہی ہو، اور اُس مین وہ دن مین پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟[1]

[1] صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ،

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہین ہے، لیکن اگر پیالہ مین ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن مین بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے، اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن مین ہاتھ ڈالنا اچھا نہین، اور ابو داؤد مین بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے[1] ایک حدیث مین ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ مین کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اُس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا، اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے،[2] اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اُس کیلئے ہے جس کی انگلیاں کھانے مین طوث ہوتی ہون،

(۲) مسلمانون کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہئے جیسا کہ حدیثون مین مذکور ہے، اور دنیا کے سب کامون مین کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی

[1] ابو داؤد کتاب الاطعمہ
[2] ایضاً

ذریعہ ہے، کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیئے، اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہیئے، صحابہ کہتے ہین کہ جب ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے مین ہاتھ نہین ڈالتے تھے، لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے مین ہاتھ ڈالنا چاہا، آپنے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے مین ہاتھ ڈالنا چاہا، آپنے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہین لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے[1]، اور اگر کوئی شروع مین بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ و آخرہ کہہ لے[2]۔

۳- انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کامون اور چیزون مین ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونون ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کامون کے لئے خاص کر دیئے جائین چنانچہ سب اچھے کامون کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لئے بائین ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے، اس تخصیص مین ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے، انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہین، اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہین، اس لئے زیادہ تر کامون کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہین ہے، یعنی داہان پہلو، تاکہ کام کے جھکولون اور جھٹکون سے قلب کو صدمہ

[1، 2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ ص ۵ ایضاً

نہ پہنچے، یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لئے لگاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے، اسی لئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے، صرف کھانے ہی پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے ایک بار آپ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے[۲]،

ایک بار آپ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، اس نے کہا کہ میں آپ کا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا، مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا[۳]،

۴۔ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے، بیچ سے نہیں کھانا چاہئے، کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی، گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا، اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت سے تعبیر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے[۴]،

ترمذی ابواب [illegible] فی [illegible] الطعام،

۵۔ اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو

---

۱ ابوداؤد کتاب الاطعمہ ۲ صحیح بخاری کتاب الاشربہ ۳ ایضاً ۴ ترمذی ابواب الاطعمہ باب ما جاء

کر کے نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا اگر شریک نہ ہو جائے، اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص و طمع پر دال ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے،

۶۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے، ورنہ چھوڑ دینا چاہیے۔[۲]

۷۔ سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسنِ معاشرت کا ذریعہ ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے، کہ دوست و احباب، یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے، اور ایک ساتھ بھی۔[۳] لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی

---

[۱] سنن ترمذی ابواب الطعام [۲] بخاری کتاب الاطعمہ [۳] نور۔ ۸۔

زیادہ کھاتا ہے، سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے، پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے، اور گھر کے مالک کا تشخص اور اتیانہ جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے، اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے، ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں، لیکن آسودہ نہیں ہوتے، فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہاں، فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کرو تو برکت ہوگی[1]،

کیفیت

۸- کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منہ کے بل سو کر نہیں کھانا چاہئے[2]، کیونکہ روحانی کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے، کھانے کے لئے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے، یا دو زانو بیٹھ کر، اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر[3]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں[4]، یعنی خاکساری سے[5]،

۹- کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے[6]، خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے، اور دوسرے کے کھانے

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ وابن ماجہ کتاب الاطعمہ وشرح سفر السعادۃ فیروز آبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی [4] ابوداؤد وابن ماجہ [5] مع زرقانی علی المواہب ج ۴ صفحہ ۳۹۸ ،

مین کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس نے لالچ سے بچا ہے، اور ایثار سلیقہ بر

۱۰- کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیون سے، اور انگلیون کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیئے، اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھنا چاہیئے۔

۱۱- پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس مین پینا چاہیئے، اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے، اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے، اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی مین نہین لگنے پاتی،

۱۲- پانی کے برتن مین سانس نہین لینی چاہیئے، کیونکہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن مین پڑ جائے اور دوسرے آدمی کو مکروہ معلوم ہو، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتون کو لے کر باہر نکلتی ہے، اس لئے اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہین کرنا چاہیئے،

۱۳- پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہین پینا چاہیئے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ ہرج نہین کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے، مگر اس کی عادت نہین کرنی چاہیئے، کیونکہ پانی پینے مین ضرورت ہو کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائین، اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے، البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا، اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے،

۱؎ بخاری کتاب الاطعمہ ۲؎ بخاری کتاب الاشربہ ۳؎ ابو داؤد کتاب الاشربہ ۴؎ ایضاً ۵؎ موطا امام محمد

۱۴- پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے، کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا، پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

۱۵- کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہیے[1]، تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

۱۶- کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔ اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں، جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا[2]

[1] صحیح مسلم کتاب الاشربہ [2] عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی باب ما یقول اذا اکل۔

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس مین اصولی بات یہ ہے کہ مجلس مین تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو، اور شرکاے مجلس مین سے ہر ایک کا حق برابر ہو تاکہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتون کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہین،

نشست

(۱) مجلس مین انسان کو جہان بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہان تک کا دائرہ اُسکے آنے تک پہنچ چکا ہو وہین بیٹھ جانا چاہئے، یہ نہین کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والون اور بیٹھنے والون کو تکلیف ہوتی ہے، اور دوسرے ایسا کرنے والون مین غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسون مین اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے[1]، انتہا یہ ہے کہ مسجدون مین بعد کے آنے والے نمازیون کیلئے یہ سزاوار نہین کہ وہ لوگون کو روندتے ہوئے آگے کی صف مین بیٹھنے کی کوشش کرین،

[1] ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث انتہیٰ،

جمعہ کی نماز مین یہ خاص طور سے دیکھنے مین آتا ہے، اسی لئے "تخطی رقاب" یعنی دوسرون کی گردنون کو پھاند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ مین خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) مجلس مین کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہین بیٹھنا چاہئے،[۱] کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے، اور دوسرے کے دل مین کدورت پیدا ہوتی ہے،

(۳) اگر کوئی شخص مجلس مین ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے،[۲] دوسرا اس جگہ نہین بیٹھ سکتا، کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہین جاتا،

(۴) اگر مجلس مین دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہون تو ان کی اجازت کے بغیر دونون کو الگ الگ نہین کیا جا سکتا،[۳] کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس مین بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحتِ باہمی سے بیٹھتے ہین، اور ان دونون مین موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے،

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس مین حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہون تو کسی کو اس حلقہ کے وسط مین نہین بیٹھنا چاہئے، ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے،[۴] کیونکہ اس حالت مین کچھ لوگون کی طرف اس کا منھ ہوگا اور کچھ لوگون کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہون تاکہ سب کو

---

[۱] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ [۲] ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہو احق بہ [۳] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما [۴] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ،

ہنسا سکین، اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہی،

(۶) مجلس مین کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہین رہنا چاہئے[1]، کیونکہ یہ عجمیون کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی، اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریون اور عزتِ نفس کو فنا کر دیتے تھے، جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب مین اچھا نہین سمجھا جا سکتا،

(۷) راستہ مین نہین بیٹھنا چاہئے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہی، اور ہر آیندہ و روندہ کو تکنا بد اخلاقی ہے، لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتون کی پابندی کرنی چاہئے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رسان چیزون کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتون سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤن کو راستہ دکھانا اور مصیبت مین مارے ہوؤن کی مدد کرنا[2]،

(۸) انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اپنے ہم نشینون کے انتخاب مین اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہون جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحین ایک مخلوط فوج ہین، جن مین باہم آشنائی ہوتی ہے، ان مین

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [2] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات۔

الفت وموانست پیدا ہو جاتی ہے، اور جن مین بیگانگی ہوتی ہے اُن مین تفریق واختلاف پیدا ہو جاتا ہے[1] ایک مشہور مثل ہے، کہ" اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستون کے اخلاق کا پتہ لگاؤ" اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظون مین ظاہر کیا ہے کہ" آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے" پھر فرمایا کہ اچھے ہمنشین اور برے ہمنشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے، مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچیگا، یا اس کو خرید وگے، یا اس کی خوشبو پاؤگے، لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی، یا تمہارے دماغ مین اس کی ناگوار بو پہنچیگی[2]

مجلس مین جو معزز جگہ ہو وہان بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے، کسی دوسرے کے یہان جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرئے فرمایا کہ" اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے"[3]

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس مین یہ کوشش کرتے ہین کہ اس معزز جگہ مین نہین تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی مین بیٹھین، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے، اور لوگون کو وہان سے ذرا سرکنے، اور دوسرون کیلئے جگہ بنانے کیلئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا، فرمایا:

---

[1] ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ [2] بخاری کتاب البیوع باب فی العطار وبیع المسک
[3] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی الاتکاء،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قِيْلَ	اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے
لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا	کہ مجلسون مین کشادگی کرو تو کشادگی کرو،
يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ	...ے کشادگی کرے گا، اور اگر کہا جائے
انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ	کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ، اللہ ان کے
اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	رتبے اونچے کرے گا، جو تم مین سے
وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ	ایمان لائے، اور جن کو علم دیا گیا، اور
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ، (مجادلہ-۲)	اللہ تمہارے کامون کی خبر رکھتا ہے

اسی طرح مجلس مین بیٹھ کر اس طرح آپس مین کانا پھوسی نہین کرنی چاہئے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہین، منافقون کے اس طرزِ عمل کی برائی قرآنِ پاک نے برملا کی ہے،

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ	یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے،
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، (مجادلہ-۲)	کہ دلگیر کرے ایمان والون کو،

جہان چند آدمی بیٹھے ہون، وہان کوئی دو آدمی آپس مین ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہین تو دوسرون کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انھون نے ہم کو اس راز کے قابل نہین سمجھا، دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہین، اسی لئے ارشاد ہوا کہ "تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس مین سرگوشی نہ کرین کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا[1]"،

مجلس کی راز کی باتون کو برملا نہین بیان کرنا چاہئے کہ المجالس بالامانة، قولِ نبوی ہے[2]،

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التناجی
[2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث

آدابِ ملاقات

اسلام مین معاشرتی حیثیت سے دوستون کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث مین ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اُس کو آواز دیگا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت مین اپنے لئے ایک مکان بنا لیا۔[1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہین وہ حسبِ ذیل ہین:۔

(۱) دوستون کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیئے اسی لئے فرمایا کہ "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے"[2] ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے لفظون مین ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دین،

دنیا کی تمام قومون مین ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کیلئے

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان [2] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی صنائع المعروف

کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے، عرب کے لوگ ملاقات کے وقت "انعم اللہ بك عيناً" و "انعم اللہ بك صباحاً" کہتے تھے یعنی "تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں" "تمہاری صبح خوشگوار ہو" امراء و سلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی "ہزار سال بزی" "ہزار برس جیو" کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو "گڈ مارننگ" (اچھی صبح)، شام کو "گڈ ایوننگ" (اچھی شام) رات کو "گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے "السلام علیکم" کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں،

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے، جیساکہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں وَالسَّلَامُ عَلَيَّ (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ (صفت) ظاہر ہوتا ہے؛

(۲) اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں، اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے،

(۳) اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے،

(۴) اس مین مبالغہ آمیز تعظیم نہین پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقون مین پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپ ﷺ سے کہا کہ مین نے حیرہ والون کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسون کو سجدہ کرتے ہین، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہین کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کیا کرین، تو آپ نے ان کو اس کی اجازت نہین دی[۱]، ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! جب ہم مین سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لئے جھک جائے، فرمایا "نہین" اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے؟ فرمایا "نہین"[۲]، اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا "ہان"

(۵) دنیا مین انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دیجا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے،

(۶) جب دو انسان آپس مین ملتے تھے، تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ کہین غفلت پاکر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونون اس لفظ کو اپنے اپنے منھ سے ادا کرتے ہین تو اس کے یہ معنی ہین کہ دونون ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہین، اور دونون ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہین

[۱] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ [۲] یہ ممانعت اس موقع سے مخصوص ہے جب کوئی شرعی محذور ہو مثلاً ملنے والا امرد ہو، یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو [۳] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المصافحہ،

(۷) اسلام نے اپنے پیروون کے درمیان اس کو گویا آپس مین پہچان کی علامت اور "رواج ورد" مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانون سے یہ لفظ نکلتے ہین تو دونون اپنے سینون مین ہزارون بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہین، اور آپس مین محبت کی کشش محسوس کرتے ہین، یہ بتاتا ہے کہ دونون ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہین۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی،

یاایھا الناس افشوا السلام	لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ،
واطعموا الطعام وصلوا	اور جب تمام لوگ سو رہے ہون
والناس نیام تدخلوا الجنۃ	تو نماز پڑھو، یہ سب کروگے تو جنت
بسلام۔[۱]	مین سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤگے۔

ایک دوسری حدیث مین سلام کی غرض وغایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ "تم لوگ اُس وقت تک جنت مین داخل نہ ہوگے جب تک ایمان نہ لاؤ، اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤگے جب تک آپس مین محبت نہ کرو، مین تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہون کہ جب تم اس پر عمل کروگے تو باہم محبت کرنے لگوگے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔[۲]

سلام کرنے کے لئے شناسا وغیرہ شناسا، جانے اور انجان کی تخصیص نہین[۳]، مرد

[۱] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۹۰۴ [۲] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی افشاء السلام [۳] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ؛

اور عورت کی تفریق نہیں[1]، بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں[2]، البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے، اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو، اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہئے[3]،

ان مصالح کے لحاظ سے آپ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا[4]، مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہئے[5]، سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا "السلام علیکم" آپ نے فرمایا "اس کو دس نیکیاں ملیں"، دوسرا آدمی آیا تو کہا السلام علیکم و رحمۃ اللہ" آپ نے فرمایا" اس کو بیس نیکیاں ملیں" تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا" السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ" آپ نے فرمایا "اس کو تیس نیکیاں ملیں[6]"

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء و النساء علی الرجال [2] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان [3] کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ [5] ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود [6] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماذکر فی فضل السلام

اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے، چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے۔

وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا	اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح
بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا،	پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب
	میں) اس سے بہتر (طریقہ) سلام
(نساء - ۱۱)	کرو، یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو"

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے، لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے،

(۲) ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے،[۱] مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہلِ یمن لائے،[۲] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول کر لیا، اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے، لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے،

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ [۲] ابو داؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ،

چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے لگا لیا، اور ان کا بوسہ لیا،[1]

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت مین کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہین، حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آتی تھین تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے، اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے، اور جب آپ اُن کے یہان آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھین، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھکر جائین اور ان کو لے آئین،[2]

دوسری قومون مین ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیرون اور بادشاہون کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس مین ایک دوسرے کے لئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہین،[3]

اس قسم کے موقعون پر خوش آمدید کے الفاظ سلام مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت مین موجود ہے،[4]

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقة والقبلہ [2] یہ دونون واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام مین ہین [3] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل، [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا،

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر مین جانے کے لئے صاحبِ خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے، اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید مین دیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	مسلمانو! اپنے گھرون کے سوا دوسرے
بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی	گھرون مین گھر والون سے پوچھے،
تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی	اور اُن سے سلام علیک کئے بغیر نہ
اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ	جایا کرو، یہ تمہارے حق مین بہتر ہے
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ . فَاِنْ	(یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے)
لَّمْ تَجِدُوْا فِیْھَآ اَحَدًا فَلَا	کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا
تَدْخُلُوْھَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَکُمْ	خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ
وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا	گھر مین کوئی آدمی موجود نہیں تو جب
فَارْجِعُوْا ھُوَ اَزْکٰی لَکُمْ	تک تمہین (خاص) اجازت نہ ہو
وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ	ان مین نہ جاؤ اور اگر (گھر مین کوئی ہو
	اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت
	موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل
(نور - ۴)	لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے

لئے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

غیر محرم عورتون سے ملنے کے لئے ان کے شوہرون سے اجازت لینے کی ضرورت ہے[1]

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن،

کسی کے گھر مین داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہین، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت مین ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہین کرتا کہ دوسرون کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازون پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا[1]، اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے داہین یا بائین کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہین کھڑے ہوتے تھے[2] تاکہ اندر کی چیزون پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے داہین یا بائین کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزون پر نگاہ نہ پڑنے پائے[3]، ایک حدیث مین ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر مین تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہین[4]، ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ مین تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر مین یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھون مین کونچ دیتا، پھر فرمایا انما جعل الاذن من قبل البصر، یا فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر، یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لئے ہی

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی العورات الثلاث [2] ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب [3] ابو داؤد کتاب الادب فی الاستیذان [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینیہ فلا دیۃ لہ،

کہ اس کو دیکھو نہیں[1]

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ مین اندر آسکتا ہون[2]، تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہئے[3]، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہین ہے[4]، اگر کوئی شخص گھر کے دالان مین بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے[5]، دوکانون مین جانے کے لئے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات مین بھی اجازت لینا ضروری نہین ہے[6]، خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہئے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر مین عورتین بے تکلفی کی حالت مین ہون گی، یا گھر مین غیر محرم عورتین آگئی ہین تو وہ ہوشیار ہو جائین،

یہ آداب تو اجنبی اور ناآشنا لوگون کے لئے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہین جن سے پردہ کرنا ضروری نہین، اور وہ ہر وقت گھر مین آتے جاتے رہتے ہین، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لئے اگر اُن کے لئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہو گی، البتہ خاص خاص اوقات مین جن مین لوگ

[1] اس کتاب کے صفحہ ۹۸ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھ گئے ہیں، انما الاذن رجل الرویۃ، مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستیذان، باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان [3] ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان [4] ادب المفرد باب دعاء الرجل اذنہ [5] ادب المفرد باب ما لایستاذن فیہ [6] ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق۔

اکثر بے پردہ رہتے ہیں، اُن کے لئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے، اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نماز عشاء کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے، اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لئے کوئی لیٹے، کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ	مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی
الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ	لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ	بلوغ کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں
مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ	تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت
قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ	لے لیا کریں، (ایک تو) نماز صبح سے
تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ	پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر
الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ	کو (سونے کے لئے معمول کے مطابق)
صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ	کپڑے اتار دیا کرتے ہو، اور (تیسرے)
عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ	نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے
عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ	پردے کے وقت ہیں ان (اوقات)
بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ	کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ	میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ	چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ)

الاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ، وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ،

(نور ۸-۸)

اکثر تمھارے پاس آتے جاتے رہتے ہین (اور) تم مین سے بعض کو (یعنی لونڈی غلامون کو) بعض (یعنی تمھارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے مین تم لوگون کو بڑی تکلیف ہوگی) یون اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے، اور (مسلمانو!) جب تمھارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچین تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھرون مین آنے کے لئے) اذن مانگا کرتے ہین، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہئے،

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو،

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ-۲) تو تم اُن سے نرم بات کہنا،

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لئے فرمایا،

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ-۱۰) اور لوگوں سے اچھی بات کہو،

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو، یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو، یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے، انظرنا (ہمارا خیال کیجیے) کی جگہ راعنا کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا اے ایمان والو! راعنا نہ کہو

رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (بقرہ-۱۳) — انظرنا کہو،

اس کی پوری تفصیل سورۂ نسار رکوع ۷ مین ہے،

باتین ایسی کرنی چاہئین جو منصفانہ اور درست ہون، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھین تو آپس مین لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگون کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	اے ایمان والو! خدا سے تقوی کرو،
وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ	اور بات سیدھی کہو، اللہ تمھارے
لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ	کامون کو سنوارے گا اور تمھارے
ذُنُوْبَكُمْ، (احزاب-۹)	گناہ معاف کرے گا،

عورتون کو جب نامحرم مردون سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات مین اور لہجہ مین ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل مین بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا،

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ	تو (اے نبی کی بی بیو) دبی زبان سے
الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ	بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا،	دل مین کسی طرح کا کھوٹ ہو وہ خدا
(احزاب-۴)	جانے تم سے کس طرح کے توقعات
	پیدا کرے گا اور بات کرو تو معقول (۱)

مردون کو نرم، معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتین کرنے کی تاکید آئی اور اس کا

ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا،

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى	خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے
(بقرہ ۔ ۳۶)	دل آزاری ہو،

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا،

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ	اور کچھ اپنی آواز پست کر، کہ سب
اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ	آوازوں میں بری آواز گدھوں
الْحَمِيْرِ ۔ (لقمان ۔ ۲)	کی ہے،

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ	اور جو لغو باتوں سے اعراض
مُعْرِضُوْنَ ۔ (مومنون ۔ ۱)	کرتے ہیں،

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، خدا فرماتا ہے،

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ	آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا، لیکن
رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق ۔ ۲)	ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے،

اس لئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے؛

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت

پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔[1] اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو اُدھر توجہ نہ دے"[2] یہ حدیث اُن جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بنجائیں،

زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لئے ملی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں، پھر اُن کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو، اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے،

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ	اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں
قَالُوْا سَلَامًا، (فرقان-۶)	تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں،

گفتگو بضرورت کرنی چاہئے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں، اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں، اور فرمایا ہے کہ ایسے

---

[1] کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف [2] موطا وترجمہ للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب وترمذی کتاب الزہد،

لوگ امت کے بدترین افراد ہیں[1]، یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے[2]، یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رُخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی۔ اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لئے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا[3]۔

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اسکو صفائی اور سہولت کیساتھ کہا جائے بلکہ اسکو ٹھہرا کر کہا جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے اسی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے[4]، اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے، ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہ رضؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا[5]، حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] ادب المفرد باب فضول الکلام [2] موطا امام مالک باب مایوم بہ من التحفظ فی الکلام [3] موطا امام مالک باب ماجاء فی مایخاف من اللسان [4] ابو داؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث [5] ابو داؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث

کے کلام مین ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو مین عجلت نہین فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہین،

کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلاما فصلا یفھمہ کل من سمعہ[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اسکو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا،

گفتگو نہایت مختصر الفاظ مین کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لئے بہتر ہوتا، مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ مین گفتگو مین اختصار کرون، کیونکہ اختصار بہتر ہے[2]،

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر ومباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگون کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع، مقفیٰ، اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہین، گفتگو کو طول دیتے ہین، چبا چبا کے باتین کرتے ہین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتون کی ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب الھدی فی الکلام [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام،

کے گھاس کھاتا ہے" نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوبِ کلام میں اس لئے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے، خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا"[2]

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ ہو، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے، تاکہ دوسروں کو عدمِ التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے[3]۔

[1] یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام [3] ادب المفرد باب اذا احدث الرجل لا تقبل علی واحد۔

باہر نکلنے

اور

چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ مین متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے،

خدا اچھے مسلمانون کی تعریف مین فرماتا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ	اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہین
يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (فرقان - ۲)	جو چلتے ہین زمین پر دبے پانون،

اکڑ کر نہین چلنا چاہیے، یعنی چال مین غرور اور تبختر کے انداز نہ ہون، فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا	اور زمین مین اکڑ کر نہ چل، دکھ اس
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ	طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا
لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا،	ہے اور نہ پہاڑون تک اونچائی مین
(بنی اسرائیل - ۴)	پہنچ جا سکتا ہے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (لقمٰن ع ۲)	اور زمین مین اکڑ کر نہ چل بے شک
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ	اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہین کرتا

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے مین زمین پر زور زور سے پانون نہین رکھنا چاہیے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والون مین انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتین مردون کے سامنے سے گذرتی تھین تو اپنی پازیب کی آواز سنانے کے لئے زور زور سے زمین پر پاؤن رکھتی تھین اس لئے اللہ تعالی نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا،

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ	اور (چلنے مین) اپنے پاؤں ایسے
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ	زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو)
زِيْنَتِهِنَّ ، (نور-ع ۴)	ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو،

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پانون تک چھپالے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب وزینت کی ساری چیزین چھپ جائین، اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آجائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہوجائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہین، پھر نگاہین شرم سے جھکی رہین،

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ	اے پیغمبر اپنی بیویون اور بیٹیون
وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور مسلمانون کی عورتون کو کہدے
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ	کہ نیچے لٹکائین اپنے اوپر تھوڑی

جَلَابِيبِهِنَّ ، ذٰلِكَ اَدْنٰىٓ اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ، (احزاب-۸)
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ، الآیۃ (نور-۴)

سی اپنی چادرین، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑین[1] تو کوئی نہ ستائے، اور اے پیغمبر! ایمان والیون کو کہدے کہ اپنی آنکھین ذرا نیچی رکھین، اور اپنا ستر چھپائین اور اپنا سنگار نہ دکھائین، مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے، اور اپنی اوڑھنیان اپنے گریبانون پر ڈالے رہین، اور اپنا سنگار نہ دکھائین، لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو (آخر تک پڑھیے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہین نکلنا چاہیے، کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے، اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کرین، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے،[2]

راستہ مین مرد اور عورت کو مل جل کر نہین چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو دو عورتون کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتون کو وسطِ راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہیے، ایک بار راستہ مین مرد اور عورت

---

[1] یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتونین ہین، ان کو کوئی راستہ مین چھیڑے نہین [2] سنن ترمذی باب ماجاء فی خروج المرأۃ متعطرۃ،

باہم مل جل گئے تو آپ نے یہ حکم دیا، اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتین راستہ کی ادھر اودھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگین[۱]۔

راستہ چلنے مین ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہان تک کہ اگر مسجد مین جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت مین ملنے کے لئے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسجد مین تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس مین شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آکر جماعت مین ملو[۲]،

مقدور ہو تو پانون کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لئے جوتے پہنے جائین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو یعنی جوتے پہنکر چلا کرو، کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[۳]۔

جوتے دونون پانون مین پہن کر چلنا چاہیے، یا دونون پانون ننگے رہین، یعنی یہ نہین کرنا چاہیے کہ ایک پانون مین جوتا ہو، اور دوسرا پانون ننگا ہو[۴]، کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے۔ ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھین گے، لیکن اگر گھر مین کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہین[۵]،

---

[۱] ابو داود کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق [۲] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰة بوقار۔
[۳] ابو داود، باب الانتعال [۴] ایضاً [۵] ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدة،

آدابِ سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ میں سفر فرمایا، اُس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہو کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارتگری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں اُن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہوسکتے ہیں، جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے،

(۱) سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے، اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی

نیک دعا دینی چاہئے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے[۱]، اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکُمْ وَاَمَانَتَکُمْ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ یعنی تمہارے دین، امانت، اور خاتمہ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہون،

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے[۲]، اس سے انسان کا وقت ضائع نہین ہوتا، بلکہ پورا دن کام مین آجاتا ہے، اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے، اور ایک معتدبہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے،

(۳) سفر تنہا نہین کرنا چاہئے، بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئین[۳]، اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اسباب سفر کی حفاظت و نگرانی مین سہولت پیدا ہوتی ہے،

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کرین تو اُن مین ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہئے[۴]، اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہین،

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر مین داخل نہین ہونا چاہئے، بلکہ گھر والون کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہئے[۵]

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے، تو اس کا استقبال کرنا چاہئے[۶]

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر [۳] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ [۴] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدہم [۵] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق [۶] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی،

(۷) سفر رات کو کرنا چاہئے، حدیث مین اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہی کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے[1]، اور در حقیقت لُو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہر حال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتون کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت،

(۸) مسافر کو سفر مین سواری کے جانورون کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہئے،

(۹) رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہئے، کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہین، اور موذی جانورون کا بھی خطرہ رہتا ہے[2]،

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آجانا چاہئے، کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے[3]،

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق [3] مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ من العذاب۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات مین شمار کیا ہے اور فرمایا ہے،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ	اور خدا کی نشانیون مین سے ایک تمھارا
(روم-۳)	رات کو سونا ہے،

سورۂ فرقان مین فرمایا،

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ	اور اسی نے تمھارے لئے رات کو پردہ
الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا	اور نیند کو آرام اور دن، اٹھ کھڑے
وَّجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا، (فرقان۵)	ہونے کو بنایا۔

سورہ نبا مین ہے،

وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا	اور ہم نے نیند کو تمھارے لئے
الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّھَارَ	آرام، اور رات کو پردہ اور دن
مَعَاشًا، (نبا-۱)	کو کاروبار بنایا،

ان آیتون کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت

کاروبار اور محنت کے لئے ہے، یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام مین گذرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہلِ عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور۔ ع ۸ مین ہے۔ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ، اور رات آرام مین گذاری جائے، اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصّون مین خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتون مین ہے۔ غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہین، وہ دونون قدرت کے حکمون کی خلاف ورزی کرتے ہین، یہان تک کہ ساری رات عبادتون مین جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے[1]، یہ تو عام افراد کے لئے ہے لیکن خاصانِ خدا ایسے بھی ہو سکتے ہین جن کی تعریف اس آیت مین کی گئی ہے،

کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ (ذاریات-۱) یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

(۱) سنتِ نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہین نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہین چاہیے، کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشا پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہین کرنی چاہیئے، بلکہ ضروری کامون سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے[2]، یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے، اور اخیر رات مین خدا کی عبادت مین نیند کی کمی کے سبب سے غشی نہ ہو، لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشار کے بعد اس کے لئے بات چیت

---

[1] بخاری کتاب النکاح [2] ابو داؤد کتاب الادب باب النهی عن السمر بعد العشار۔

کرنا منع نہین، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین نماز عشا، کے بعد بعض ضروری کامون مین مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہین، اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے[۱]۔

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے۔ پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے[۲]،

(۳) ایسی چھت پر نہین سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو[۳]، کیونکہ ایسی حالت مین زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے،

(۴) پاکی کی حالت مین سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے[۴]،

(۵) پیٹ کے بل نہین سونا چاہیے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہین[۵]،

(۶) ایک پانون کو اٹھا کر اس پر دوسرے پانون کو رکھ کر لیٹنا نہین چاہیے[۶]، کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند باندھتے تھے اس لئے اس مین کشفِ عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیونکہ ایک حدیث مین ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقہ سے لیٹے تھے[۷]،

---

[۱] صحیح مسلم باب اکرام الضیف [۲] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم [۳] ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر [۴] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم و باب فی النوم علی طہارۃ [۵] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ [۶] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہتہ فی ذلک [۷] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیا،

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہئے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہئے، چراغ کو بجھا دینا چاہئے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لیجاتے ہیں، جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگ تمہاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو[1]،

(۸) سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے اَللّٰھُمَّ باسمك احیی واموت (اے اللہ میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں) اور جاگے تو کہے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور (اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا، اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے) حدیثوں میں اس موقع کے لئے اور بہت سی مؤثر دعائیں منقول ہیں[2]،

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب لاتترک النار فی البیت عند النوم وباب اغلاق الابواب باللیل، مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے [2] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم،

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہین، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی، جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفون سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصون پر غیرون کی نظر نہین پڑنی چاہیئے وہ چھپے رہین، اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہین جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزء ٹھرایا، یہان تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہین ہوسکتی،

مردون کے لئے ناف سے لے کر گھٹنون تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتون کے لئے سر کے بالون سے لے کر ٹخنون اور گٹون تک اور لونڈیون کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنون تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے[1]، جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہین، یہان تک کہ تنہائی مین بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہین، ایک صحابی

---

[1] عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیان ستر مین داخل نہین،

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی مین ہون یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے[1]، ایک اور حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمھارے ساتھ فرشتے رہتے ہین، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہین، تو ان سے شرم کرو، اور ان کا لحاظ رکھو[2]،

حضرت آدمؑ اور حواؑ کو بہشت مین جو بہشتی جوڑے ملے تھے، خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ اُن کے بدن سے اتر گئے تو فوراً درخت کے پتون سے اپنی برہنگی چھپانے لگے

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ	توجب ان دونون نے درخت
لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا	کو چکھا، ان کے ستر اُن پر کھل گئے
يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ	تو اپنے اوپر درخت کے پتون کو
الْجَنَّةِ ۚ (اعراف - ۲)	جوڑنے لگے،

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا مین آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومین ستر کے حدود کو صرف شرمگاہون تک محدود کر لیتی ہین، عرب میں بھی یہی حال تھا بلکہ حج مین انھون نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے، ورنہ یونہی ننگے پھرا کرتے تھے۔ وحی الٰہی نے انسانون

[3] صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل،

[1] سنن ترمذی ابواب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی حفظ العورة [2] ایضاً باب ماجاء فی الاستتار۔

کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا،

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ	اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر
لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَ	پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور
رِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ	زینت کا سامان، اور پرہیزگاری کا
خَیْرٌ (اعراف-۳)	لباس یہ بہتر ہے،
یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ	اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت
عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ، (اعراف-۳)	اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو،
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰہِ	کہدے! کس نے اللہ کی اس زینت
الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ	کو جس کو اس نے بندوں کے لئے
(اعراف-۴)	پیدا کیا ہے، منع کیا ہے،
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ	کہہ دے کہ میرے رب نے تو بیحیائی
مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ	کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی
(اعراف-۴)	منع کیا ہے،

ان آیتوں میں جس بیحیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے، اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے، ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو

حاوی ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (اعراف-۳) اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود ہے؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسرون نے اعمالِ صالحہ اور یا شرم و حیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیئے، اسی لئے کچھ مفسرون نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے، مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ، اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباسِ تقوٰی قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہین،[1] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہوتا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقوٰی سے تقوٰی اور پرہیزگاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیئے جو تقوٰی اور پرہیزگاری کا منشا ہو، اور جو لباس تقوی اور پرہیزگاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمۂ قرآن کے حواشی مین لکھتے ہین،

اب وہی لباس پہنو جس مین پرہیزگاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے، اور دامن دراز نہ رکھے، اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے، اور عورت بہت باریک نہ پہنے، کہ لوگون کو نظر آوے، اور اپنی زینت نہ دکھاوے۔" (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام مین لباس و پوشاک کی حدبندی اس کے سوا کچھ اور نہین کی گئی ہے، اس

[1] روح المعانی تفسیر آیت مذکور

حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے،

۱۔ مردون کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بُنا ہوا کپڑا انہین پہننا چاہیے، کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردون کی جدّ و جہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے، ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی مین زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہین تاکہ اس کی لوہے کی کڑیان بدن مین نہ چبھین، یا کسی کے بدن مین کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے ان دونون موقعون پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہین، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے مین لگا لے تو اس کی بھی اجازت ہے،

۲۔ مردون کے لئے عورتون کی سی پوشاک اور عورتون کے لئے مردون کی سی پوشاک پہننا جائز نہین، کیونکہ اس سے دونون کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتون پر جو مردون کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کرین اور ان مردون پر جو عورتون کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کرین لعنت فرمائی ہے،

۳۔ عربون مین لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہو چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، اُن کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے، اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت

کے دن نظر نہین اٹھائے گا، اسی لئے مرد کو پائجامہ کی مہریون اور تہبند کو اتنا نیچا نہین کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائین، بلکہ آپ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنون سے اونچا رہے، فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہین فرماتا، البتہ عورتون کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے،

۴- ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگون کی انگلیان اٹھین، پہننا ٹھیک نہین، خواہ وہ امیرون کی زرق برق پوشاکین ہون، یا مولویون کا نمائشی عبا، جبہ، یا صوفیون کا گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑون کے پہننے والون کا اصل منشا اپنے کو دوسرون سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے، اور یہ تفوق وامتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے؛

۵- مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتون کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ کتنی کپڑے پہنے والیان ہین جو حقیقت مین ننگی رہتی ہین"؛

۶- ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو، یعنی اس سے ستر کے حدود نہ چھپین، جائز نہین، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضورؐ کے سامنے آئین تو آپ نے فرمایا، اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیون کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہین،

۷- مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنین سرخ دھاری کے

کپڑے جائز ہین، ایسی سرخ دھاریون کی چادر آپنے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہین، آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہین، اور خوشبو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب مین رواج تھا، مردون کے لئے منع ہی، سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے، اور اس رنگ کا تہبند بھی آپنے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمایا ہے،

۸- مردون کے لئے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپنے پسند فرمائے ہین،

۹- آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ مین آستین ڈالنی چاہیے،

۱۰- نیا لباس پہنتے وقت آپ دعا پڑھا کرتے تھے، جس مین اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا[1] پڑھتے تھے،

الحمد للہ الذی کسانی	اُس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا
ھذا و رزقنیہ من غیر	اور روزی کیا میری قوت کے بغیر
حول منی و قوۃ،	(یعنی محض اپنے فضل سے)

[1] اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس مین ہین، میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہین، ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابون مین ملین گی۔

آدابِ مسرت

انسان کو جن چیزون پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہین، مال و دولت، علم وفضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی مین اظہارِ مسرت کے سیکڑون موقع پیش آتے ہین، لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا،

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ	جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت،
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (قصص)	اللہ کو نہین بھاتے اترانے والے،

اسلام نے چونکہ تمام جذبات مین اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتون کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا	اور اگر ہم چکھا دین آدمی کو اپنی طرف کی
رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ	مہر پھر وہ چھین لین اس سے تو وہ

اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ ۔ وَلَئِنْ	ناامید، ناشکر ہوا اور اگر ہم چکھادین
اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ	اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے
مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ	اس کو تو کہنے لگے گیئن برائیان
عَنِّیْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۔ (هود)	مجھ سے تو وہ خوشیان کرتے بڑائیان

اور اس کی ممانعت کی ہے،

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ	اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے
لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ	دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اترانے
(حدید-۳)	بڑائی مارنے کو،

ساتھ ہی اس کے مسلمانون مین مردہ دلی نہین پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہین،

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل وکرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہئے تاکہ غایت مسرت کی حالت مین دنیوی فخر وغرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجالاتے،

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جارہے تھے جب غزوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ مین گر پڑے اس کے بعد دیر

تک ٹھہرے رہے، پھر ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ مین گر پڑے،
اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ مین گر پڑے۔ اور فرمایا کہ مین نے خدا سے
اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی، تو اس نے میری ثلث امت کے لئے
شفاعت قبول کرلی، اس لئے مین اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ مین گر پڑا،
پھر مین نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لئے یہی درخواست کی تو اُس نے میری ثلث
امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی، اس لئے مین اپنے خدا کا شکر ادا کرنے
کے لئے سجدہ مین گر پڑا، پھر مین نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے
اور میری التجا کو قبول کیا تو مین اپنے خدا کے لئے سجدہ مین گر پڑا[1]،

صحابۂ کرام کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول
ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ مین گر پڑے، اس قسم کے مسرت آمیز
موقعون پر دوسرے مسلمانون کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد
دے کر اس کی مسرت مین شریک ہون، چنانچہ اس موقع پر صحابۂ کرام بھی ان کے پاس
جوق در جوق آئے اور ان کو مبارکباددی[2]،

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن مین پہنچنے کی مسرت ہوتی ہی،
اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت مین شریک
ہون، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ مین آئے تو اونٹ یا گائے

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔ [2] بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک۔

ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔[1] اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جاکر آپ کا استقبال کیا جس میں بچے بھی شامل تھے۔[2]

اجتماعی طور پر اظہارِ مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے اظہارِ مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے،

فصل ما بین الحلال و الحرام الدف والصوت[3]	حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے، تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے، اور زنا چھپ کر چھپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے،

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ باب الاطعام عند القدوم من السفر [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی
[3] ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح،

لاکر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیان دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذؓ کے ان بزرگون کی تعریف مین اشعار گانے لگین، جو غزوہ بدر مین شہید ہوئے تھے، اسی حالت مین ایک نے یہ مصرع گایا،

وفینا نبی یعلم ما فی غد، ہم مین ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے،

تو آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھین اسی کو گاؤ، [1]

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگون کے ساتھ گیت نہ تھا، کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے، ایک روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگون نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیون نہین بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی، [2]

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیون کا گانا سن رہے تھے، اتنے مین عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے، انھون نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہین، اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انھون نے کہا تمھارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے (نسائی باب اللہو والغناء عند العرس)

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمة [2] بخاری کتاب النکاح باب النسوة اللتی یہدین المرأة الی زوجہا و دعائہن بالبرکة مع فتح الباری،

عربون مین رسم تھی کہ دولھا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش وآرام اور اولادِ نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی،

بارك الله لك وبارك	تمھارے لئے اللہ مبارک کرے،
عليك وجمع بينكما	تم پر برکت اُتارے اور تم دونون مین
في خير[1]	بھلائی مین میل ملاپ رکھے،

شادی بیاہ مین دوستون اور عزیزون کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہین جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزون اور دوستون کو اس موقع پر کھلائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور کچھ نہین تو ایک بکری ذبح کرکے کھلادو[2]، اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہین[3]، اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی مین تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہین، (نسائی باب الہدیۃ لمن عرس)

مسلمانون کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہارِ مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے، زمانۂ جاہلیت مین اہلِ عرب نے سال مین دو دن مقرر کئے تھے، جن مین وہ خوشیان مناتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنون مین خوشیان مناتے تھے، اب خدا نے ان کو تمھارے لئے ان سے دو بہتر دنون سے بدل دیا، یعنی عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن[4]، خوشی کے ان

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یقال للزوج [2] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ، [3] نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر [4] نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین،

دونون کی تعیین مین دوسری مشرک قومون کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موجود مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہین بنایا گیا، بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعون کو اظہار مسرت کے لئے پسند کیا گیا، عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی خوشیون اور خانۂ کعبہ کی بنا اور فتح کی، اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے،

ان دونون دنون مین اظہار مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلون کو پسند فرمایا، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیان جو پیشہ ور گانے والیان نہ تھین، وہ اشعار گارہی تھین جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت مین حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ "شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر مین"، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اے ابوبکر! ہر قوم کے لئے عید کا ایک دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے[1]" یعنی اس دن گانا مباح ہے۔

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھارہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیون سے کہا کہ "ہان بنوارفدہ!" اس سے آپ کا مقصد ان مین مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہان تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئین تو آپ نے کہا کہ "بس" انھون نے کہا "ہان" ارشاد ہوا

[1] بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام، ۲؎ بشرطیکہ اسکے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے بری نہون

ہو تو جاؤ،

مسرت کے اس طریقۂ اظہار کا نام "تقلیس" تھا، جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لئے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہدِ رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاضؓ اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے؟

حضرت قیس بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھی ہیں، بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی؛[2]

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقۂ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کرے، اسی لئے ان دونوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے، اور آپ نے

---

[1] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید [2] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی التقلیس یوم العید،

فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، اہل وعیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الٰہی کے ہیں[1]

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لئے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عید گاہ کو جائیں، اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہو، اور لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ (بقرہ ۔ ۲۳) کی تعمیل ہو،

[1] شرح معانی الآثار طحاوی صفحہ ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل وعیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہین، جس طرح انسان خوشی مین بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت مین بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے، عربون مین فخر و غرور، اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمین قائم ہو گئی تھین، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہین جاتا تھا، اس لئے اظہارِ فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے،

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے،

اذا مِتُّ فابکینی بما انا اھلُہ وشقّی علیّ الجیب یا ابنۃ معبد

جب مین مرجاؤن تو میرے لئے میرے درجہ کے موافق رونا، اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا

منہ پر تھپڑ مارنا چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی، اور شعراء اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے،

من کان مسرورًا بمقتل مالکٍ ۔۔۔ فلیات نسوتنا بوجہ نہارٖ
جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا ۔۔۔ تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے اگر دیکھے

یجد النساء حواسرًا یندبنہ ۔۔۔ یلطمن اوجھھن بالاسحار
وہ دیکھیگا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں ۔۔۔ اور صبح کے وقت اپنے گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا، اور گالوں پر طمانچے مارتا، اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں[1]" یعنی یہ میری امت کے کام نہیں،

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو اُن کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ "ان کے منہ میں خاک بھر دو[2]"

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دُور دُور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخلِ مراسم ہو گئی تھی یعنی کسی میت کے لئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا، ایک دفعہ ایک خاتون

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن ضرب الخدود [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن،

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "وہ کونسی بات ہے، جس مین ہم کو آپ کی نافرمانی نہین کرنی چاہیے"؟ آپنے فرمایا یہ کہ "نوحہ نہ کرو" وہ بولین کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلان خاندان کی عورتین آکر روئی تھین، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپنے منع فرمایا لیکن وہ کسی طرح نہ مانین، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی، لیکن وہ خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھین، اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحہ مین شریک نہین ہوئین۔

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئین اس کو عربی مین "نعی" کہتے ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمانِ نبوی کی اس قدر احتیاط مدِ نظر تھی کہ) وصیت کی کہ "میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، مین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان مین داخل ہو"۔

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے، اور بخوردان جلا کرلے جاتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے، راگ سے مقصود کفارِ ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے۔ تب یہ مطلب ہوگا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ مین شریک تھے، ایک عورت انگیٹھی

۱؎ ترمذی تفسیر سورۂ ممتحنہ ۲؎ ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی ۳؎ باب الاسلام یہدم ماقبلہ صفحہ ۱۹۹ ۴؎ ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد،

لے کرآئی، آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی،

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ نے لوگون کو اس صورت مین دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ مین تمھارے حق مین ایسی بد دعا کرون کہ تمھاری صورتین بدل جائین، لوگون نے فوراً چادرین اوڑھ لین، اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہین کیا[2]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کردی، اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے یہ جائز نہین کہ تین دنون سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس مین وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرایش وزیبایش کرے[3]،

کسی عزیز کی موت پر آنکھون سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، برا نہین لیکن زور زور سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے، اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے جب وفات پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھون سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے، اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہین، لیکن زبان سے وہی نکلیگا جو رب کی مرضی ہے[4]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے"

[1] اسد الغابۃ جلد ۴ صفحہ ۲۹۵ مصر [2] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن التسلب مع الجنازۃ [3] ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا [4] مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال،

صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب مین اختلافات ہین، جس بات
پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب مین جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور
کے لیے حسبِ حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اسی وصیت کے مطابق
اُس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے[۱]،

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر مین کوئی موت ہو، تو مناسب
ہے کہ عزیز، دوست، یا محلہ کے لوگ اس کے ہان کھانا بھیجین، کیونکہ غم کے سبب سے
اس کے گھر مین کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ
کی شہادت کے موقع پر اُن کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے
گھر کے لوگون کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملیگا[۲]،

ایک مسلمان کا فرض مشکلات مین صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے،
صبر اور دعا، دفعِ غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانون کے لئے تجویز کیا ہے،
وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، (بقرہ - ۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی مین
ہے، یہ نہین کہ شروع مین خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر مین مجبوری کا صبر کیا
جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی
سمجھایا، مگر وہ نہین مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو معذرت
کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی مین کرنا چاہئے[۳]،

---

[۱] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ [۲] ابو داؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت [۳] ایضاً باب الصبر عند الصدمۃ،

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے، قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ (بقرہ - ۱۹) اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہیں، اور یہ دستور مستحسن ہے.

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارۂ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا. یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے، اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے،

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ — تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو،

(حدید - ۳)

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے، اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے، "جمائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے[1]" بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کرے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے[2]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے[3]، اس لئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [2] ابو داود کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب [3] حجۃ اللہ البالغہ آداب الصحبۃ۔

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمہائی روکنے کی چیز ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے، اور ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہیے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منھ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے[1]

(۲) جمہائی کے برخلاف آپ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے[2]، ہمارے شراحِ حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جمہائی بدن کے ثقل، اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لئے چھینک عمل کے لئے نشاط اور جمہائی اس کے لئے کسل پیدا کرتی ہے: شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں، اور اس طریقہ سے وہ شفا، کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور "الحمد للہ" کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہیں[3]

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے، بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے، اس لئے چھینکتے وقت منھ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے، اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا۔[4]

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصوصاً

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [2] ایضاً [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف تشمیت العاطس [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس۔

کی بعض کتابون مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمہائی اور انگڑائی نہین لیتے تھے حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین ان حدیثون کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف و تردید نہین کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے[1]، بہرحال یہ حدیثین صحیح ہون یا نہ ہون، لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے مین جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لئے مجمعِ عام مین اس سے احتراز کرنا چاہیے،

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی مین ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو کیونکہ جو لوگ دنیا مین بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہین وہ آخرت مین سب سے زیادہ بھوکے رہین گے[2]، اس حدیث سے پُرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے،

آداب کا فلسفہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ مین ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے،

تمام متمدن ملکون کے باشندون نے خورد و نوش، نشست و برخاست اور وضع و لباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات مین فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے، اور اس مین مختلف طریقے اختیار کئے ہین،

(۱) بعض لوگون نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے، اور اُن آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کے رو سے مفید ہین،

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۶ [2] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹،

(۲) بعض لوگون نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے، اور اس مین اپنے مذہب کی پابندی کی ہے،

(۳) بعض لوگون نے اس معاملہ مین اپنے بادشاہون، حکیمون اور راہبون کی تقلید کی ہو، ان کے علاوہ اور اصول وقواعد بھی ہین جنمین بعض مفید اور بعض مضر ہین، اور بعض مین نفع ونقصان کچھ بھی نہین ہو، اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ اُن کی پابندی کا حکم دیا جائے، اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے، اور جن مین نفع ونقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت مین قائم رکھے جائین، ان مصلحتون کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس مین امور ذیل کا لحاظ رکھا،

۱- ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہو، اور دل کی صفائی باقی نہین رہتی، اس لئے شریعت نے ان سے پہلے ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائین مسنون کردین جو خدا کو یاد دلاتی ہین،

۲- بعض افعال واشکال شیطانون کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہین، مثلاً ایک جوتہ پہن کے چلنا اور بائین ہاتھ سے کھانا، اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اس کے بخلاف بعض باتین ایسی ہین جو فرشتون سے قریب کردیتی ہین، مثلاً گھر مین داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا، اس لئے شریعت نے انکی ترغیب دی ہو،

۳- بعض چیزین ایسی ہین جن سے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو، یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر مین آگ لگا دیتے ہین۔

۴۔ بعض آداب ایسے ہین جن سے عجمیون کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے۔ مثلاً حریر، تصویر دار کپڑون اور چاندی سونے کے برتنون مین کھانے پینے کی ممانعت،

۵۔ بعض چیزین وقار و تمدن کے منافی ہین، اور انسان کو بالکل وحشیون اور بدوؤن مین شامل کر دیتی ہین، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قومون کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولون پر قائم تھی، اسلام کے احکام مین اور رسول انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آداب مین وہ سب ملحوظ ہین، اور مذہبی، اخلاقی، ہمدردی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہین، یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی بندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگون کے آزمودہ اصول کار، اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب مین بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان مین جو اصلی اور بنیادی

لہ حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۰۳۔

باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں پوری تاکید کر دی ہے، اور اسی تاکید
سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت،
عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لئے اُن
کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو، یا ان کے چھوڑنے
پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو، اور اسی لئے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیئے
گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اُن میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت
نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے تو وہ برا نہیں، جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل
مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے وہاں اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تولئے کام
میں لائے جائیں. کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے
گوشت کاٹا جائے، پلیٹیں بدلی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے
اختیار کئے جائیں، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا
کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے،
لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس راہ سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لئے زمانہ کچھ ہی بدل جائے
مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

---

۱ ہمارے فقہا نے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے ۲ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری سے کاٹ کر گوشت کھایا ہے

حکمتِ ربانی کا چشمۂ نور

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

ناظرین: آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیمون اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتون کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اُس کے تہذیب وتمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہین۔ اور یہ سب کچھ ایک نبی اُمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفۂ روزگار اور قومون کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے۔ "معلمِ اُمی" صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہان تک پہنچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ، اور سلیقۂ وشعور

سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان مین ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوون کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہئے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لئے کی گئی تھی، یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ "یعنی ایسا نبی جو ان اُمیون کو اللہ کے احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک و صاف کر کے نکھار دے" یہ نکھارنے والا آیا، اور نکھار کر دنیا کو پُر بہار بنا گیا صلی اللہ علیہ وسلم،

اُمیدوارِ رحمت

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۰ھ

سید سلیمان ندوی

سلسلۂ مقالاتِ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد ضخیم تصانیف کے علاوہ سیکڑوں علمی، فقہی، تاریخی، تنقیدی و ادبی مقالات بھی لکھے ہیں، اور بہت سی علمی و ادبی کتابوں پر تبصرے بھی کئے ہیں، اور علمی مجالس میں صدرنشیں کی حیثیت سے خطبے بھی دیئے ہیں جو الندوہ اور معارف کے ہزاروں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کے ادبی و تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ انہی کی زندگی میں نقوشِ سلیمانی کے نام سے شائع ہو کر مقبول بھی ہوچکا ہے، اب ان کی وفات کے بعد نئے سرے سے ان کے تمام مقالات، مضامین اور تحریروں کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا گیا ہے جن کے مجموعے بتدریج شائع ہوں گے، اب تک دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں،

مقالاتِ سلیمان تاریخی

(جلد اول)

یہ سید صاحب کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، اور اپنی اعلیٰ تحقیقات، اور مواد کی تلاش و جستجو پر یورپ کے مستشرقین اور ہندوستان کے علما و محققین سے داد حاصل کی، اس میں مسئلۂ خلافت کے سلسلے کے بھی تمام مضامین آگئے ہیں، قیمت :- بعہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

مقالاتِ سلیمان علمی

(جلد دوم)

یہ سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے اس کے بعض اہم مضامین یہ ہیں، ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب امریکہ، اسلامی رصدخانے، مرزا بیدل، حکیم سنائی کے سنینِ عمر، حجاز کے کتب خانے، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ، یہ سید صاحب سفر یورپ کی یادگار ہے، قیمت: للعہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

نیجر دار المصنفین اعظم گڈھ